یہودیوں کے تاریخی جرائم......

امت مسلمہ کی یاددہانی کے لیے

قرآن کے تفصیلی بیانیے میں!

استفادہ:

از تفاسیر سیّد مودودیؒ، مفتی محمد شفیعؒ اور پیر کرم شاہ الازہریؒ

مؤلفین ومرتبین

پروفیسر (ر) ڈاکٹر محمد آفتاب خان

امّ انس

2020ء

انتساب

امت مسلمہ کے نام

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود!
(علامہ اقبالؒ)

لَوۡ لَا یَنۡہٰہُمُ الرَّبّٰنِیُّوۡنَ وَ الۡاَحۡبَارُ عَنۡ قَوۡلِہِمُ الۡاِثۡمَ وَ اَکۡلِہِمُ السُّحۡتَ ؕ لَبِئۡسَ مَا کَانُوۡا یَصۡنَعُوۡنَ ﴿۶۳﴾ (المائدہ:۶۳)

’’ان کے علماء اور مشائخ انہیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے۔ یقیناً بہت ہی برا کارنامۂ زندگی ہے جو وہ تیار کر رہے ہیں۔‘‘

فہرست

ابواب	عنوان	صفحات
پیش لفظ: معرکۂ رُوح و بدن	از: محمد الیاس کھوکھر (ایڈووکیٹ)	7
آغاز سخن		15
باب اول:		
	یہودیت: قرآن کے آئینے میں	29
باب دوم:		
	بنی اسرائیل کے جرائم	147
باب سوم:		
	مکالماتِ قیامت: عوام اور قائدین کے درمیان	173
باب چہارم:		
	مذاہب عالم پر ایک طائرانہ نظر	243
باب پنجم:		
	شرک ــــــ ذہن انسانی کی اختراع	305

باب ششم:

نوجوان نسل اور اقامتِ دین 343

حوالہ جات 365

یادداشت 367

پیش لفظ

معرکۂ رُوح و بدن

مسلمانوں اور عالم انسانی کو جو خطرہ اس وقت سب سے بڑھ کر لاحق ہے وہ یہودیت کا خطرہ ہے۔نسلی طور پر اپنے آپ کو برتر سمجھنے والی یہ قوم دوسرے انسانوں کو کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ پندرہ سو سال تک بطور امت واحد کے مذہبی پیشوائیت پر فائز رہنے کے نخر نے نے اس قوم کے مزاج میں تکبر اور بے اعتنائی کو آخری حد تک جا کر بیدار کیا ہے۔مسلمانوں سے نفرت کی وجہ تو کھلی اور صاف ہے۔قرآن کریم نے بھی اس کی نشاندہی کی ہے کہ اُن کے خیال میں نبوت حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں ہی محدود رہے گی۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو عالم انسانی کی قیادت سے معزول کر کے بنوت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل کی طرف منتقل کر دی۔ یہودی اس بات کو سمجھنے سے قاصر رہ گئے کہ نبوت کا تعلق کسی خاص قبیلے، خاندان اور نسل سے نہیں ہوتا یہ تو اللہ کی اپنی مرضی سے عطا ہونے والا منصب ہے جس میں کسی دوسرے کی مرضی کا کوئی دخل نہیں۔ یہ تو اللہ کا فضل ہے جس پر بھی ہوتا ہے اللہ ہی کی مرضی سے ہوتا ہے۔

یہودیوں کو اصل خطرہ مسلمانوں سے نہیں، اسلام سے ہے۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ میں علامہ اقبال نے اس کی نشاندہی کی ہے۔ابلیس کا ایک مشیر بڑے اعتماد سے اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ ابلیسی نظام کے لئے فتنہ فروا کوئی دوسرا نظریہ حیات نہیں، مگر صرف اسلام۔ اس خطرہ سے محفوظ رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ مسلمان کو بد اعمال اور بد کردار بنادیا جائے۔ اس کے رگ و پے میں عورت شراب اور لہو ولعب کو اس طرح سے اتار دیا

جائے جس طرح سلطان صلاح الدین ایوبی کے دور میں مسلمان امرا کے حرموں میں ہوش وحواس کو ناکارہ کردینے والے حسن سے مالا مال یہودی لڑکیاں گھسی ہوئی تھیں۔

جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند
کون کر سکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں

جس مسلمان کے رگ و پے میں ابلیس کا سوز دروں گردش کر رہا ہو۔ اس امت سے ابلیس کو خطرہ کیونکر ہوسکتا ہے۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے دوسرے تمام مذاہب کی اہمیت اور ضرورت کو ختم کر دینا یہودی پرٹوکول کی بنیادی شق ہے۔ تمام اقوام بالخصوص مسلمانوں کو ایسے معاشی گرداب میں لا پھنسانا کہ مذہب اور معاشرتی اخلاقی اقدار پر غور وخوض کا کوئی وقت اُن کے پاس نہ بچے یہ یہودیت کی کامیابی کا راز ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ذرائع دولت پر قابض اور محروم طبقہ دونوں طبقوں کو باہم مقابل کھڑا کرنا ،دونوں کی پشت پناہی سے اس جنگ کو کبھی سرد نہ ہونے دینا یہودیت کی کامیابی کا مقصد اولیں ہے۔

پوری دنیا پر سیاسی غلبہ حاصل کر کے ایک ایسی طاقت کی شکل اختیار کر لینا جس سے کسی دوسری قوم کے لئے ٹکر لینا آسان نہ ہو۔ یہودی پروٹوکول کا حصہ ہے۔ یہودی کا خیال ہے کہ انہیں دنیا کی امامت پر اللہ نے متمکن کیا تھا۔ اقوام عالم پر اپنے غلبہ اور تقدس کو قائم رکھنے کے لئے جن صلاحیتوں کی ضرورت تھی وہ بھی عطا کی تھیں، ایک برتر قوم ہونے کی وجہ سے اُن کا یہ حق ہے کہ دنیا اُن کی مان کر چلے یہ بات بہت حد تک درست ہے کہ ''ہوائے دشت وشعیب وشبانی شب وروز'' کے سر حکیمی کو سمجھنے کے لئے انہوں نے اپنی ہر صلاحیت استعمال کر ڈالی ہے۔ یہودی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ کوئی تہذیب

فاسد دوسری تہذیب فاسدہ کے ہاتھوں شکست نہ کھائے دونوں سرگرمیاں ہو کر اپنی اپنی طاقت کر کمزور کر لیں گی اور اس سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ ابلیس کی مانند یہودی بھی پوری نوع انسانی کا دشمن ہے۔

قرآن پاک میں بنی اسرائیل کا تذکرہ بڑی تفصیل کے ساتھ ملتا ہے اسی طرح ذخیرہ احادیث میں بھی یہودی شرارت کا ذکر تفصیل ہی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ قرآن یا احادیث کا مطالعہ کرتے ہوئے عام قاری ان مقامات سے صرف نظر کر جاتا ہے اس کی نظر زندگی میں پیش آنے والے اُن مسائل پر مرتکز رہتی ہے جن سے انسان کا روزمرہ کا واسطہ ہے دیدہ و نادیدہ کمین گاہوں سے یہودی اثرات کے جو تیر آ کر جسد مسلم میں پیوست ہو رہے ہیں۔ اُن پر غور کرنے کے لئے مسلمان کے پاس کوئی وقت نہیں اس نظری، اعتقادی، بحثوں میں اس طرح سے الجھا دیا گیا ہے کہ واقعی اس کے پاس اس بڑے خطرے پر غور کرنے کے لئے کوئی وقت نہیں ہے۔ ایک فرد سے لے کر ریاستی نظام تک کو معاشی فکرمندیوں کے گرد گھما دیا گیا ہے۔

نظریہ کی کشش اور عالمی طاقتوں کی مسلم دشمنی نے یہودیوں کو فلسطین میں اکٹھا کر کے اسرائیلی ریاست کو وجود دلایا ہے ایران کا شہر اصفہان ایک واحد شہر ہے جس میں یہودی اب بھی ہزاروں کی تعداد میں مقیم ہیں۔ وہاں سے انہوں نے نقل مکانی نہیں کی اس کی وجوہات بھی خالص مذہبی ہیں اثنا عشری شعیوں کے امام مہدی کا ظہور اسی علاقہ سے ہو گا۔ یہودیوں کا اعتقاد کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام (اُن کے مطابق) کا ظہور بھی اصفہان کے علاقے میں ہی ہوگا انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ اصفہان سے نقل مکانی نہ کریں۔ جب تک اسرائیل وجود میں نہیں آیا تھا۔ پورے ایران سے یہودیوں کی تعداد دو لاکھ کے لگ بھگ تھی سارے ایران سے یہودی ہجرت کر کے اسرائیل پہنچے، صرف اصفہان ایک ایسا خطہ زمین تھا جس سے یہودی نے ہجرت کرنا ضروری خیال کیا۔ ایران میں اس وقت بھی یہودی دلچسپیوں کے مراکز ہسپتالوں اور مذہبی مدرسوں کی صورت میں موجود ہیں جس

ایران نے آج بھی (ماسوائے زاہدان کے) ملک کے اندرسنی مساجد کی تعمیر پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔ ملک رضا کا دوسرا نام پانے والے ایران میں یہودی پرسہولت زندگی گزار رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی غالباً اسی اہمیت کونظر میں رکھتے ہوئے طہران کے بارے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اسے اقوام مشرق اگر اپنا ہیڈ کوارٹر بنالیں تو عالمی منظر تبدیل ہوسکتا ہے۔

عالمی حالات ایک بہت بڑے تغیر کی نشاندہی کر رہے ہیں تہذیبوں کے قبرستان میں ایک نئی تہذیب کی قبر تیار ہورہی ہے۔ سارے انڈے ایک ٹوکری میں اکٹھے کر لئے گئے ہیں۔ کارل مارکس جسے ابلیس کے تیسرے مشیر نے حکیم بے تجلی اور مسیحا بے صلیب قرار دیا تھا وہ خود ابلیس کی ہی شرارت تھی، شجر ابلیس کی شاخیں بے شمار ہی سہی مگر اب کٹنے کو ہیں۔

ڈاکٹر آفتاب منجھے ہوئے لکھاری ہیں۔ لکھتے وقت یوں لگتا ہے جیسے اُن کے قلم میں نور اتر آیا ہو۔ خیالات کو جملے اور جملوں کو لفظ ملتے چلے گئے ہیں۔ دورِ حاضر کی تین مایہ ناز تفاسیر القران کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے اپنی اہلیہ کے تعاون واشتراک سے اس کتاب کی تالیف کی ہے۔ تینوں تفاسیر القران سے ایک ایک لفظ انہوں نے موتی اور ہیرے اکٹھے کر کے ایک مالا پرودی ہے۔ کتاب کا ایک ایک لفظ اس محبت کا غماز ہے۔ جو ڈاکٹر صاحب کو اسلام سے ہے۔ مسلمانوں اور پوری انسانیت کو جو خطرات یہودیت سے لاحق ہیں اُن کا مصنف نے بے لاگ تجزیہ پیش کر دیا ہے اقبال نے جس معرکہ روح و بدن کی بات کی ہے۔ وہ دراصل یہی معرکہ ہے۔ جو یہودیت اور اسلام کے درمیان لڑا جا رہا ہے۔ یہود و ہنود اور نصاریٰ ایک ہی لشکر کے میسرہ اور میمنہ ہیں۔ اسلام کی نفرت نے ان تینوں کو ایک کر دیا ہے۔ مسلمان اس وقت تک یہ بات نہیں سمجھ رہے دانستہ یا نا دانستہ اپنی تمام تر صلاحیتیں اسی گٹھ جوڑ کے لئے وقف کر چکا ہے۔ ابلیس کی وہ بات جو اس نے اپنے مشیروں کو خطاب کرتے ہوئے کہی تھی کہ

جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآن نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندہ مومن کا دیں

اس معرکہ روح و بدن میں مسلمان کی شکست کی اصل وجہ ہے میری دعا ہے کہ اللہ تعالٰی ڈاکٹر صاحب کی اسی سعی مبارک کو قبول فرمائیں۔ایک بار پھر سے رحمت کی گھٹائیں جھوم کر برسیں، رگِ تاک میں رس بھر آئے اور مے خانہ حجاز کی ہائے ہاؤ لوٹ آئے۔

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی
تو میری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
تیرے پیمانے میں ہے ماہ تمام اے ساقی

اس وقت مسلمان کی نظر صرف مذہبی اعمال کے نتیجے میں حاصل ہونے والے ثواب پر ہے۔ ہدایت پر نہیں۔ ابلیس اور یہودیت کو مسلمان کی اس روش پر زیادہ تشویش نہیں محض حصول ثواب کی جدوجہد میں الجھا ہوا مسلمان ان کے لئے خطرہ بھی نہیں۔اس کے لئے خطرہ تو وہ مسلمان ہے جو اعمال صالحہ سے ہدایت کشید کرتا ہے۔ ہدایت مسلمان کو میدان کارزار میں لا کھڑا کرتی ہے مقصد دین بھی یہی ہے اور مسلمان پر چھائی شب تاریک بھی منور ہدایت کے اس ہی ماہتاب سے ہوگی۔ جو راستہ اللہ اور اُس کے آخری رسول ﷺ نے ہمارے لئے متعین کیا ہے اور جو منزل ہمیں دکھائی ہے خدا کرے کہ اس راستہ پر چلتے ہوئے ہم کبھی نہ تھکیں، ہدایت کا جوش ہمیں ان راستوں میں دیوانہ وار لے کر جائے۔ امام شافعی کے بقول ہم منزل تک پہنچ کر رہیں خواہ ہمیں گھسٹ کر ہی چلنا پڑے۔ یہودیوں کا خیال ہے کہ اگر مسلمان مسلمان سے محبت کرتا ہے تو یہ محبت کسی وقت بھی اسلام سے محبت میں بدل سکتی ہے۔اس لئے دنیا بھر میں فرقوں کی سطح سے لے کر ریاستوں کی سطح تک مسلمانوں کو ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا گیا ہے۔ دوسری قوموں کو افلاس اور مسکنت کے حوالے کر دینے اور اپنے عوام پر خوشحال

کے دروازے کھولنے کا نام یہودیت کے نزدیک حکمت ہے۔ انسانوں کو ایک دوسرے سے پھاڑنے کا کام زیادہ تر اقتصادی اجارہ داری سے لیا جا رہا ہے۔ کمزور قوموں کے استعمار کی پالیسی یہود کی ترقی کا راز ہے۔

از ضعیفان نان ربودن حکمت است
از تن شان جاں ربودن حکمت است
شیوہ تہذیب نو آدم دری است
پردہ آدم دری سوداگری است
ایں بنوک ایں فکر چالاک یہود
نورِ حق از سینہ آدمِ ربود
تاہہ و بالا ہ کرد ایں نظام
دانش و تہذیب و دین سودائے خام
(پس چہ باید کرد)

نادار اقوام، یہودی اقتصاد کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ وقت کے رسول ﷺ کی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جب ایک محتاج کی مدد کرنے کے لئے اپنی چادر فروخت کرنا پڑی تو اُس چادر کو خریدنے والا بھی یہودی ہی تھا۔ یہودی مسلمان کا کٹر ادشمن ہے بلکہ اس سے بھی آگے جا کر اس کی دشمنی اسلام کے ساتھ ہے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کا دور عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان معرکہ آرائی کا دور ہے۔ اس آویزش کا مرکز فلسطین کی زمین تھی جس پر نصاریٰ قابض تھے۔ فلسطین پر یہودیوں کی نظر بھی تھی۔ مسلمانوں کے خلاف اس جنگ کو جیتنے کے لئے اور اسلام کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لئے یہودیوں نے اپنی خوبصورت لڑکیاں نصاری کو پیش کیں جنہیں جاسوسی کی ٹریننگ دے کر مسلمان جرنیلوں کے حرموں میں داخل کیا گیا۔ فلپ آگسٹس مسلمانوں کا پرلے درجے کا دشمن تھا اس کا خیال تھا کہ خوبصورت یہودی لڑکیاں مسلمانوں کو ہرانے کے لئے موثر ہتھیار ہیں۔

فلپ آگسٹس کا خیال تھا کہ اگر یہودی اس کا ساتھ دیں تو فتح حاصل ہونے کے بعد فلسطین کو اُن کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اسی امید پر یہودیوں نے اپنی دولت اور لڑکیاں کی دولت حسن کو جی کھول کر مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا۔ اُس وقت یہودی طاقت ور نہیں تھا۔ آج اسے ہر طرح کی طاقت حاصل ہے۔ معاشی فتوحات سے لے کر عسکری فتوحات تک اس کی ایک تاریخ ہے۔ بہت ساری وجوہات میں سے بڑی وجہ مسلمانوں کا باہمی افتراق ہے جب تک اس افتراق کی جگہ اتفاق نہیں لیتا یہودیت کے خلاف جنگ کو جیتا نہیں جاسکتا۔

محمد الیاس کھوکھر ایڈووکیٹ

لاہور

آغازِ سخن

قرآن کریم کو، گزشتہ تمام کتب سماوی/ الہامی پر، جو فوقیت حاصل ہے وہ محتاجِ تعارف نہیں۔ اسی طرح یہ کتاب جس نبی (ﷺ) پر نازل کی گئی ان کے اس شرف میں بھی کوئی دوسرا نبی/ رسول شریک نہیں کہ وہ نبی آخرالزماں ہیں جن کے بعد بنوت کا سلسلہ تا قیامت بند ہوگیا۔ اب جو لوگ بھی قرآن سے ہدایت لینے کے خواہاں یا متمنی ہو، ان کے لیے لازم ہے کہ وہ صرف اور صرف اسوۂ رسول ﷺ کا اتباع کریں کہ آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہی وہ واحد اور آخری علمی اور عملی شکل ہے جسے قرآن ناطق کہا گیا ہے اور جس کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں گواہی دی کہ " وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ " ''وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا یہ تو ایک وحی ہے جو اُس پر نازل کی جاتی ہے'' (النجم: ۳)

درج بالا دو تاریخی اور علمی حقائق کے علاوہ ایک تیسری تاریخی حقیقت جس سے کسی صورت بھی (کوئی ایماندار اور حق پرست فرد) انکار نہیں کرسکتا یہ ہے کہ قرآن کی روشنی میں جس اسوۂ حسنہ کی پیروی دوراول کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کی، اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ عرب کی بدو اور وحشی قوم جو تعلیم وتہذیب سے بیگانہ اور ہر قسم کی اخلاقی برائیوں میں جکڑی ہوئی تھی، ۲۳ سال کے قلیل عرصے میں ایک ایسے انقلاب سے دوچار ہوئی کہ ابھی رسولِ برحق کے وصال کو چند برس بھی نہ ہونے پائے تھے کہ روم و ایران کی دو عظیم الشان عالمی طاقتیں بھی ان کے سامنے سرنگوں ہوگئیں اور اسلامی تعلیمات سے دنیا کے ایک بہت وسیع وعریض خطے میں رہنے والی اللہ کی مخلوق، اس پیغام حیات افروز سے بہرہ مند ہوگئی کہ

تاریخ میں اس کی مثال ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔

مزید برآں، اقوام عالم نے اس حیرت انگیز تبدیلی کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کی رحمتوں سے فیض یاب ہوئے کہ جہاں جہاں اور جس جس وقت بھی اس الہامی ہدایت اور اسوۂ حسنہ کا اتباع کیا گیا، وہاں زمین نے اپنے تمام خزانے ان کے لیے اُگل دیئے اور آسمان سے بھی رحمتوں کا نزول ہوا۔

تاہم تاریخ کے ایک طالب علم کی نظر سے یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں کہ اسلامی نظامِ حیات سے روگردانی کا نتیجہ بھی اتنا ہی تلخ اور پریشان کن نکلا کہ جس امت نے اقوام عالم کو تہذیب اور انصاف و آشتی سے روشناس کرایا تھا، رفتہ رفتہ نہ صرف یہ کہ دنیا کی امامت اس سے چھین لی گئی بلکہ آج وہ اقوامِ عالم کی صفوں میں کوئی نمایاں حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ اغیار ہی نہیں بلکہ اپنے بھی آج ان تعلیمات کے شاکی ہی نہیں بلکہ اس سے بغاوت کا علم بلند کیے ہوئے ہیں۔ اپنی عددی طاقت نیز وسائل حیات کے بے شمار خزانوں کی حامل ہونے کے علی الرغم، وہ چند لاکھ یہود کے گھناؤنے عزائم اور حرکتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں۔ فلسطین ہو یا کشمیر، شام ہو یا مصر یا ہندوستان، آخر کہاں کہاں امت مسلمہ اغیار کے ہاتھوں زخم خوردہ نہیں۔ اہالیانِ فلسطین ہی ان کے ظلم وستم کا نشانہ نہیں بلکہ کشمیر کے مسلمانوں کا روزانہ بہنے والا خون بھی یہود و ہنود کی ملی بھگت اور ریشہ دوانیوں کا ایک ایسا عبرت ناک واقعہ ہے جس کے آگے عالمی ضمیر بھی اپنے منہ میں گھنگھنیاں ڈالے خاموش تماشائی بنا بیٹھا ہے!

قرآن کریم کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے جب ہم آیاتِ ربانی کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہودیوں نے اپنی تاریخ کے اولین دور سے لے کر آج تک بطور ایک سازشی گروہ، ایک احسان ناشناس قوم ظلم وستم کو روا رکھنے میں نمایاں ترین کردار ادا کیا ہے۔ چار ہزار سال تک یہ قوم، اپنے لاتعداد انبیائے کرام اور دیگر صلحاء کی کوششوں کے باوجود اپنے منافقانہ اور سازشی ذہن سے باز نہیں آئی۔ اقوام عالم میں سب سے زیادہ

نرمی اور احسان کا سلوک، ان کے ساتھ نبی آخر الزمان ﷺ کے دور سے لیکر مختلف مسلمان حکومتوں نے کیا، اس کا بدلہ اس قوم نے کس طرح چکایا، وہ تاریخ کی ایک بہت ہی خونچکاں حکایت ہے۔ اس قوم کا تو یہ حال ہے کہ بنی اسرائیل ہی کے ایک نبی (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کے ماننے والے (کرسچین رعیسائیوں) کو بھی انہوں نے اپنی سازشوں، چالاکیوں اور ریشہ دوانیوں میں اس قدر ملوث ہی نہیں بلکہ استعمال **(EXPLOIT)** کیا کہ وہ نہ صرف تاریخ کے مختلف ادوار بلکہ آج بھی دنیا کی ایک عیسائی سپر طاقت کی نکیل ان کے ہاتھوں میں ہے۔

فرنگ کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے!

''آج فلسطین میں محسن کش یہود، عربوں سے اس خلوص اور مروت کا انتقام لے رہے ہیں، جو انہوں نے گزشتہ چودہ صدیوں تک روا رکھی۔ اس سلسلے میں یہ جونکیں، یہ دیمک اپنے پیش رووں سے مختلف نہیں۔ خلافت عباسیہ کے احسانات بھی انہوں نے اسی طرح چکائے تھے۔ سپین میں بھی ان کا کردار یہی رہا تھا۔ ترکی نے گزشتہ پانچ سو برس انہیں دو بار موت کے منہ سے نکالا۔ ہالینڈ سے دھتکارے ہوئے، جرمنی سے نکالے ہوئے، برطانیہ سے ہانکے ہوئے، فرانس سے کچلے ہوئے یہودی پناہ لینے جب ترکی پہنچے تو انہوں نے اپنی آغوش ان پر وا کردی اور گزشتہ صدی میں جب پولینڈ اور روس نے ان کی اس طرح نسل کشی کی، کہ یہ سر چھپانے کے لیے جگہ نہ ڈھونڈ سکتے تھے تو انہوں نے قسطنطنیہ کا رخ کیا، جہاں دولت عثمانیہ کے پرچم نے انہیں سایہ دیا لیکن انہوں نے ترکی کو مرد بیمار بنا کر اسلام کے مرکز کی حیثیت سے ختم کر کے اپنے احسان کا بدلہ چکایا۔ ترکی کی مہربانیوں کے عوضانہ کے لیے آج بھی یہ قبرص میں ترکوں کی قبریں کھود رہے ہیں۔ پناہ دینے والی چھت اور مہربانی کرنے والے ہاتھ یہود نے آج تک فراموش نہیں کئے، آج بھلا وہ تخصص کیسے برت سکتے ہیں۔''؟

اس چوکھٹے کا اقتباس دراصل ''یہودیت: تاریخ، فطرت اور عزائم (یہودیت پر ایک جامع اور مستند تاریخی دستاویز)'' نامی ایک کتاب کا ہے جو جناب یوسف ظفر کے قلم سے نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد نے (۲۰۱۶) میں شائع کی تھی۔ چوکھٹے میں درج یہ تحریر اپنی جامعیت اور تاریخی حقائق کا ایک ایسا نمونہ ہے جو تاریخ کے ہزاروں صفحات کی تحریروں پر بھاری ہے۔ اس کتاب میں یہودی قوم کے تمام جرائم کی ایک ایسی جھلک دکھائی گئی ہے جس پر تاریخ کے طالب علم حیران وسرگرداں ہیں!

درج بالا کتاب کا ایک اور بہت ہی منفرد پہلو، اس کا پیش لفظ ہے جو نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد کے فاضل مینجنگ ڈائریکٹر پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق جاوید صاحب نے تحریر کیا ہے۔ اس پیش لفظ کے ایک فقرے نے راقم الحروف کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ وہ خوراک کا انسانی جسم وشعور پر جینیاتی سطح پر (GENETICALLY) اثر انداز ہونے کا عمل ہے۔ موصوف نے لکھا کہ:

> ''اس میں کوئی شک نہیں کہ خوراک انسانی جسم وشعور پر جینیاتی سطح پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو یہود دنیا کی وہ واحد قوم ہے جس پر آسمانی خوراک من وسلویٰ کی شکل میں اتاری گئی اور زمینی خوراک اگر کئی نسلوں تک اثر انداز ہو سکتی ہے تو من وسلویٰ کی اثر انگیزی کب تک اور کہاں تک ہوگی یہ بھی ایک الگ بحث ہے تاہم یہ طے ہے کہ اس قوم نے اپنے دماغ کا بے دریغ استعمال کیا اور ماضی کے کئی نابغوں (INTERLLECTUALY) میں اپنا حصہ ڈالا جن میں کارل مارکس (1818-1883) ،فرائیڈ (1856-1939) اور آئین سٹائن (1879-1955) جیسے ناقابل نظر انداز دماغ شامل ہیں۔''(ص ۷)

راقم الحروف ایک طویل عرصے تک علم الجنیات SCIENCE OF GENETICS کا طالب علم رہا ہے۔ اس سائنس کے بانی مبانی گریگوری مینڈل (1822-1884) کے قوانین

کے تحت جینز اور ماحول ENVIRONMENT کے درمیان تعامل INTERACTION ایک بہت اہم پہلو ہے۔ اگرچہ اب یہ معاملہ بہت آگے (BIOCHEMICAL GENETICS) تک چلا گیا ہے۔ تاہم ذی روح اجسام میں کارکردگی کا انحصار عمل انتخاب SELECTION اور جینیاتی تناسب (GENE FREQUENCY) پر ہوتا ہے جو ازخود ایک بہت طویل، دوراز کار اعمال کے تحت غیر مبدل اور مستقل اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔ تاہم ماحولیاتی طور پر خوراک، طرز بود و باش، موسمی تبدیلیاں وغیرہ ایسے اعمال ہیں جن کے ذریعے فوری تبدیلی لائی جاسکتی ہے لیکن یہ تبدیلی مستقل نوعیت کی نہیں ہوتی اور جونہی ماحول میں کوئی تبدیلی (کمی) واقع ہوتو کارکردگی اپنی پہلے والی سطح پر واپس لوٹ جاتی ہے۔ تاہم من وسلویٰ، جو ایک آسمانی غذا تھی اور قوم موسیٰ علیہ السلام کے لیے بادلوں کے سائے کا انتظام نیز پانی کی فراہمی کے ذریعے جو انعام ان پر کیا گیا تھا، یہ ایک ایسا حسین امتزاج (Combination) ہے جس کے اثرات کا ہزاروں سال تک وسعت پذیر ہونا، ازخود ایک ایسا پہلو ہے جس پر تحقیق کی ضرورت ہے۔ اور بقول پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق جاوید ''یہودی قوم اس زمینی گولے پر موجود تمام اقوام میں اپنے فکر و عمل کے حوالے سے بالکل جدا اور علیحدہ کھڑی دکھائی دیتی ہے۔ اس قوم کی اس درجہ عقلی پرورش کیسے ہوئی؟ اور کون سے محرکات تھے جنہوں نے اس قوم کو بحیثیت قوم متحرک رکھا؟ اس قوم نے اپنی ۴۰۰۰ سالہ عمر میں کیا کیا کرب جھیلا اور اس کی وجوہات کیا تھیں؟ ماضی بعید میں بھی لاکھوں کی تعداد میں قتل ہونے کے باوجود ۷۰ عیسوی سے لے کر پچھلی صدی تک یہ در در اپنی اور اپنی نسلوں کی قربانی دیتے رہے لیکن اپنے نظریے/عقیدے کی قربانی کبھی نہ دی۔ وہ کیا وجوہات تھیں کہ اس کے قبائل تبدیلی مذہب کے ۳۰۰ برسوں بعد دوبارہ یہودیت سے رجوع کرتے رہے؟'' ...... یہ ہیں وہ چند سوالات جو انہوں نے اٹھائے ہیں!

ہم معذرت خواہ ہیں کہ کسی حد تک اپنے موضوعِ سخن سے کسی قدر ہٹ گئے۔ اگرچہ بنی اسرائیل کی تاریخ کا تفصیلی مطالعہ ہماری کتاب کے حیطۂ اختیار میں نہیں آتا اور شاید نہ

ہی اس کی ضرورت ہے کہ اس کی تمام تر تفصیلات ہم مختلف حوالوں سے درج کریں۔ تاہم درج بالا دو اقتباسات، ہماری آئندہ گفتگو کو سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہوں گے جہاں ہم یہود کی ریشہ دوانیوں، کہہ مکرنیوں اور عرب بالخصوص مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے بعد ان کی کارستانیوں کا جائزہ لیں گے نیز ہماری یہ تمام تر معلومات جن کا تعلق یہود کے ان جرائم سے ہے جن کا ذکر قرآن کریم میں بہت تفصیل کے ساتھ آیا ہے، کو سمجھنے میں بھی مفید ثابت ہوں گی اور اس تمام تر طول بیانی کا مقصد اولین صرف یہ ہے کہ امت مسلمہ بالعموم اور منبر و محراب سے تعلق رکھنے والے اصحاب علم و فضل جنہیں امت مسلمہ کی راہ نمائی کا فریضہ سونپا گیا ہے، بالخصوص اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر اصلاح کر لیں کہ:

وطن کی فکر کر ناداں، مصیبت آنے والی ہے
تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں!

یہاں اگر لفظ ''وطن'' کی جگہ امت مسلمہ لکھ دیا جائے تو شاید یہ ہمارے مافی الضمیر کے اعتبار سے موزوں ترین ہوگا!

یہاں اس امر کی صراحت شاید ضروری ہو کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے دو بیٹوں میں سے ایک کا نام یعقوب ہے، ان کا نام عبرانی زبان میں اسرائیل ہے جو ''اِسرا'' (عبد) اور ''ایل'' (اللہ) سے مرکب ہے۔ اسرائیل کے معنی ہیں عبداللہ یا بندۂ خدا۔ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا جو انہیں اللہ تعالیٰ نے عطا کیا تھا۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے تھے۔ انہی کی نسل کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔

قرآن کریم کے مطالعے سے جہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ بنی اسرائیل، اللہ کی ایک ''محبوب قوم'' کی حیثیت سے چار ہزار سال تک امت مسلمہ کے منصب پر فائز رہی وہاں ان کے جرائم اور ریشہ دوانیوں کا ذکر بھی قرآن میں بہت تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔ انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ جو شرارتیں کیں اور جس انداز میں دین مبین کی

تعلیمات کو زک پہنچانے نیز خود حضور ﷺ کی جان لینے کی متعدد کوششیں کیں، ان سب کا تذکرہ قرآن کریم نے بلاکم وکاست اپنی آیات میں قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا۔ اس کی یہ حکمت سمجھ آتی ہے کہ رسالت محمدی ﷺ کی بعثت کے بعد جس امت کو اب امامت کے منصب پر فائز کیا جا رہا تھا، اسے آگاہ کر دیا جائے کہ قیامت تک انہیں، ان تمام کمزوریوں، خامیوں اور دین حق کے خلاف ان حرکتوں کا مقابلہ کرنا ہے جو بنی اسرائیل کی معزولی کا سبب بنیں۔ یہ امر از خود اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک رحمت ہے کہ امت محمدیہ ﷺ کو پیش آمدہ حالات سے آگاہ کر کے ان سے احتراز کرنے کی ہدایت کر دی گئی۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ امت محمدیہ ﷺ بھی ان تمام گڑھوں اور اندھیروں میں ایک طویل عرصے سے سرگرداں ہے جس کا نتیجہ اس ذلت و نکبت سے ہے جس کا اشارہ درج بالا چند سطور میں کیا گیا ـــــ ان سطور کا مقصد آج امت کے اس طبقہ کو جو قیادت وسیادت (مذہبی، سیاسی، تعلیمی اور ہمہ اقسام اختیارات) پر فائز ہے، بنی اسرائیل کا وہ داغدار چہرہ دکھانا ہے تاکہ وہ اس آئینے میں، یہود کے طرز عمل سے اپنی مشابہت ومماثلت کا اندازہ کر سکیں ـــــ واضح رہے کہ نہ صرف اس دنیا بلکہ آخرت میں بھی ایک مسلمان کی بھلائی کا صرف ایک ہی پیمانہ ہے کہ وہ اس آئینے میں اپنے چہرے پر پائے جانے والے داغوں سے نہ صرف نجات حاصل کر لے بلکہ بحیثیت مجموعی امت مسلمہ میں پائے جانے والی خرابیوں، کمزوریوں، کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کا بھی مداوا کر سکے ـــــ اللہ کے حضور یہ سعی صرف اس مقصد کی خاطر کی گئی ہے کہ قرآنی آئینے میں ہمارا چہرہ ان تمام بدنما داغوں سے پاک وصاف ہو جائے!۔

لا پھر اک بار وہی بادۂ و جام اے ساقی
ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی

اس ضمن میں اس امر کی صراحت ضروری ہے کہ ہم نے قرآن کریم میں سورۂ الحمد سے لے کر الناس تک تمام سورتوں کا اپنی حد تک بہت دقتِ نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اپنے

اس طالب علمانہ مطالعے کا آغاز ہم نے سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن کی چھ جلدوں سے کیا۔ اس کاوش کا غالب حصہ ان حاشیوں اور تراجم وتشریحات پر مشتمل ہے جو سید مرحوم نے دی ہیں تاہم دیگر اہل علم کے تراجم/ تفاسیر/ بالخصوص ڈاکٹر سید کرم شاہ الازہریؒ کی تفسیر ضیاءُالقرآن، حضرت مفتی محمد شفیعؒ کی تفسیر معارف القرآن سے بھی استفادہ کیا ہے۔ جہاں جہاں ان حضرات نے سید مودودیؒ سے زائد کسی نکتہ کی جانب اشارہ کیا ہے، اسے بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ اگرچہ یہود کے اعمال وافکار کی جس انداز میں وضاحت آیاتِ قرآنی میں کی گئی ہے، اس میں اختلاف کی گنجائش تو کسی بھی مفسر/ صاحب علم نے نہیں کی۔ اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ گزشتہ چودہ صدیوں میں مسلم اہل علم کے درمیان ان اہم ترین موضوعات پر بہت ہی واضح اتفاقِ رائے پایا جاتا رہا ہے تاہم اختلاف اگر کسی فقہی امر میں ہے تو وہ بھی اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ مختلف مسلمان اہل علم نے اپنے طور پر قرآن کریم سے اپنے اپنے انداز میں بھرپور استفادہ کیا ہے اور یوں امت مسلمہ کے سامنے ایک ہی چیز کے متنوع پہلو سامنے آگئے ہیں جو از خود زندگی اور ارتقاء کی علامت ہیں!

اگرچہ ہم نے اپنی استطاعت کی حد تک کوشش کی ہے کہ بنی اسرائیل کے بارے میں قرآنی آیات کا احاطہ کیا جائے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ یہ موضوع اس قدر متنوع اور ہمہ گیر پہلوؤں پر مشتمل ہے ہے گویا کہ قرآن کریم کی ہر سورۃ رآیت میں بنی اسرائیل کے اعمال وافعال پر نہ کسی انداز سے کوئی تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس سے اس امر کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے افعالِ شنیعہ اس قدر گھناؤنے اور دوررس مضمرات کے حامل تھے کہ اللہ رب العزت نے امت محمدیہ کے لیے نہایت تفصیل کے ساتھ انہیں واضح کیا مبادا وہ ان میں سے کسی ایک میں بھی ملوث ہوجائیں!

اس ضمن میں جہاں ہماری عاجزانہ درخواست منبر ومحراب پر متمکن اہل علم سے ہے کہ وہ امت مسلمہ کی راہ نمائی کا فریضہ منبر رسول ﷺ کے وارث ہونے کی بنا پر اس کے

شایانِ شان انداز میں اپنے علم و عمل سے انجام دیں بلکہ جملہ مسلم امت کے ہر فرد سے بالعموم اور صاحب الرائے اصحاب علم سے بالخصوص ہے کہ وہ نہ صرف خود بھی دین کا علم حاصل کریں بلکہ اپنے دیگر ابنائے قوم کو بھی ان تعلیمات سے آگاہ کریں کہ ہم سب کی دنیوی اور اخروی نجات اور فلاح کا تمام تر دارو مدار اس امر پر ہے کہ خلیفۃ اللہ فی الارض کے منصب جلیلہ پر فائز ہونے اور رسول ﷺ آخر کے نام لیوا ہونے کا یہی تقاضہ ہے کہ اس پیغام کو عام کیا جائے جس کی خاطر قرآن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی ﷺ پر نازل فرمایا۔جس کی جانب درج ذیل آیات واضح انداز میں راہ نمائی کرتی ہیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ (آل عمران ۱۱۰)

''اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا،تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

اسی طرح آیت ۱۰۴ میں بھی اس مضمون کو بتایا گیا ہے۔

بنی اسرائیل کے بارے میں جس تفصیل کے ساتھ راہ نمائی قرآن کریم میں دی گئی ہے،اس کے بارے میں ذاتی دلچسپی کی وجہ باب اول میں واضح کی گئی ہے۔ یہ موضوع تو اس وقت سے ذہن میں موجود تھا جب کہ آتش جوان تھا تاہم اپنی علمی بے بضاعتی اور بے عملی کی وجہ سے قلم اٹھانے کی ہمت نہ کی۔ اس خیال کو مہمیز اس وقت ملی جب توفیق الٰہی سے ہی یہ عقدہ وا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا مقصد، دراصل بنی اسرائیل کے گناہوں اور جرائم کی بناء پر، بطور امت مسلمہ ان کو اس منصب سے معزول کرنے اور امت محمدیہ ﷺ کو اس عظیم الشان منصب پر فائز کرنے سے تھا۔ یوں آنے والی امت کو آگاہ کیا جانا مطلوب و مقصود تھا کہ وہ ان تمام افعال شنیعہ اور قباحتوں سے اپنے دامن کو داغدار نہ ہونے دیں جس میں قوم یہود و نصاریٰ بہت بری طرح سے ایک طویل دور میں ملوث رہے تھے۔ تفہیم

القرآن از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (۲۰۰۰) کی چھ جلدوں کے بتدریج مطالعے سے اس موضوع کے ساتھ دلچسپی میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور یوں اس کتاب کی تالیف کا آغاز ۲۰۱۹ء کے رمضان میں کیا گیا اور مختلف ابواب (جن کا اجمالاً فیصلہ پہلے سے کرلیا گیا تھا) سورۃ الحمد سے لے کر والناس تک کا مطالعہ جاری کیا۔ یوں ان موضوعات کے تحت مختلف سورتوں/ آیات اور ان کے ترجمہ وتفسیری نکات کو علیحدہ علیحدہ سے مرتب کرنا شروع کیا۔ تاہم اسی ضمن میں مولانا مودودیؒ کی ہر دو کتب ''یہودیت، قرآن کی روشنی میں'' (۲۰۱۸) اور ''نصرانیت، قرآن کی روشنی میں'' (۲۰۱۸) کو بھی دیکھنے کا موقعہ ملا۔ ہر دو کتب اپنے موضوعات پر اپنی جگہ ایک انسائیکلو پیڈیا جیسی اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ دونوں کتب نہ صرف تفہیم القرآن بلکہ مولانا مودودیؒ کی دیگر کتب وتصانیف میں موجود معلومات پر وطن عزیز کے دو نامور اصحاب علم وتقوی کی مرتب کردہ ہیں جن کے سامنے مولفین کی حیثیت درحقیقت ایک طالبعلم سے زیادہ نہیں۔ ہر دو کتب سید مودودیؒ کے طرزِ تحریر اور انداز فکر نیز علمی ثقاہت و بلاغت کا شاہکار ہیں اور پھر جس طریق پر مرحوم نعیم صدیقی اور مرحوم عبدالوکیل علوی صاحب نے اسے ترتیب دیا ہے، وہ ازخود اپنی جگہ ایک بہترین کوشش ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا سید مودودیؒ نے اپنے علمی مذاق اور تقوی کے پیش نظر جو انداز اختیار کیا ہے کہ ان کا قلم جادۂ اعتدال و راستی سے کہیں بھی نہیں بھٹکا۔ تاہم ہماری اس طالبعلمانہ کوشش میں بنی اسرائیل کی کوتاہیوں، جرائم اور جن افعال شنیعہ پر گفتگو کی گئی ہے، اس کا ایک تقابلی جائزہ بھی موجودہ امت مسلمہ کے حالات و واقعات سے کیا گیا ہے کہ آج کی امت کا ہر فرد اپنی انفرادی/ نجی نیز اجتماعی زندگی کے ہمہ پہلوؤں کا جائزہ قرآن اور حدیث وسیرت کے اس آئینے میں لے۔ ظاہر ہے کہ امت مسلمہ کی موجودہ زندگی کسی صورت بھی یہود ونصاریٰ کے گذشتہ کارنامۂ حیات سے بہت زیادہ مختلف نہیں۔ کفر اور قتل وایذائے انبیاء علیہم السلام، شرک ونفاق، جھوٹ، ملاوٹ، کم تولنا، ظلم وستم، رشوت، گراں فروشی غرضیکہ کون سا وہ جرم ہے جو یہودیوں کی تاریخ میں تھا جس کی ''پیروی'' آج

امت کے ہر فرد اور طبقے میں نہیں ہو رہی! ...... یہ کوشش صرف اور صرف اسی بناء پر کی گئی ہے کہ امت کا ہر فرد، چھوٹا بڑا، مرد و زن، امیر و غریب، عالم و جاہل، عوام و خواص اپنا چہرہ اس آئینے میں دیکھ کر اپنے جسم پر موجود ان داغوں کو دور کر سکے اور علامہ اقبال کی اس دعا کا مصداق بنے جو انہوں نے اپنی فارسی رباعی کے دوسرے شعر میں کی تھی

مکن رسوا حضور خواجہؐ مارا
حسابِ من ز چشم او نہاں گیر

اس شعر میں علامہ نے امت کے گئے گذرے اور ایک عامی کی اس خواہش کو واضح کیا ہے کہ وہ بروز قیامت، رسولِ آخر ﷺ کا سامنا، اپنے ان اعمال کے ساتھ نہ کر سکے ـــــ از خود یہ ایک نہایت ہی نیک خواہش ہے

موضوعِ زیر بحث کے تقابلی جائزے کے لیے ہم نے مفتی محمد شفیعؒ صاحب اور ڈاکٹر پیر کرم شاہ الازہری کی تفاسیر سے بھی استفادہ کیا اور چند چیدہ آیات کے تفاسیری نکات کو بھی شامل کتاب کیا ہے۔ واضح رہے کہ جہاں پر دو مفسرین نے ایسے ایسے نکات کا اظہار کیا ہے جس سے موضوع کے تنوع اور وسعت پذیری کا انکشاف ہوتا ہے، وہاں اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ مہمات مسائلِ حیات کے بارے میں مختلف مفسرین اور اہل علم کے ہاں یکسانیت اور ہم آہنگی کا وجود اس علمی مغالطے اور پروپیگنڈے کی تردید کا عملی ثبوت فراہم کرتا ہے جو اعدائے دین اور مغربی اہلِ علم نے اپنے مذموم مقاصد کے لیے اختیار کیا ہوا ہے۔

پروفیسر خورشید احمد کی ہرسہ کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جس کے لئے ہم نہ صرف کے بلکہ کراچی یونیورسٹی اور انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز اسلام آباد کے بھی شکر گزار ہیں۔

مولفین کتاب اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود، ہر اس شخص کے لیے دعا کرتے ہیں جن کے فہم دین سے استفادہ کیا گیا

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد!

کسی قاری کو چند مقامات پر آیات/ترجمہ یا تشریح کے ضمن میں دہرائے جانے کی شکایت ہوسکتی ہے۔ چونکہ قرآن کریم کی مختلف آیات میں یہود کی مختلف ریشہ دوانیوں/حرکات اور جرائم کا ذکر بار بار کیا گیا ہے، اس لحاظ سے ہر باب کی مناسبت سے چند آیات کا دہرایا جانا ضروری تھا جو کسی صورت بھی بارِ خاطر نہیں ہوسکتا۔

کتاب کا عنوان پروفیسر/ڈین (ریٹائرڈ) غلام رسول تنویر صاحب کا تجویز کردہ ہے جس کے لئے ہم اس راہ نمائی کے ممنون ہیں۔ اسی طرح جن مفسرین اور اہل علم کی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے، ان کے لیے ایک حرف دعا کہ امت مسلمہ کے لیے ان کی خدمات ایک مینارہ نور سے کم نہیں۔

نیشنل بک فاؤنڈیشن کے مینجنگ ڈائریکٹر پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق جاوید صاحب کا خصوصی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے کہ فاؤنڈیشن کی اس کتاب کے چند مندرجات بطور حوالہ کتاب میں شامل کیے گئے ہیں!

یہاں اگر ہم اپنی عزیز بہن پروفیسر امینہ سراج صاحبہ اور ان کے نہایت لائق اور قرآن وحدیث کے شناور خاوند پروفیسر حافظ سراج صاحب کا شکریہ ادا نہ کریں تو یہ ایک نا قابلِ معافی جرم ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولفین نے اپنی مقدور بھر کوششوں کے باوجود پروف ریڈنگ میں جس قدر اغلاط کی نشان دہی کی، اس سے کئی گنا زائد اغلاط کی اصلاح انہوں نے کی۔ اللہ تعالیٰ سے ان دونوں کے لیے دین ودنیا میں بھلائیوں کے لیے دست بہ دعا ہیں۔

اس کتاب کا پیش لفظ محب اور نہایت ہی قابل ''صاحب کتب'' محمد الیاس کھوکھر ایڈووکیٹ نے لکھا ہے۔ موصوف علامہ اقبال نیز سیّد مودودی کے حوالے سے ایک درجن سے زائد کتب کے مصنف ہیں۔ ان کی محبت اور مہربانی کے لیے دل کی گہرائیوں سے ان کے نیز دیگر اہل خانہ کے لیے دین ودنیا میں کامرانیوں کی دعائیں۔

اس ضمن میں بطور ایک عامی طالبعلم، کہیں کہیں (شاید زیادہ مرتبہ بھی) تحریر میں تلخی اور تیزی بھی آ گئی ہے۔ اس کا مقصد ہرگز ہرگز کسی فرد یا طبقے کی دل آزاری نہیں، نہ ہی کسی کی عزتِ نفس کو مجروح کرنا ہے کہ

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کا ریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند!

تاہم، اللہ رب العزت سے اپنی ہر قسم کی علمی، عملی فروگرداشتوں اور زیادتی کے لیے معافی کی درخواست کے ساتھ، اہل علم وتقویٰ سے یہ عاجزانہ درخواست بھی ہے کہ اس 'کوشش ناتمام' میں موجود کوتاہیوں، فروگذاشتوں اور کمی کی نشان وہی فرمائیں کہ اس میں موجود ایک بھی کلمہ حق، توفیق ایزدی کا رہینِ منت ہے۔ جب کہ تمام تر اغلاط وتسامح کا تعلق مولفین کی ذاتی علمی اور عملی کوتاہیوں سے ہے جس کے لیے اس رحیم وکریم ذاتِ اقدس سے معافی کے درخواست گار!

ڈاکٹر محمد آفتاب خان
اُم انس

راولپنڈی
رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ
اپریل ۲۰۲۰ء

باب اوّل

یہودیت: قرآن کے آئینے میں

قرآن کریم کا مطالعہ کرنے والے ایک طالب علم کی حیثیت سے جوانی میں یہ سوال اکثر ذہن میں آتا تھا کہ آخر قرآن کریم کے آغاز ہی میں سورہ البقرہ، سورہ آل عمران اور النساء جیسی طویل ترین سورتیں کیوں ہیں۔ کیوں نہ اُن چھوٹی چھوٹی مکی سورتوں سے اس کا آغاز کیا گیا جو مشرکین اور کفار مکہ کے لیے نازل ہوئی تھیں اور جن میں ان تمام عقائد کا بار بار اعادہ کیا گیا تھا جن کے ماننے سے ۲۳ سال کی قلیل مدت میں جو لوگ سینکڑوں بتوں کی پوجا کرتے تھے، وہ اللہ واحد کے ماننے والے بن گئے اور نہ صرف ان کی زندگی یکسر بدل کر رہ گئی بلکہ رسول ﷺ پر ایمان لانے اور عقیدہ آخرت پر یقین کی وجہ سے انہوں نے دنیا کے ایک بہت بڑے حصے تک اس دعوتِ توحید کو پہنچایا جس کے طفیل آج کے مسلمانوں کو بھی امتِ محمدیہ ﷺ میں شمولیت کا شرف حاصل ہوا۔ جوانی میں اپنی کم فہمی کی بناء پر اسی کشمکش میں زندگی کے شب و روز گزرتے رہے تا آنکہ ایک دن یکا یک قرآن کریم کی ان آیات نے اس مسئلے کا حل خود ہی پیش کر دیا۔

يٰبَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِيَ الَّتِيۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَ اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِيۡٓ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ ۚ وَ اِيَّايَ فَارۡهَبُوۡنِ ۝ (البقرہ: ۴۰)

''اے بنی اسرائیل! ذرا خیال کرو میری اس نعمت کا جو میں نے تم کو عطا کی تھی، میرے ساتھ تمہارا جو عہد تھا اُسے تم پورا کرو، تو میرا جو عہد تمہارے ساتھ تھا اُسے میں پورا کروں اور مجھ ہی سے تم ڈرو۔''

ان آیات کی تشریح تفہیم القرآن میں پڑھنے سے پتہ چلا کہ یہاں نعمت سے مراد

بنی اسرائیل کے بطور امتِ مسلمہ فائز ہونے کی جانب اشارہ کیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں سید مودودیؒ نے اپنے تشریحی نوٹ نمبر ۵۶ میں لکھا: ''یہاں سے چودھویں رکوع تک مسلسل ایک تقریر اس قوم کو خطاب کرتے ہوئے چلتی ہے۔ اس تقریر کو پڑھتے ہوئے حسب ذیل باتوں کو خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہیے:

''اولاً، اس کا منشا یہ ہے کہ پچھلے پیغمبروں کی اُمت میں جو تھوڑے بہت لوگ ابھی ایسے باقی ہیں جن میں خیر و صلاح کا عنصر موجود ہے، انہیں اس صداقت پر ایمان لانے اور اس کام میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے جس کے ساتھ محمد ﷺ اُٹھائے گئے تھے۔ اس لیے ان کو بتایا جا رہا ہے کہ یہ قرآن اور یہ نبی وہی پیغام اور وہی کام لے کر آیا ہے جو اس سے پہلے تمہارے انبیاء اور تمہارے پاس آنے والے صحیفے لائے تھے۔ پہلے یہ چیز تم کو دی گئی تھی تاکہ تم آپ بھی اس پر چلو اور دنیا کو بھی اس کی طرف بلانے اور اس پر چلانے کی کوشش کرو۔ مگر تم دنیا کی رہنمائی تو کیا کرتے، خود بھی اس ہدایت پر قائم نہ رہے اور بگڑتے چلے گئے۔ تمہاری تاریخ اور تمہاری قوم کی موجودہ اخلاقی و دینی حالت خود تمہارے بگاڑ پر گواہ ہے۔''

''ثانیاً، اس کا منشا عام یہودیوں پر حجت تمام کرنا اور صاف صاف ان کی دینی و اخلاقی حالت کو کھول کر رکھ دینا ہے۔ ان پر ثابت کیا جا رہا ہے کہ یہ وہی دین ہے، جو تمہارے انبیاء لے کر آئے تھے۔ اُصولِ دین میں سے کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے، جس میں قرآن کی تعلیم تورات کی تعلیم سے مختلف ہو۔ ان پر ثابت کیا جا رہا ہے کہ جو ہدایت تمہیں دی گئی تھی اس کی پیروی کرنے میں، اور جو رہنمائی کا منصب تمہیں دیا گیا تھا اس کا حق ادا کرنے میں تم بری طرح ناکام ہوئے ہو۔ اس کے ثبوت میں ایسے واقعات سے استشہاد کیا گیا ہے جن کی تردید وہ نہ کر سکتے تھے۔ پھر جس طرح حق کو حق جاننے کے باوجود وہ اس کی مخالفت میں سازشوں، وسوسہ اندازیوں، کج بحثیوں اور مکاریوں سے کام لے رہے تھے، اور جن ترکیبوں سے وہ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح محمد ﷺ کا

مشن کامیاب نہ ہونے پائے، ان سب کی پردہ دری کی جا رہی ہے، جس سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ ان کی ظاہری مذہبیت محض ایک ڈھونگ ہے، جس کے نیچے دیانت اور حق پرستی کے بجائے ہٹ دھرمی، جاہلانہ عصبیت اور نفس پرستی کام کر رہی ہے اور حقیقت میں وہ یہ چاہتے ہی نہیں ہیں کہ نیکی کا کوئی کام پھل پھول سکے۔ اس طرح اتمامِ حجت کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک طرف خود اس قوم میں جو صالح عنصر تھا، اس کی آنکھیں کھل گئیں، دوسری طرف مدینے کے عوام پر اور بالعموم مشرکین عرب پر ان لوگوں کا جو مذہبی و اخلاقی اثر تھا، وہ ختم ہوگیا، اور تیسری طرف خود اپنے آپ کو بے نقاب دیکھ کر ان کی ہمتیں اتنی پست ہوگئیں کہ وہ اس جرأت کے ساتھ کبھی مقابلے میں کھڑے نہ ہوسکے جس کے ساتھ ایک وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے اپنے حق پر ہونے کا یقین ہو۔''

ثالثاً، ''اسی سلسلے میں ایک خاص قوم کی معین مثال لے کر بتایا جا رہا ہے کہ جو قوم خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت سے منہ موڑتی ہے، اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس توضیح کے لیے تمام قوموں میں سے بنی اسرائیل کو منتخب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں صرف یہی ایک قوم ہے جو مسلسل چار ہزار برس سے تمام اقوامِ عالم کے سامنے ایک زندہ نمونہ عبرت بنی ہوئی ہے۔ ہدایت الٰہی پر چلنے اور نہ چلنے سے جتنے نشیب و فراز کسی قوم کی زندگی میں رونما ہوسکتے ہیں وہ سب اس قوم کی عبرتناک سرگزشت میں نظر آجاتے ہیں۔''

رابعاً، ''اس سے پیروانِ محمد ﷺ کو سبق دینا مقصود ہے کہ وہ اس انحطاط کے گڑھے میں گرنے سے بچیں جس میں پچھلے انبیاء کے پیرو گر گئے۔ یہودیوں کی اخلاقی کمزوریوں، مذہبی غلط فہمیوں اور اعتقادی و عملی گمراہیوں میں سے ایک ایک کی نشان دہی کرکے اس کے بالمقابل دینِ حق کے مقتضیات بیان کئے گئے ہیں تاکہ مسلمان اپنا راستہ دیکھ سکیں اور غلط راہوں سے بچ کر چلیں۔ اس سلسلے میں یہود و نصاریٰ پر تنقید کرتے ہوئے قرآن پڑھتے وقت مسلمانوں کو نبی ﷺ کی وہ حدیث یاد رکھنی چاہیے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے تم بھی آخر کار پچھلی اُمتوں ہی کی روش پر چل کر رہو گے حتیٰ کہ

اگر وہ کسی گوہ کے بل میں گھسے ہیں تو تم بھی اسی میں گھسو گے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یا رسول اللہ، کیا یہود و نصاریٰ مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا اور کون؟۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد محض ایک تو بیخ نہ تھا بلکہ اللہ کی دی ہوئی بصیرت سے آپ یہ جانتے تھے کہ انبیاء کی اُمتوں میں بگاڑ کن کن راستوں سے آیا اور کن کن شکلوں میں ظہور کرتا رہا ہے۔''

اسی طرح سورہ البقرہ کی آیات ۴۱ تا ۴۲ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾

''اور میں نے جو کتاب بھیجی ہے اس پر ایمان لاؤ۔ یہ اس کتاب کی تائید میں ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی، لہٰذا سب سے پہلے تم ہی اس کے منکر نہ بن جاؤ۔ تھوڑی قیمت پر میری آیات کو نہ بیچ ڈالو اور میرے غضب سے بچو۔ باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور نہ جانتے بوجھتے حق کو چھپانے کی کوشش کرو۔''

درج بالا آیات کی تشریح حاشیہ نمبر ۵۸ میں یوں کی گئی ہے جس سے اس ''جرمِ عظیم'' کا پتہ چل جاتا ہے جو بنی اسرائیل ۴۰۰۰ سال سے مسلسل دہرا رہے تھے جن کی بناء پر ان کی معزولی ہوئی۔ (مزید جرائم باب نمبر دوم میں درج کیے جا رہے ہیں)۔ سید مودودیؒ نے مزید لکھا۔

''اس آیت کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اہل عرب بالعموم ناخواندہ لوگ تھے اور ان کے مقابلے میں یہودیوں کے اندر ویسے بھی تعلیم کا چرچا زیادہ تھا، اور انفرادی طور پر ان میں ایسے ایسے جلیل القدر عالم پائے جاتے تھے جن کی شہرت عرب کے باہر تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے عربوں پر یہودیوں کا علمی رُعب بہت زیادہ تھا۔ پھر ان کے علما اور مشائخ نے اپنے مذہبی درباروں کی ظاہری شان جما کر اور اپنی جھاڑ

پھونک اور تعویذ گنڈوں کا کاروبار چلا کر اس رُعب کو اور بھی زیادہ گہرا اور وسیع کر دیا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ اہل مدینہ ان سے بے حد مرعوب تھے، کیونکہ ان کے آس پاس بڑے بڑے یہودی قبائل آباد تھے، رات دن کا ان سے میل جول تھا، اور اس میل جول میں وہ ان سے اسی طرح شدت کے ساتھ متاثر تھے جس طرح ایک اَن پڑھ آبادی زیادہ تعلیم یافتہ، زیادہ متمدن اور زیادہ نمایاں مذہبی تشخص رکھنے والے ہمسایوں سے متاثر ہوا کرتی ہے۔ ان حالات میں جب نبی ﷺ نے اپنے آپ کو نبی کی حیثیت سے پیش کیا اور لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینی شروع کی، تو قدرتی بات تھی کہ اَن پڑھ عرب اہل کتاب یہودیوں سے جا کر پوچھتے کہ آپ لوگ بھی ایک نبی کے پیرو ہیں اور ایک کتاب کو مانتے ہیں، آپ ہمیں بتائیں کہ یہ صاحب جو ہمارے اندر نبوت کا دعویٰ لے کر اُٹھے ہیں، ان کے متعلق اور ان کی تعلیم کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ چنانچہ یہ سوال مکے کے لوگوں نے بھی یہودیوں سے بارہا کیا، اور جب نبی ﷺ مدینے تشریف لائے تو یہاں بھی بکثرت لوگ یہودی علما کے پاس جا جا کر یہی بات پوچھتے تھے۔ مگر ان علماء نے کبھی لوگوں کو صحیح بات نہ بتائی۔ ان کے لیے یہ کہنا تو مشکل تھا کہ وہ توحید، جو محمد ﷺ پیش کر رہے ہیں غلط ہے، یا انبیاء اور کتب آسمانی اور ملائکہ اور آخرت کے بارے میں جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، اس میں کوئی غلطی ہے، یا وہ اخلاقی اصول، جن کی آپ تعلیم دے رہے ہیں، ان میں سے کوئی چیز غلط ہے۔ لیکن وہ صاف صاف اس حقیقت کا اعتراف کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھے کہ جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں، وہ صحیح ہے۔ وہ نہ سچائی کی کھلی کھلی تردید کر سکتے تھے، نہ سیدھی طرح اس کو سچائی مان لینے پر آمادہ تھے۔ ان دونوں راستوں کے درمیان انہوں نے طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ ہر سائل کے دل میں نبی ﷺ کے خلاف، آپ کی جماعت کے خلاف، اور آپ کے مشن کے خلاف کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیتے تھے، کوئی الزام آپ پر چسپاں کر دیتے تھے، کوئی ایسا شوشہ چھوڑ دیتے تھے جس سے لوگ شکوک وشبہات میں پڑ جائیں، اور طرح طرح کے اُلجھن میں ڈالنے والے

سوالات چھیڑ دیتے تھے تا کہ لوگ ان میں خود بھی اُلجھیں اور نبی ﷺ اور آپ کے پیرووں کو بھی اُلجھانے کی کوشش کریں۔ان کا یہی رویہ تھا،جس کی بنا پر ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ حق پر باطل کے پردے نہ ڈالو۔اپنے جھوٹے پروپیگنڈے اور شریرانہ شبہات و اعتراضات سے حق کو دبانے اور چھپانے کی کوشش نہ کرو، اور حق و باطل کو خلط ملط کر کے دنیا کو دھوکا نہ دو!

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (البقرہ:۴۷)

’’اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری اس نعمت کو، جس سے میں نے تمہیں نوازا تھا اور اس بات کو کہ میں نے تمہیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت عطا کی تھی۔‘‘

اس کی تشریح میں سید مودودیؒ نے تصریح کی کہ ’’یہ اس دور کی طرف اشارہ ہے جب کہ تمام دنیا کی قوموں میں ایک بنی اسرائیل کی قوم ہی ایسی تھی، جس کے پاس اللہ کا دیا ہوا علم حق تھا اور جسے اقوامِ عالم کا امام و راہ نما بنا دیا گیا تھا تا کہ وہ بندگیٔ رب کے راستے پر سب قوموں کو بلائے اور چلائے‘‘(حاشیہ نمبر ۶۲)

پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ نے اپنی تفسیر (۱۹۹۵) میں آیات ۴۱-۴۲ کی تشریح حاشیہ نمبر ۶۰ میں یوں کی کہ ’’تورات کے صفحات نبی اکرم ﷺ کے کمالات و صفات کے ذکر سے مزین تھے۔علماء بنی اسرائیل ان کو چھپانے کی کوشش کرنے میں لگے رہتے تا کہ لوگ ان پر مطلع ہو کر حضور ﷺ پر ایمان نہ لے آئیں‘‘......’’اللہ تعالیٰ انہیں اس مذموم حرکت سے منع فرماتے ہیں۔لبس کے دو معنی ہیں ڈھانپ لینا اور خلط ملط کر دینا اس سے ہر طرح کی تحریف لفظی ہو یا معنوی سے باز آنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔یہ حکم صرف بنی اسرائیل کے علماء کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ ملت اسلامیہ سے نسبت رکھنے والے علماء کو بھی شامل ہے‘‘......کیا پیر صاحب کے اس قول پر موجودہ دور کے اہل علم غور کرنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے؟ اور ان سے بھی زیادہ ان کے وہ مریدین (عوام الناس بشمول

اعلیٰ افسران، پڑھے لکھے لوگ، طبقۂ امراس کے لوگ) جو اپنے اپنے فرقے کے اہل علم کی اندھا دھند پیروی میں لگے رہنے ہی کو اسلام سمجھتے ہیں؟

اس سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے، اللہ کریم نے سورہ البقرہ کی آیت ۴۷ میں بنی اسرائیل کے بگاڑ کی سب سے بڑی وجہ یوں بیان کی۔

''بنی اسرائیل کے بگاڑ کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ آخرت کے متعلق ان کے عقیدے میں خرابی آ گئی تھی۔ وہ اس قسم کے خیالاتِ خام میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ہم جلیل القدر انبیاء کی اولاد ہیں، بڑے بڑے اولیاء، صلحاء اور زہاد سے نسبت رکھتے ہیں، ہماری بخشش تو انہیں بزرگوں کے صدقے میں ہو جائے گی، ان کا دامن گرفتہ ہو کر بھلا کوئی سزا کیسے پا سکتا ہے۔ انہیں جھوٹے بھروسوں نے ان کو دین سے غافل اور گناہوں کے چکر میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس لیے نعمت یاد دلانے کے ساتھ فوراً ہی ان کی ان غلط فہمیوں کو دور کیا گیا ہے۔'' (حاشیہ نمبر ۶۳)

یہود کے اس قسم کے خیالات پر تنقید کا جو سلسلہ سورہ البقرہ میں شروع ہوا تھا، وہ اس سورہ کے اختتام تک چلتا رہتا ہے۔ نیز قرآن کی دیگر سورتوں میں بھی ہے۔ اس ضمن میں یہود کے طرز عمل پر مختلف آیات میں گرفت کی گئی ہے جس سے نہ صرف یہود کی غلطیوں کا اظہار مقصود ہے بلکہ دراصل اللہ کے رسول ﷺ کی جس امت کو اب ''امت وسط'' کے جلیل القدر منصب پر فائز کیا جا رہا ہے، اسے بہ انداز دیگراں سمجھایا جا رہا ہے کہ ہوشیار اور خبردار ہنا کہ

دل مردہ، دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ!

جیسا کہ اشارہ کیا گیا کہ سورہ البقرہ کی آیات ۴۷ تا قریباً اختتام، بنی اسرائیل کی تاریخ سے چیدہ چیدہ واقعات بیان کرتے ہوئے ایک طرف تو انہیں بتایا گیا ہے کہ ان کی

معزولی کا یہ فیصلہ ان کی گزشتہ ہزار سالوں کی فروگذاشتوں، زیادتیوں اور گناہوں کی بناء پر کیا گیا ہے مبادا کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ معزولی کیونکر ہوئی؟ اور دوسری جانب نو وارد امت مسلمہ کو بتایا جا رہا ہے کہ ان تمام غلطیوں سے دامن بچا کر چلنے ہی میں تمہاری بھی عافیت ہے۔ اس ضمن میں ضروری محسوس ہوتا ہے کہ سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے سورہ البقرہ کے آغاز میں جو جامع نوٹ لکھا ہے، اس کے مندرجات سے بھی قارئین کو آگاہ کریں۔ آپ نے تحریر کیا کہ:

''اس سورۃ کو سمجھنے کے لیے پہلے اس کا تاریخی پس منظر اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے:

(۱) ہجرت سے قبل جب تک مکہ میں اسلام کی دعوت دی جاتی رہی، خطاب بیشتر مشرکین عرب سے تھا جن کے لیے اسلام کی آواز ایک نئی اور غیر مانوس آواز تھی۔ اب ہجرت کے بعد سابقہ یہودیوں سے پیش آیا جن کی بستیاں مدینہ سے بالکل متصل ہی واقع تھیں۔ یہ لوگ توحید، رسالت، وحی، آخرت اور ملائکہ کے قائل تھے، اس ضابطۂ شرعی کو تسلیم کرتے تھے جو خدا کی طرف سے ان کے نبی موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا، اور اُصولاً ان کا دین وہی اسلام تھا جس کی تعلیم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے۔ لیکن صدیوں کے مسلسل انحطاط نے ان کو اصل دین سے بہت دور ہٹا دیا تھا۔ ◆ ان کے عقائد میں بہت سے غیر اسلامی عناصر کی آمیزش ہوگئی تھی جن کے لیے توراۃ میں کوئی سند موجود نہ تھی۔ ان کی عملی زندگی میں بکثرت ایسے رسوم اور طریقے رواج پا گئے تھے جو اصل دین میں نہ تھے اور جن کے لیے توراۃ میں کوئی ثبوت نہ تھا۔ خود توراۃ کو انہوں نے انسانی کلام کے اندر خلط ملط کر دیا تھا، اور خدا کا کلام جس حد تک لفظاً یا معنیً محفوظ تھا اس کو بھی انہوں نے اپنی من مانی تاویلوں اور تفسیروں سے مسخ کر رکھا تھا۔ دین کی حقیقی روح ان میں سے نکل چکی تھی اور

◆ ''اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گذرے ہوئے تقریباً ۱۹ صدیاں گذر چکی تھیں۔ اسرائیلی تاریخ کے حساب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ۱۲۷۲ قبل مسیح میں وفات پائی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ۶۱۰ء بعد مسیح میں منصب نبوت پر فائز ہوئے۔''

ظاہری مذہبیت کا محض ایک بے جان ڈھانچہ باقی تھا جس کو وہ سینہ سے لگائے ہوئے تھے۔ ان کے علماء اور مشائخ، ان کے سردارانِ قوم اور ان کے عوام سب کی اعتقادی، اخلاقی اور عملی حالت بگڑ گئی تھی، اور اپنے اس بگاڑ سے ان کو ایسی محبت تھی کہ وہ کسی اصلاح کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ صدیوں سے مسلسل ایسا ہو رہا تھا کہ جب کوئی اللہ کا بندہ انہیں دین کا سیدھا راستہ بتانے آتا تو وہ اسے اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے اور ہر ممکن طریقہ سے کوشش کرتے تھے کہ وہ کسی طرح اصلاح میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ لوگ حقیقت میں بگڑے ہوئے مسلمان تھے جن کے ہاں بدعتوں اور تحریفوں، موشگافیوں اور فرقہ بندیوں، استخواں گیری و مغز افگنی، خدا فراموشی و دنیا پرستی کی بدولت انحطاط اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ وہ اپنا اصل نام ''مسلم'' تک بھول گئے تھے، محض ''یہودی'' بن کر رہ گئے تھے اور اللہ کے دین کو انہوں نے محض نسل اسرائیل کی آبائی وراثت بنا کر رکھ دیا تھا۔ پس جب نبی ﷺ مدینہ پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت فرمائی کہ ان کو اصل دین کی طرف دعوت دیں۔ چنانچہ سورۂ بقرہ کے ابتدائی پندرہ سولہ رکوع اسی دعوت پر مشتمل ہیں ان میں یہودیوں کی تاریخ اور ان کی اخلاقی و مذہبی حالت پر جس طرح تنقید کی گئی ہے، اور جس طرح ان کے بگڑے ہوئے مذہب و اخلاق کی نمایاں خصوصیات کے مقابلہ میں حقیقی دین کے اصول پہلو بہ پہلو پیش کیے گئے ہیں، اس سے یہ بات بالکل آئینے کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ایک پیغمبر کی امت کے بگاڑ کی نوعیت کیا ہوتی ہے، رسمی دینداری کے مقابلہ میں حقیقی دینداری کس چیز کا نام ہے، دین حق کے بنیادی اصول کیا ہیں اور خدا کی نگاہ میں اصل اہمیت کن چیزوں کی ہے۔''

اسی سورت کی آیت نمبر ۷۵ کی تشریح میں مزید تحریر کیا کہ:

''یہ خطاب مدینے کے ان نو مسلموں سے ہے جو قریب کے زمانے ہی میں، نبی ﷺ پر ایمان لائے تھے۔ ان لوگوں کے کان میں پہلے سے نبوت، کتاب، ملائکہ، آخرت اور شریعت وغیرہ کی جو باتیں پڑی ہوئی تھیں، وہ

سب انہوں نے اپنے ہمسایہ یہودیوں سے سنی تھیں۔ اور یہ بھی انہوں نے یہودیوں ہی سے سنا تھا کہ دنیا میں ایک پیغمبر اور آنے والا ہے اور یہ کہ جو لوگ ان کا ساتھ دیں گے وہ ساری دنیا پر چھا جائیں گے۔ یہی معلومات تھیں جن کی بناء پر اہل مدینہ نبی ﷺ کی نبوت کا چرچا سن کر آپ ﷺ کی طرف خود متوجہ ہوئے اور جوق در جوق ایمان لائے۔ اب وہ متوقع تھے کہ جو لوگ پہلے ہی سے انبیاء اور کتب آسمانی کے پیرو ہیں اور جن کی دی ہوئی خبروں کی بدولت ہی ہم کو نعمت ایمان میسر ہوئی ہے، وہ ضرور ہمارا ساتھ دیں گے، بلکہ اس راہ میں پیش پیش ہوں گے۔ چنانچہ یہی توقعات لے کر یہ پرجوش نو مسلم اپنے یہودی دوستوں اور ہمراہیوں کے پاس جاتے تھے اور ان کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ پھر جب وہ اس دعوت کا جواب انکار سے دیتے تو منافقین اور مخالفین اسلام اس سے یہ استدلال کرتے کہ معاملہ کچھ مشتبہ ہی معلوم ہوتا ہے، ورنہ اگر یہ واقعی نبی ہوتے تو آخر کیسے ممکن تھا کہ اہل کتاب کے علماء اور مشائخ اور مقدس بزرگ جانتے بوجھتے ایمان لانے سے منہ موڑتے اور خوامخواہ اپنی عاقبت خراب کر لیتے۔ اس بناء پر بنی اسرائیل کی تاریخی سرگذشت بیان کرنے کے بعد اب ان سادہ دل مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ جن لوگوں کی سابق روایات یہ کچھ رہی ہیں ان سے تم کچھ بہت زیادہ لمبی چوڑی توقعات نہ رکھو، ورنہ جب ان کے پتھر دلوں سے تمہاری دعوتِ حق ٹکرا کر واپس آئے گی تو دل شکستہ ہو جاؤ گے۔ یہ لوگ تو صدیوں کے بگڑے ہوئے ہیں۔ اللہ کی جن آیات کو سن کر تم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، انہی سے کھیلتے اور تمسخر کرتے ان کی نسلیں بیت گئی ہیں۔ دین حق کو مسخ کر کے یہ اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال چکے ہیں اور اسی مسخ شدہ دین سے یہ نجات کی امیدیں باندھے بیٹھے ہیں۔ ان سے یہ توقع رکھنا فضول ہے کہ حق کی آواز

بلند ہونے پر یہ ہر طرف سے دوڑے چلے آئیں گے۔'' (حاشیہ ۸۶)

درج بالا صفحات میں بنی اسرائیل کی دین موسوی (اسلام) کو مسخ کرنے اور دینی احکامات سے کھیلنے کی جو چند مثالیں درج کی گئی ہیں۔ (آئندہ صفحات میں مزید گفتگو کی جائے گی) ان سے معلوم ہوتا ہے:

☆ کہ یہود کی وہ کون سی چیدہ چیدہ حرکات تھی، جن سے وہ کھیلا کرتے تھے اور نہ صرف یہودی عوام بلکہ عرب کے مشرکین اور کفار کو بھی بیوقوف بنایا کرتے تھے، ان کو واشگاف طور پر بیان کر دیا گیا۔

☆ ہجرت مدینہ سے قبل اور بعد جن لوگوں نے اسلام قبول کیا، ان میں بیشتر لوگ ایسے تھے جنہوں نے آنے والے نبی کا چرچا، یہود کی زبانی سنا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ایمان لانے میں نہ صرف ہم سے سبقت لے جائیں گے بلکہ اس راہ پر چلنے میں ہماری مدد بھی کریں گے لیکن وہ یہ جان کر مایوس ہوئے کہ یہود نے ان نومسلموں کی ہر طرح سے دل شکنی کی اور کوشش کی کہ کسی طرح وہ دوبارہ اپنی پہلی حالت کفر میں چلے جائیں لیکن ایسا نہ ہوسکا۔''

☆ ''یہودی علماء نے نہ صرف نومسلم اہل مدینہ کو ورغلانے / دھوکہ دینے کی کوشش کی بلکہ انہوں نے اپنی کتب سماوی (تورات، زبور) میں تحریف بھی کی۔ تحریف کا یہ مطلب ہے کہ بات کو اصلی معنی ومفہوم سے پھیر کر اپنی خواہش کے مطابق کچھ دوسرے معنی پہنا دیئے جائیں۔ نیز الفاظ میں تغیر وتبدل کرنا بھی تحریف کہلاتا ہے۔ علمائے بنی اسرائیل یہ دونوں طرح کی تحریفیں کرنے کے عادی تھے۔''

☆ ''یہود آپس میں ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ تورات اور دیگر کتب آسمانی میں جو پیشن گوئیاں اس نبی ﷺ کے متعلق موجود ہیں، یا جو آیات اور تعلیمات ہماری مقدس کتابوں میں ایسی ملتی ہیں جن سے ہماری موجودہ روش پر گرفت ہوسکتی ہے، انہیں مسلمانوں کے سامنے بیان نہ کرو، ورنہ یہ تمہارے رب کے سامنے ان کو

تمہارے خلاف حجت کے طور پر پیش کریں گے۔ یہ تھا اللہ کے متعلق ان ظالموں کے فسادِ عقیدہ کا حال۔ گویا وہ اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ اگر دنیا میں وہ اپنی تحریفات اور اپنی حق پوشی کو چھپا گئے تو آخرت میں ان پر مقدمہ نہ چل سکے گا۔''

مزید تشریح کرتے ہوئے لکھا کہ

''ان لوگوں نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ کلام الٰہی کے معانی کو اپنی خواہشات کے مطابق بدلا ہو بلکہ یہ بھی کیا کہ بائبل میں اپنی تفسیروں کو، اپنی قومی تاریخ کو، اپنے اوہام اور قیاسات کو، اپنے خیالی فلسفوں کو، اور اپنے اجتہاد سے وضع کیے ہوئے فقہی قوانین کو کلام الٰہی کے ساتھ خلط ملط کر دیا اور یہ ساری چیزیں لوگوں کے سامنے اس حیثیت سے پیش کیں کہ گویا یہ سب اللہ ہی کی طرف سے آئی ہوئی ہیں۔ ہر تاریخی افسانہ، ہر مفسر کی تاویل، ہر متکلم کا الٰہیاتی عقیدہ اور ہر فقیہہ کا قانونی اجتہاد، جس نے مجموعہ کتب مقدسہ (بائبل) میں جگہ پائی، اللہ کا قول بن کر رہ گیا۔ اس پر ایمان لانا فرض ہوگیا اور اس سے پھرنے کے معنی دین سے پھر جانے کے ہو گئے۔''

درج بالا غلط فہمیوں کے علاوہ ایک اور تاریخی حقیقت کا انکشاف سورہ البقرہ کی آیات ۸۹ میں یوں کیا گیا ہے:

وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫

(البقرہ:۸۹)

''اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے، (اس کے ساتھ ان کا برتاؤ کیا ہے) باوجودیکہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی، باوجودیکہ اس کی آمد سے پہلے وہ خود کفار کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے، مگر جب وہ چیز آگئی، جسے وہ پہچان بھی گئے تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا——''

صاحب تفہیم القرآن نے لکھا کہ:

''نبی کی آمد سے پہلے یہودی بے چینی کے ساتھ اسی نبی کے منتظر تھے جس کی بعثت کی پیش گوئیاں ان کے انبیاء نے کی تھیں۔ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ جلدی سے وہ آئے تو کفار کا غلبہ مٹے اور پھر ہمارے عروج کا دور شروع ہو۔ خود اہل مدینہ اس بات کے شاہد تھے کہ بعثتِ محمدی ﷺ سے پہلے یہی ان کے ہمسایہ یہودی آنے والے نبی کی امید پر جیا کرتے تھے اور ان کا آئے دن کا تکیہ کلام یہی تھا کہ ''اچھا اب تو جس جس کا جی چاہے ہم پر ظلم کر لے، جب وہ نبی آئے گا تو ہم ان سب ظالموں کو دیکھ لیں گے۔'' اہل مدینہ یہ باتیں سنے ہوئے تھے، اسی لیے جب انہیں نبی کے حالات معلوم ہوئے تو انہوں نے آپس میں کہا کہ دیکھنا، کہیں یہ یہودی تم سے بازی نہ لے جائیں۔ چلو، پہلے ہم ہی ایمان لے آئیں۔ مگر ان کے لیے یہ عجیب ماجرا تھا کہ وہی یہودی جو آنے والے نبی کے انتظار میں گھڑیاں گن رہے تھے، ان کے آنے پر سب سے بڑھ کر اس کے مخالف ہو گئے۔'' (حاشیہ ۹۵)

سید مودودی نے مزید وضاحت کی کہ یہ جو فرمایا کہ:

''وہ اس کو پہچان بھی گئے تو اس کے متعدد ثبوت اسی زمانے میں مل گئے تھے۔ سب سے زیادہ معتبر شہادت ام المومنین حضرت صفیہ ؓ کی ہے جو خود ایک بڑے یہودی عالم کی بیٹی اور ایک دوسرے عالم کی بھتیجی تھیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ جب نبی ﷺ مدینے تشریف لائے تو میرے باپ اور چچا دونوں آپ سے ملنے گئے۔ بڑی دیر تک آپ سے گفتگو کی۔ پھر جب گھر واپس آئے تو میں نے اپنے کانوں سے ان دونوں کو یہ گفتگو کرتے سنا۔''

چچا: کیا واقعی یہ وہی نبی ﷺ ہے جس کی خبر میں ہماری کتابوں میں دی گئی ہیں؟

والد: خدا کی قسم ہاں۔

چچا: کیا تم کو اس کا یقین ہے؟

والد: ہاں

چچا: پھر کیا ارادہ ہے؟

والد: جب تک جان میں جان ہے، اس کی مخالفت کروں گا اور اس کی بات چلنے نہ دوں گا۔ (ابن ہشام جلد دوم ص ۱۶۵، طبع جدید، ص ۹۶، تفہیم القرآن)''

اقوام عالم کے مذاہب کا مطالعہ کرنے سے ایک عجیب سی ہم آہنگی مختلف مذہبی لیڈروں کے فکر و عمل میں نظر آتی ہے کہ وہ ہر نئی بات (جو ان کے مزعومہ خیالات وعقائد) سے ہٹ کر کہی جائے اس کی مخالفت میں ڈٹ جاتے رہے ہیں۔ بلاشبہ چند امور تو ایسے ہو سکتے ہیں کہ بنیادی عقائد کے بارے میں کسی غلط بات کی تردید کی جائے لیکن الہامی مذاہب جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ ان کے بنیادی عقائد (زمان و مکان سے ماورا) از آدم علیہ السلام تا حضرت محمد ﷺ ایک ہی حقیقت کے طور پر بیان ہوتے رہے ہیں۔ بنی اسرائیل کا دین بھی دراصل اسلام ہی تھا جو امتدادِ زمانہ سے یہودیت یا عیسائیت میں تبدیل کر دیا گیا۔ مدینہ میں جب اللہ کے رسول ﷺ نے دعوت توحید کا آغاز کیا تو سب سے پہلی موثر ترین آواز اس کے خلاف اٹھانے کا شرف یہود کو حاصل ہوا۔ جس کی بہت واضح مثال درج بالا واقعہ ہے!۔ انہوں نے مسلمانوں کو مختلف قسم کے سوالوں میں الجھانے کی کوششیں شروع کیں۔ سورہ البقرہ (آیات ۸۹ تا ۱۲۰) میں ان اعتراضات کے جوابات دیے گئے ہیں جو یہود اکثر کیا کرتے تھے مثلاً: اہل ایمان کو ہدایت کی گئی:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو: رَاعِنَا نہ کہا کرو، بلکہ اُنْظُرْنَا کہو اور توجہ سے سنو۔ اس ضمن میں سید مودودیؒ نے حاشیہ نمبر ۱۰۷۔۱۰۸ میں لکھا:

''جب نبی ﷺ مدینے پہنچے اور ان اطراف میں اسلام کی دعوت پھیلنی شروع ہوئی تو یہودی مسلمانوں کو مذہبی بحثوں میں الجھانے کی کوشش کرتے تھے اور اپنی موشگافیوں

اور تشکیکات اور سوال سے سوال نکالنے کی بیماری ان سیدھے اور سچے لوگوں کو بھی لگانا چاہتے تھے اور خود نبی اکرم ﷺ کی مجلس میں آکر پرفریب مکارانہ باتیں کر کے اپنی گھٹیا درجے کی ذہنیت کا ثبوت دیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں ان کی حرکات مختصر طور پر ذیل میں درج کی جارہی ہیں۔

(الف) حضور ﷺ کی مجلس میں یہودی ذومعنی الفاظ بولتے تھے۔ زور سے کچھ کہتے تھے اور زیر لب کچھ اور کہہ دیتے تھے۔ اس ضمن میں ایک خاص لفظ کے استعمال سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے۔ وہ دورانِ گفتگو حضور ﷺ سے کسی بات کو مزید سمجھنے کے لیے راعنا کہتے۔ بظاہر اس کا مطلب ''ہمیں سمجھ لینے دیں'' تاہم عبرانی زبان (جو یہودیوں کی قدیم ترین زبان تھی اور تورات اس میں نازل ہوئی تھی) میں اس کے معنی ''سن،تو بہرا ہو جائے''۔ نیز عربی زبان میں بھی اس کے مختلف معانی تھے جن میں تذلیل کا پہلو ہوتا تھا۔ اس لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اس لفظ کے استعمال سے پرہیز کریں اور غور سے نبی ﷺ کی بات سنیں۔

اسی طرح آیت نمبر ۱۰۸ میں فرمایا گیا کہ یہودی موشگافیاں کر کے طرح طرح کے سوالات مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے تھے اور انہیں اکساتے تھے کہ اپنے نبی ﷺ سے یہ اور یہ بات پوچھو۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ یہود کی اس روش کو اختیار کرنے سے بچیں۔ نیز اللہ کے رسول ﷺ نے ازخود بھی مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ ''جن سوالات کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے نہیں چھیڑا، ان کی کھوج میں نہ لگو۔ بس جو حکم تمہیں دیا جاتا ہے، اس کی پیروی کرو اور جن امور سے منع کیا جاتا ہے ان سے رک جاؤ۔ دوراز کار باتیں چھوڑ کر کام کی باتوں پر توجہ صرف کرو۔'' (حاشیہ ۱۱۰)

اس طرح کے چند دیگر اعتراضات کے جوابات دیتے ہوئے، قرآن کریم نے مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ ''یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقوں پر نہ چلنے لگو۔'' (آیت: ۱۲۰)۔ اس کی تشریح میں سید مودودی نے لکھا کہ

''وہ تو اس لیے تم سے ناراض ہیں کہ تم نے اللہ کی آیات اور اس کے دین کے ساتھ وہ منافقانہ اور بازی گرانہ طرز عمل کیوں نہ اختیار کیا، خدا پرستی کے پردے میں وہ خود پرستی کیوں نہ کی، دین کے اصول واحکام کو اپنے تخیلات یا اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے میں اس دیدہ دلیری سے کیوں نہ کام کیا، وہ ریاکاری اور گندم نمائی جوفروشی کیوں نہ کی جو خود ان کا اپنا شیوہ ہے لہٰذا انہیں راضی کرنے کی فکر چھوڑ دو۔'' (حاشیہ نمبر ۱۲۱ کا خلاصہ)

بنی اسرائیل کے منصب امامت سے معزول کرنے اور امتِ محمدیہ ﷺ کو اس منصب پر فائز کرنے کے بارے میں جو کچھ حاصل مطالعہ ہم نے پیش کیا ہے اگرچہ وہ یہود کی شرارتوں اور ذہنی خبث کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔ نیز ان تمام تر حیلوں، بہانوں، اعتراضات اور دینِ موسوی علیہ السلام سے یہود ونصاریٰ کے اعراض سے امت مسلمہ کو آگاہ کرنے کے لیے بھی کافی ہے تاہم کیا یہ ایک المیہ نہیں کہ قرآن کریم میں اس تمام تر راہ نمائی کے باوجود موجودہ امت مسلمہ ان تمام افعال اور اشغال میں اسی طرح مصروف عمل ہے جن سے اہلِ یہود کو روکا گیا تھا اور یہی حکم امت مسلمہ کو بھی دیا گیا تھا کہ وہ اس قسم کی حرکتوں سے باز رہیں۔ کیا یہ ایک امر واقعہ نہیں کہ خلافت راشدہ کے بعد امت نے مختلف ادوار میں وہ تمام افعال واعمال سرانجام دیئے ہیں جن کی بناء پر یہود کی معزولی ہوئی تھی؟

☆......قرآن وحدیث کی تعلیمات سے اغماض میں ہم کس قدر اہل یہود سے پیچھے رہے ہیں؟۔ اپنی من مانی تاویلات اور تشریحات نیز غیر ضروری فقہی موشگافیوں پر عمل کرنے اور زور دینے سے کس قدر دین کو بازیچۂ اطفال بنایا ہے؟

☆......قرآن وسنت کے سادہ اور عام مفہوم ومعنی کو اس قدر پیچیدہ بنا دیا اور اپنی تشریحات (نیز فقہی دلچسپی) کو اس قدر اہمیت دے دی کہ امت کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا؟

☆......ہمارے اس طرز عمل سے نوجوان نسل گمراہی، انکار خدا اور رسول (الحاد)

اورخوف آخرت سے بے نیاز نیز شرک ونفاق کے گہرے گڑھوں میں ڈوب کر رہ گئی ہے اوراس ذہنی انتشار کی وجہ سے الحادی قوتوں کی گود میں جا گری ہے؟

☆......کیا اس ملک کے دولت مند طبقے، سیاستدانوں، کرپٹ عناصر اور بیوروکریسی نیز عوام الناس کو گمراہ کرنے میں مذہبی عناصر ان کے آلہ کار نہیں بنے؟۔ کیا پیر وفقیر نے اپنے مریدین کو رشوت، بد دیانتی، اقرباء پروری اور مختلف اخلاقی جرائم سے کھل کر منبر و محراب کے ذریعے سے کبھی متفقہ طور پر منع کیا؟ اور کیا کبھی ان کے دیئے ہوئے نذرانوں، تحفوں اور دیگر دنیاوی مراعات سے انکار کیا کہ حرام کی کمائی ان کے لیے لینا ناجائز ہے؟—— کاش انہوں نے متفقہ طور پر حرام اشیاء کو منع کیا ہوتا تو آج ملت اسلامیہ اتنے گھمبیر مسائل کا شکار نہ ہوتی اور نہ اغیار کو انہیں دنیا کے صفحے سے مٹانے کی کوششیں کرنے کی ہمت ہوتی!۔

سورہ البقرہ کی آیات ۱۲۲ تا ۱۲۳ کی تشریح میں سید مودودیؒ نے بہت تفصیلی متعدد تشریحی نوٹ لکھے جس میں بنی اسرائیل کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ ہم ان تشریحی نکات کے چیدہ چیدہ حصوں کو ذیل میں درج کر رہے ہیں:

''حضرت نوح علیہ السلام کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے نبی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی عالمگیر دعوت پھیلانے کے لیے مقرر کیا تھا۔ انہوں نے پہلے خود عراق سے مصر تک اور شام وفلسطین سے ریگستان عرب کے مختلف گوشوں تک برسوں گشت لگا کر اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری (اسلام) کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ پھر اس مشن کی اشاعت کے لیے مختلف علاقوں میں خلیفہ مقرر کئے۔ شرق اردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو شام اور فلسطین میں اپنے بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام کو اور اندرون عرب میں اپنے بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو مامور کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے مکے میں وہ گھر تعمیر کیا، جس کا نام کعبہ ہے اور اللہ ہی کے حکم سے وہ اس مشن کا مرکز قرار پایا۔'' (حاشیہ نمبر ۱۲۳)

☆ ......''حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے دو بڑی شاخیں نکلیں: ایک حضرت اسمٰعیل کی اولاد جو عرب میں رہی۔ قریش اور عرب کے بعض دوسرے قبائل کا تعلق اسی شاخ سے تھا۔ دوسرے حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد جن میں حضرات یعقوب علیہ السلام، یوسف علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، داؤد علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام، یحییٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام اور بہت سے دیگر انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے۔ چونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام اسرائیل تھا، اس لیے یہ نسل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان کی تبلیغ سے جن دوسری قوموں نے ان کا دین قبول کیا، انہوں نے یا تو اپنی انفرادیت ہی ان کے اندر گم کردی، یا وہ نسلاً تو ان سے الگ رہے مگر مذہباً ان کے متبع رہے۔ اسی شاخ میں جب پستی و تنزلی کا دور آیا تو پہلے یہودیت پیدا ہوئی اور پھر عیسائیت نے جنم لیا۔''

☆ ......''حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اصل کام دنیا کو اللہ کی اطاعت کی طرف بلانا اور اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے مطابق انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا نظام درست کرنا تھا'' یہی خدمت تھی، جس کے لیے وہ دنیا کے امام و پیشوا بنائے گئے۔ ان کے بعد یہ امامت کا منصب ان کی نسل اس شاخ کو ملا جو حضرت اسحٰق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے چلی اور بنی اسرائیل کہلائی......اسی میں انبیاء پیدا ہوتے رہے اور انہی کے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ اس راہ راست کی طرف اقوام عالم کی راہ نمائی کرے......اس شاخ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں بیت المقدس کو اپنا مرکز قرار دیا جو بنی اسرائیل کے منصب امامت پر قائم رہنے تک (دعوت الی اللہ) کا مرکز اور خدا پرستوں کا قبلہ رہا۔''

☆ ......''سورہ البقرہ میں ان کی اس فردِ قراردادِ جرم کو بلا کم و کاست بیان کیا گیا ہے جو نزول قرآن کے وقت ان کی تھی اور انہیں بتا دیا گیا کہ انہوں نے منصب امامت کا حق ادا کرنا چھوڑ دیا ہے۔''

☆ ......''اس کے بعد انہیں بتایا گیا کہ امامت نطفۂ ابراہیم علیہ السلام کی میراث نہیں

بلکہ یہ اس سچی اطاعت و فرمانبرداری کا پھل ہے جس کا اظہار ہمارے اس بندے نے متعدد مواقع اور آزمائشوں میں کامیابی کے ساتھ دیا اور اب اس کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو ابراہیم علیہ السلام کے طریقے پر چلیں۔ لہٰذا تمہیں امامت کے منصب سے معزول کیا جاتا ہے۔

☆......اسی ضمن میں اس امر کی وضاحت بھی کر دی گئی کہ جو غیر اسرائیل قومیں موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے واسطے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ اپنا تعلق جوڑتی ہیں، چونکہ وہ بھی ابراہیمی طریقے سے ہٹی ہوئی ہیں لہٰذا ان میں سے بھی کوئی امامت کا مستحق نہیں۔

☆......پھر بتایا گیا کہ اب ابراہیم علیہ السلام کی دوسری شاخ بنی اسمٰعیل میں وہ رسول پیدا کیا ہے جس کے لیے ہر دو انبیاء نے دعا کی تھی۔ اس کا وہی طریقہ ہے جو انبیائے سابقہ کا تھا۔ وہ بھی اسی راستے کی طرف بلاتے ہیں جس کی طرف سارے انبیاء دعوت دیتے چلے آئے ہیں۔ لہٰذا اب امامت کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو اس رسول کی پیروی کریں۔''

☆......تبدیلی امامت کے اعلان کے ساتھ ہی قدرتی طور پر تحویلِ قبلہ کا اعلان بھی ضروری تھا...... جب تک بنی اسرائیل کی امامت کا دور تھا، بیت المقدس مرکز دعوت (اسلام) رہا۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیرو بھی اس وقت تک بیت المقدس کو ہی قبلہ بنائے رہے مگر امامت سے معزولی بنی اسرائیل کے بعد بیت المقدس کی کی مرکزیت آپ سے آپ ختم ہوگئی۔ لہٰذا اعلان کر دیا گیا کہ اب وہ مقام دین الٰہی کا مرکز ہے جہاں سے اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا ظہور ہوا۔ اور چونکہ ابتدا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا مرکز بھی یہی مقام تھا، اس لیے اہل کتاب اور مشرکین کسی کے لیے بھی یہ تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ قبلہ ہونے کا زیادہ حق کعبے ہی کو پہنچتا ہے۔ ہٹ دھرمی کی بات دوسری ہے کہ وہ حق کو حق جانتے ہوئے بھی اعتراض کیے چلے جائیں۔ (حاشیہ ۱۲۳)

البقرہ کی آیت نمبر ۱۳۵ میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اس ادعا کہ یہودی رعیسائی

ہی ہدایت یافتہ ہیں کا ذکر کیا:

وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ (البقرہ)

''یہودی کہتے ہیں: یہود ہوتو راہ راست پاؤ گے۔عیسائی کہتے ہیں: عیسائی ہوتو ہدایت ملے گی۔ ان سے کہو: ''نہیں بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا''

اس ضمن میں سید مودودیؒ نے یوں تشریح فرمائی کہ'' یہودیت اور عیسائیت دونوں بعد کی پیداوار ہیں۔''یہودیت'' اپنے اس نام اور اپنی مذہبی خصوصیات اور رسوم وقواعد کے ساتھ تیسری چوتھی صدی قبل مسیح پیدا ہوئی۔ اور''عیسائیت'' جن مذہبی عقائد کے مجموعے کا نام ہے، وہ تو حضرت مسیح علیہ السلام کے بھی ایک مدت بعد وجود میں آئے ہیں۔اب یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ اگر آدمی کے برسر ہدایت ہونے کا مدار یہودیت یا عیسائیت اختیار کرنے ہی پر ہے تو حضرت ابراہیم اور دوسرے انبیاء جو ان مذہبوں کی پیدائش سے صدیوں پہلے پیدا ہوئے تھے، وہ آخر کس چیز سے ہدایت پاتے تھے؟ ...... ظاہر ہے کہ وہ ''یہودیت'' اور''عیسائیت'' نہ تھی۔ لہٰذا یہ دعویٰ کہ یہودی ر نصرانی ہی ہدایت یافتہ ہیں،غلط ہے بلکہ دراصل اس کا مدار اس عالمگیر صراطِ مستقیم کے اختیار کرنے پر ہے،جس سے ہر زمانے میں انسان ہدایت پاتے رہے ہیں۔

''دوسرے یہ کہ خود یہود ونصاریٰ کی مقدس کتابیں اس بات پر گواہ ہیں کہ حضرت ابراہیم ایک اللہ کے سوا کسی دوسرے کی پرستش،تقدیس، بندگی اور اطاعت کے قائل نہ تھے اور ان کا مشن ہی یہ تھا کہ خدائی صفات وخصوصیات میں اللہ کے ساتھ کسی شریک نہ ٹھہرایا جائے۔لہٰذا یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہودیت اور نصرانیت دونوں اس راہ راست سے منحرف ہوگئی ہیں جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام چلتے تھے کیونکہ ان دونوں میں شرک کی آمیزش ہوگئی ہے۔(حاشیہ نمبر ۱۳۵)

آیت ۱۳۹۔۱۴۰ میں اللہ رب العزت نے سوال کیا کہ

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَ هُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ۚ وَ لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَ نَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ۙ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾

''اے نبی! ان سے کہو: ''کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ وہی ہمارا رب بھی ہے اروتمہارا رب بھی'' ......''یا پھر کیا تمہارا کہنا یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام، اسمٰعیل علیہ السلام، اسحٰق علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام اور اولاد یعقوب علیہ السلام سب کے سب یہودی تھے یا نصرانی تھے؟'' کہو''تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ''؟ ''اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جس کے ذمے اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہواور وہ اسے چھپائے؟ تمہاری حرکات سے اللہ غافل تونہیں ہے۔''

سید مودودیؒ نے اس کی تشریح میں لکھا......

''یہ خطاب یہود ونصاریٰ کے ان جاہل عوام سے ہے جو واقعی اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ یہ جلیل القدر انبیاء سب کے سب یہودی یا عیسائی تھے!''

(حاشیہ ۱۴۰)

یہاں سید مودودیؒ نے یہ تبصرہ کیا'' کہ یہ خطاب ان کے علماء سے ہے، جوخود بھی اس حقیقت سے ناواقف نہ تھے کہ یہودیت اور عیسائیت، اپنی موجودہ خصوصیات کے ساتھ بہت بعد میں پیدا ہوئی ہیں مگراس کے باوجود وہ حق کو اپنے ہی فرقوں میں محدود سمجھتے تھے اورعوام کو اس غلط فہمی میں مبتلا رکھتے تھے کہ انبیاء کے مدتوں بعد جو عقیدے اور جو اجتہادی ضابطے اور قاعدے ان کے فقہاء، صوفیہ اور متکلمین نے وضع کیے، انہیں کی پیروی پر انسان کی فلاح اور نجات کا مدار ہے۔ان علماء سے جب پوچھا جاتا تھا کہ اگر یہی بات ہے

تو حضرت ابراہیم، اسحق اور یعقوب علیہم السلام وغیرہ آخر تمہارے ان فرقوں میں سے کس سے تعلق رکھتے تھے تو وہ اس کا جواب دینے سے گریز کرتے تھے کیونکہ ان کا علم انہیں یہ کہنے کی تو اجازت نہ دیتا تھا کہ ان بزرگوں کا تعلق ہمارے فرقے سے تھا۔ لیکن اگر وہ صاف الفاظ میں یہ جان لیتے کہ یہ انبیاء نہ یہودی تھے، نہ عیسائی تو پھر ان کی حجت ہی ختم ہو جاتی تھی۔'' (حاشیہ نمبر ۱۴۱) ◆

سورہ البقرہ کا مزید مطالعہ اب ہمیں ایک اور اہم تاہم آزمائش کی جانب توجہ دلاتا ہے جس میں بنی اسرائیل ہی نہیں بلکہ کفار و مشرکین مکہ/عرب کو آزمایا گیا اور یہ تحویل قبلہ کا حکم تھا جو آیت نمبر ۱۴۲ میں دیا گیا۔

السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ؕ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ یَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا ؕ

''نادان لوگ ضرور کہیں گے: انہیں کیا ہوا کہ پہلے یہ جس قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے، اس سے یکا یک پھر گئے؟ اے نبی ﷺ ان سے کہو ''مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے، سیدھی راہ دکھا دیتا ہے اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک ''امتِ وسط'' بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول ﷺ تم پر گواہ ہو۔''

درج بالا آیت کی تشریح میں سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے وضاحت کی کہ ''نبی ﷺ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں سولہ یا سترہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے

◆ درج بالا آیات کی روشنی میں کیا کسی کو اس سوال پر غور کرنے کی توفیق بھی ہو گی جس فرقہ پرستی کی دعوت آج کے اہل علم کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کا تعلق کس فرقے سے تھا؟

رہے۔ پھر کعبے کی طرف منہ کے کر کے نماز پڑھنے کا حکم آیا۔''

''یہ امتِ محمد ﷺ کی امامت کا اعلان ہے۔'' بیت المقدس سے کعبے کی طرف سمت قبلہ کا پھرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دنیا کی پیشوائی کے منصب سے معزول کیا اور امت محمد یہ ﷺ کو اس پر فائز کر دیا......''امت وسط'' کا لفظ اس قدر وسیع معنویت اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی دوسرے لفظ سے اس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔''

سید مودودیؒ نے اس ضمن میں مزید لکھا کہ ''تمہیں امت وسط'' اس لیے بنایا گیا ہے کہ ''تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو'' تو اس سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں جب پوری نوعِ انسانی کا اکٹھا حساب لیا جائے گا، اس وقت رسول ﷺ ہمارے ذمہ دار نمائندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دے گا کہ فکر صحیح اور عمل صالح اور نظامِ عدل کی جو تعلیم ہم نے اسے دی تھی، وہ اس نے تم کو بلا کم و کاست پوری کی پوری پہنچا دی اور عملاً اس کے مطابق کام کر کے دکھا دیا۔ **اس کے بعد رسول کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کی حقیقت سے اٹھنا ہوگا اور یہ شہادت دینی ہوگی کہ رسول ﷺ نے جو کچھ تمہیں پہنچایا تھا، وہ تم نے انہیں پہنچانے میں، اور جو کچھ رسول نے تمہیں دکھایا تھا وہ تم نے انہیں دکھانے میں اپنی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی۔''**

سید مودودی نے امامت اور پیشوائی کے منصب پر سرفراز کئے جانے کے بارے میں مزید لکھا کہ: ''اس میں جہاں فضیلت اور سرفرازی ہے وہیں ذمہ داری کا بہت بڑا بار بھی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح رسول ﷺ اس امت کے لیے خدا ترسی، راست روی، عدالت اور حق پرستی کی زندہ شہادت بنے، اسی طرح اس امت کو بھی تمام دنیا کے لیے زندہ شہادت بننا چاہیے، حتیٰ کہ اس کے قول اور عمل اور برتاؤ، ہر چیز کو دیکھ کر دنیا کو معلوم ہو کہ خدا ترسی اس کا نام ہے، راست روی یہ ہے، عدالت اس کو کہتے ہیں اور حق

پرستی ایسی ہوتی ہے۔ پھر اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ جس طرح خدا کی ہدایت ہم تک پہنچانے کے لیے رسول اللہ کی ذمہ داری بڑی سخت تھی حتیٰ کہ اگر وہ اس میں ذرا سی کوتاہی بھی کرتے تو خدا کے ہاں ماخوذ ہوتے، اس طرح دنیا کے عام انسانوں تک اس ہدایت کو پہنچانے کی نہایت سخت ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ اگر ہم خدا کی عدالت میں واقعی اس بات کی شہادت نہ دے سکے کہ ہم نے تیری ہدایت، جو تیرے رسول ﷺ کے ذریعے سے ہمیں پہنچی تھی، تیرے بندوں تک پہنچا دینے میں کوئی کوتاہی کی، تو ہم بہت بری طرح سے پکڑے جائیں گے اور یہی امامت کا فخر ہمیں وہاں لے ڈوبے گا۔ ہماری امامت کے دور میں ہماری واقعی کوتاہیوں کے سبب سے خیال اور عمل کی جتنی گمراہیاں دنیا میں پھیلی ہیں اور جتنے فساد اور فتنے خدا کی زمین میں برپا ہوئے ہیں، ان سب کے لیے ائمہ شر اور شیاطین جن و انس کے ساتھ ساتھ ہم بھی ماخوذ ہوں گے۔ ہم سے پوچھا جائے گا کہ جب دنیا میں معصیت، ظلم اور گمراہی کا یہ طوفان برپا تھا تو تم کہاں مر گئے تھے۔''
(حاشیہ نمبر ۱۴۴)

واضح رہے کہ یہ سوال جہاں امت کے ہر ہر فرد سے پوچھا جائے گا وہاں وہ تمام اصحاب علم وفضل جو مختلف مناصب راہ نمائی پر متمکن ہیں، ان سے تو بدرجہ اتم پوچھا جائے گا۔

حرم کے والیو ، تم تو مراقبوں میں رہو
بتانِ دیر یہاں چھا گئے تو کیا ہوگا؟
(نعیم صدیقی)

امت وسط کے اعلان کے فوراً بعد تحویل قبلہ کی آیات کے بارے میں امت مسلمہ کے اہل علم (اساتذہ، سیاست دان، حکمران، داعیان فرقہ بندی (لسانی، صوبائی، قبائلی وغیرہ) نیز اخبار نویس، میڈیا کے کار پردازان اور منبر و محراب سے تعلق رکھنے والے اہل علم کی توجہ کے لیے سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے جو کسی حد تک مختصر نوٹ لکھا ہے، اسے نقل کرنا ضروری ہے۔ کہ ''تحویل قبلہ سے'' یہ دیکھنا مقصود تھا کہ کون لوگ ہیں جو جاہلیت کے

تعصّبات اور خاک وخون کی غلامی میں مبتلا ہیں اور کون ہیں جو ان بندشوں سے آزاد ہو کر حقائق کا صحیح ادراک کرتے ہیں۔ ایک طرف اہل عرب اپنے وطنی و نسلی فخر میں مبتلا تھے اور عرب کے کعبے کو چھوڑ کر باہر کے بیت المقدس کو قبلہ بنانا ان کی اس قوم پرستی کے بت پر نا قابلِ برداشت ضرب تھا۔ دوسری طرف بنی اسرائیل اپنی نسل پرستی کے غرور میں پھنسے ہوئے تھے اور اپنے آبائی قبلے کے سوا کسی دوسرے قبلے کو برداشت کرنا ان کے لیے محال تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بت جن لوگوں کے دلوں میں بسے ہوئے ہوں، وہ اس راستے پر کیسے چل سکتے تھے، جس کی طرف اللہ کا رسول ﷺ انہیں بلا رہا تھا۔ اس لیے اللہ نے ان بت پرستوں کو سچے حق پرستوں سے الگ چھانٹ دینے کے لیے پہلے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کیا تا کہ جو لوگ عربیت کے بت کی پرستش کرتے ہیں، وہ الگ ہو جائیں۔ پھر اس قبلے کو چھوڑ کر کعبے کو قبلہ بنایا تا کہ جو اسرائیلیت کے پرستار ہیں، وہ بھی الگ ہو جائیں۔ اس طرح صرف وہ لوگ رسول ﷺ کے ساتھ رہ گئے جو کسی بت کے پرستاد تھے، محض خدا کے پرستار تھے۔'' (حاشیہ ۱۴۵)

بیت المقدس سے کعبۃ اللہ کی جانب رخ کرنے کی حکمت و ضرورت کے بارے میں مفتی محمد شفیع (۲۰۱۱) نے اپنی تفسیر میں بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جسکا پڑھنا بہت مفید ہے۔ تاہم اس تمام کے بارے میں مختصراً یہ کہنا ضروری ہے کہ تحویل قبلہ اور قیامت تک امت مسلمہ کا کعبۃ اللہ کو مرکز ہدایت قرار دینا دراصل ''اجتماعی نظام کا سب سے بڑا بنیادی اصول افرادِ کثیرہ کی وحدت اور یک جہتی ہے'' یہ وحدت جتنی زیادہ قوی سے قوی ہوگی، اتنا ہی اجتماعی نظام مستحکم اور مضبوط ہوگا'' ......مزید لکھا کہ ''نماز میں اجتماعی صورت اور وحدت پیدا کرنے کے لئے تمام دنیا کے انسانوں کا رخ کسی ایک ہی جہت و سمت کی طرف ہونا ایک بہترین اور آسان اور بے قیمت وحدت کا ذریعہ ہے۔''

یہاں ہم جس اہم ترین امر کی جانب اپنے مذہبی عوام اور بالخصوص اہل علم جو راہ نمائی کے منصب پر فائز ہیں، کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ امت مسلمہ اس وقت

اتنے گھمبیر اور نامساعد حالات میں گھری ہوئی ہے جس سے بظاہر نکلنا آسان نظر نہیں آ رہا۔ دنیا کے کسی خطے میں بھی امت حالتِ امن وسکون میں نہیں۔ ہر جانب عالمی الحادی قوتوں نے مسلمانوں کا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا جب یہود و ہنود اور نصاریٰ کی جانب سے قتل وغارت کا ایک وحشیانہ کھیل ہے جو کھیلا نہیں جا رہا۔ خونِ مسلم، فی الوقت پانی سے بھی زیادہ ارزاں ہو گیا ہے، ایسے عالم میں ضروری ہے کہ ان کی توجہ اس الحاد کا قلع قمع کرنے کی جانب مبذول ہو جس میں امت کی نوجوان نسل بہت بری طرح سے پھنس کر رہ گئی ہے۔ الحادی قوتیں، عالم اسلام پر مختلف جہتوں سے یلغار کر رہی ہیں۔ ان کی یلغار کا سب سے پہلا ہدف امت مسلم کے خاندانی نظام کو شکست و ریخت سے دوچار کرنا ہے جس کے لیے وہ گزشتہ دوصدیوں سے اپنے استعماری عزائم کے علی الرغم کامیاب نہیں ہو سکیں۔ تاہم حالیہ دور میں اب این جی او کے دامِ ہمرنگ زمین کے تحت جنسی انارکی کا ایک طوفان ہے جو ان کی کوششوں اور میڈیا کی یلغار کے ذریعے امتِ مسلمہ کے گھروں کے اندر داخل ہو چکا ہے جس کی قہرمانیوں کا اندازہ کرنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ ہر کہہ ومہ، روزانہ اخبارات، ٹی وی اور میڈیا کی وساطت سے نوجوان بچیوں کے ساتھ زیادتی، شادی / نکاح کے ادارے کی ناکامی بصورت طلاق، عائلی جھگڑوں، جہیز اور ہندوانہ رسم ورواج کی بناء پر لڑکیوں کا گھروں میں بیٹھے رہنا اور جنسی بے راہ روی اس سے متعلقہ متعدد مسائل از قسم ایڈز کے بڑھتے ہوئے حملے سے ہے!

اسی طرح تعلیمی نظام کے ذریعے نوجوان نسل کو دینی تعلیمات سے غافل اور بیگانہ کرنا، ایک ایسا ناسور بن گیا ہے جو ہمارے مسلمان اساتذہ، مغرب کے فتنوں سے آگاہ ہونے کے باوجود انہیں نوجوان نسل کے ذہنوں کو گمراہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ◆ درجن سے زائد تعلیمی نظاموں کی وجہ سے گزشتہ ۷۰ سالوں میں قوم کے نونہال ایک دوسرے سے بیگانہ بلکہ بہت حد تک ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے ہیں۔ مدارس اور

◆ دیکھئے کتابچہ محمد آفتاب خان وڈاکٹر اسماء آفتاب (۲۰۱۷)

دنیوی تعلیم کے سکولوں/کالجوں/یونیورسٹیوں میں جو تعلیم دی جا رہی ہے، اس پر علامہ اقبال کا نوحہ کس قدر موزوں ہے!

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک
نہ زندگی ، نہ محبت ، نہ معرفت ، نہ نگاہ!

اس تمام تر زبوں حالی کے علی الرغم گزشتہ نصف صدی میں بالخصوص کرپٹ عناصر نے سیاسی میدان پر جو قبضہ کئے رکھا، اس نے وطن عزیز کو کرپشن، قتل و غارت، چوری/ڈاکہ زنی اور بدامنی کے ایک ایسے طوفان سے دوچار کر دیا ہے کہ ہر شخص ایک دوسرے کا دشمن بن گیا ہے۔ اہل محلہ، ایک دوسرے سے بے نیاز اور اپنی اپنی زندگی میں اس قدر منہمک و مصروف ہیں کہ ایک ہمسائے کو دوسرے ہمسائے سے ملنے کا یارا نہیں۔

ایسے گھمبیر حالات کا اولین تقاضہ یہ ہے کہ محراب و منبر سے متعلقہ اصحاب علم نیز حکمران اور سیاست دان اپنی ذمہ داریوں کا احساس و ادراک کریں اور امت مسلمہ کو صرف اور صرف ایک سبق دیں کہ:

افرنگ زخود بے خبرت کرد وگرنہ
اے بندہ مومن تو بشیری تو نذیری!
(اقبالؒ)

اگرچہ فرنگی تعلیم و تہذیب کی چکا چوند روشنی نے امت مسلمہ کو دین کی اصل تعلیم سے بے بہرہ کر دیا ہے تاہم ایک مسلمان کی اس دنیا میں حقیقت ایک بشیر (خوشخبری دینے والے) اور نذیر (ڈرانے والے) کی ہے۔

اگرچہ ان سطور کے آغاز میں اپنی کم فہمی کی بناء پر جو سوالات ہمارے ذہن میں اٹھے تھے، ان کا بہت حد تک جواب درج بالا صفحات میں تفصیلاً مل گیا تاہم مزید غور و فکر اور اہل علم سے گفتگو کے نتیجے میں یہ امر واضح ہوا کہ امتوں کے بگاڑ کا سبب وہ مذہبی راہ نما ہوا کرتے ہیں جو امتدادِ زمانہ کے سبب دین کی صحیح تعلیمات کو مسخ کر دیتے ہیں اور وہ دین

جو اسلام کے نام سے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر لاکھوں انبیائے کرام کی معرفت مختلف زمانوں اور اقوام پر نازل کیا گیا تھا۔ (سورہ البقرہ: ۱۳۲، ۲۱۲، سورہ آل عمران ۳۳، ۶۳، ۸۲ المائدہ: ۴۴)۔ وہ ''نام نہاد اہل علم'' اسے یہودیت، عیسائیت میں تبدیل کردیتے ہیں۔ یہ عالمان دین صحیح الہامی ہدایات کو اپنی من مانی تاویلات سے ایک ایسا ملغوبہ بنا دیتے ہیں جس میں چند رسمی عبادات چرچ رمندر یا کسی عبادت گاہ میں جا کر بجا لانے ہی کو کافی سمجھتے ہیں اور اپنے مریدین اور مقتدی لوگوں کو اس امر کا یقین دلا دیتے ہیں کہ تمہارے لیے بس ان رسمی عبادات کو بجالانا ہی کافی ہے اور اگر اس میں کچھ کمی رہ گئی ہے تو وہ ہمارے حلقہ مریدین میں آنے اور سال بہ سال نذر و نیاز کی۔ خدمت بجا لانے کے نتیجے میں ہم قیامت کے روز تمہارے تمام گناہ معاف کرالیں گے!

تاریخ انسانیت کے مطالعے سے اس ضمن میں ہمیں ایسے کرداروں/ طبقات کا پتہ چلتا ہے جنہوں نے انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو نہ صرف گمراہ کیا بلکہ اس دنیا میں اپنی سیادت و سیاست، ہو میں ملک گیری، علمی تفوق اور زہد وتقویٰ، پیری/ مریدی کی بناء پر دنیاوی فوائد اور مال و دولت کا حصول کیا۔ ان تمام کرداروں نے تو اپنی دنیا بنانے کے لیے یہ تمام تر طریقے استعمال کیے تاہم عوام جو ہمیشہ سے ہی اپنی ذاتی کمزوریوں اور تمام تر الہامی ہدایات سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے ان تمام طبقوں کے دام میں گرفتار ہوتے رہے ہیں۔ ان کے لیے یہ تصور بہت دل خوش کن رہا ہے اور اب بھی ہے کہ کچھ رقم ادا کرنے یا ووٹ دینے کے بعد فلاں صاحب اقتدار کی وفاداری نے ہمیں جس طریق پر اس دنیا میں چین سے زندگی بسر کرنے کے مواقع بہم پہنچائے ہیں، وہ آخرت میں اس قدر ''جاہ وجلال'' کے مالک ہوں گے کہ ہم سے کوئی پوچھ گچھ نہ ہوگی۔ اسی طرح فلاں مذہبی راہ نما (پیر، فقیر، مولوی، پادری، ربی، مہنت، جوگی وغیرہ) کی خدمت بجا لانے (نذر، نیاز، چڑھاوا، چراغی، فتوح وغیرہ) کے ذریعے آخرت میں ان کی سفارش پر ہماری بخشش ہو جائے گی۔ تاہم جہاں تک دنیاوی زندگی کا تعلق ہے، اس میں ہم اپنی من مانی کرنے

میں آزاد ہیں۔ کسی غیر یا رشتے دار پر ہر قسم کا ظلم روا رکھا جا سکتا ہے۔ بے ایمانی، سفارش اور رشوت کے ذریعے اپنے حق میں مذہبی/عدالتی/سرکاری فیصلے کرائے جا سکتے ہیں۔ تجارت اور لین دین میں ہر قسم کی ہیرا پھیری جائز ہے، کم تولنا، دھوکہ دینا، ٹیکس نہ دینا، گراں فروشی کرنا اور اس قسم کے دیگر تمام افعالِ بد جائز سمجھے جاتے ہیں اور یوں زندگی کو آرام سے گزارا جا سکتا ہے۔ بقول:

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

انسانیت کی تاریخ میں ایک تسلسل کے ساتھ ہمیں یہ کھیل کھیلا جاتا دکھائی دیتا ہے۔ روم و یونان، مصر و ہندوستان نیز دیگر قدیم ترین تہذیبوں کی ایک طویل داستان ہے جہاں درج بالا مذہبی، سیاسی اور نام نہاد اہل علم و فضل اپنا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں جن کی پیروی بھی عوام الناس کی ایک کثیر تعداد کرتی رہی ہے۔ قرآن کریم اپنے الہامی انداز میں اس تمام کھیل کو ''خیر و شر'' کی اصطلاح سے یاد کرتا ہے۔ علامہ اقبال نے اسے یوں بیان کیا:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی!

بولہبی دراصل یہاں بطور علامت ان تمام لوگوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو الہامی ہدایت (مصطفویؐ) کے برعکس اس دنیا میں اپنی قیادت و سیادت کا سکہ چلاتے ہیں۔

تحویل قبلہ اور منصب امامت پر ماموریت کے بعد آیات ۱۴۹۔۱۵۰ میں اللہ نے اپنے رسول ﷺ کی وساطت سے امت کو یہ واضح ہدایت دی کہ ''تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو'' اور اسے اپنی نعمت قرار دیا____ اس ضمن میں سید مودودی نے جو تشریحی نوٹ لکھا وہ یوں ہے کہ '' نعمت سے مراد وہی امامت اور پیشوائی کی نعمت ہے جو بنی اسرائیل سے سلب کر کے اس امت کو دی گئی تھی۔ دنیا میں ایک امت کی راست روی کا یہ انتہائی ثمرہ ہے کہ وہ اللہ کے امر تشریعی سے اقوام عالم کی راہ نما و پیشوا بنائی جائے اور نوعِ

انسانی کو خدا پرستی اور نیکی کے راستے پر چلانے کی خدمت اس کے سپرد کی جائے۔ یہ منصب جس امت کو دیا گیا حقیقت میں اس پر اللہ کے فضل و انعام کی تکمیل ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ یہاں یہ فرما رہا ہے کہ تحویل قبلہ کا یہ حکم دراصل اس منصب پر تمہاری سرفرازی کا نشان ہے لہٰذا تمہیں اس لیے بھی ہمارے اس حکم کی پیروی کرنی چاہیے کہ ناشکری و نافرمانی کرنے سے کہیں یہ منصب تم سے چھین نہ لیا جائے۔ اس کی پیروی کرو گے تو یہ نعمت تم پر مکمل کر دی جائے گی۔ (حاشیہ:۱۵۱)''

اسی مضمون کو مزید بڑھاتے ہوئے، آیت نمبر ۱۵۹ میں اس جانب اشارہ کیا جا رہا ہے کہ علمائے یہود نے کتمانِ حق کی جو حرکت کی تھی، اس کے نتیجے میں منصب امامت اس سے چھین لیا گیا ہے۔ سید مودودی نے تحریر کیا کہ: ''علمائے یہود کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ انہوں نے کتاب اللہ کے علم کی اشاعت کرنے کی بجائے اس کو ربیوں اور پیشہ وروں کے ایک محدود طبقے میں مقید کر رکھا تھا۔ اور وہ عامۃ خلائق تو درکنار، خود یہودی عوام تک کو اس کی ہوا نہ لگنے دیتے تھے۔ پھر جب عام جہالت کی وجہ سے ان کے اندر گمراہیاں پھیلیں تو علماء نے نہ صرف یہ کہ اصلاح کی کوئی کوشش نہ کی بلکہ وہ عوام میں اپنی مقبولیت برقرار رکھنے کے لیے ہر اس ضلالت اور بدعت کو، جس کا رواج عام ہو جاتا، اپنے قول و علم سے یا اپنے سکوت سے انہیں سند جواز عطا کرنے لگے۔ اس سے بچنے کی تاکید مسلمانوں کو کی جارہی ہے۔ دنیا کی ہدایت کا کام جس امت کے سپرد کیا جائے اس کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ اس ہدایت کو زیادہ سے زیادہ پھیلائے نہ یہ کہ بخیل کے مال کی طرح اسے چھپا رکھے!'' (حاشیہ ۱۶۰)

یہودی اہل علم کے کتمان حق کے رویے پر مزید تنقید، اگلی آیاتِ قرآنی میں جاری رکھتے ہوئے، اس کے متعدد دیگر پہلوؤں پر روشن ڈالی گئی ہے کہ کس طرح وہ عوام الناس کو دھوکہ دیا کرتے تھے اور یوں اپنی سیادت و قیادت کا سکہ بھی جمائے رکھتے تھے۔ یہاں اگر کسی پر بادِ خاطر نہ ہو تو یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ امت مسلمہ کی ایک کثیر تعداد بھی

اسی طریق پر اپنے پیر،فقیر،مولوی، کے جال میں پھنسی ہوئی ہے جو:

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق!

آیات ۱۶۶ تا ۱۶۷ سورہ البقرہ میں اسی قسم کے رویے اور طرزعمل کی کس عمدہ طریق پروضاحت کی گئی ہے کہ ایک انصاف پسند انسان ہدایت ربانی کے فصاحت و بلاغت پرعش عش کر اٹھتا ہے!

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَ رَاَوُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ۝۱۶۶ وَ قَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا (بقرہ:۱۶۶۔۱۶۷)

''جب وہ سزا دے گا اس وقت کیفیت یہ ہوگی کہ وہی پیشوا اور راہ نما، جن کی دنیا میں پیروی کی گئی تھی، اپنے پیروؤں سے بے تعلقی ظاہر کریں گے مگر سزا پا کر رہیں گے اور ان کے سارے اسباب و وسائل کا سلسلہ کٹ جائے گا۔ اور وہ لوگ جو دنیا میں ان کی پیروی کرتے تھے، کہیں گے کہ کاش ہم کو پھر ایک موقع دیا جاتا تو جس طرح آج ہم سے یہ بیزاری ظاہر کر رہے ہیں، ہم ان سے بیزار ہو کر دکھا دیتے......''

(اس ضمن میں مزید مکالمہ جات باب نمبر ۲ میں ذکر کیے جا رہے ہیں)

سورہ البقرہ کی آیت ۲۱۱ میں بنی اسرائیل سے اُن نشانیوں اور نعمتوں کے حوالے سے سوال کیا گیا۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ (البقرہ:۲۱۱)

''بنی اسرائیل سے پوچھو کیسی کھلی کھلی نشانیاں ہم نے انہیں دکھائی ہیں''

اس ضمن میں حاشیہ نمبر ۲۲۹ میں سید مودودی نے لکھا کہ ''اس سوال کے لئے بنی اسرائیل کا انتخاب دو وجوہ سے کیا گیا ہے۔ ایک یہی کہ آثارِ قدیمہ کے بے زبان کھنڈروں

کی بہ نسبت ایک جیتی جاگتی قوم زیادہ سامانِ بصیرت ہے۔ دوسرے یہ کہ بنی اسرائیل وہ قوم ہے جس کو کتاب اور نبوت کی مشعل دے کر دنیا کی راہنمائی کے منصب پر مامور کیا گیا تھا اور پھر اس نے دنیا پرستی، نفاق اور علم وعمل کی ضلالتوں میں مبتلا ہو کر اس نعمت سے اپنے آپ کو محروم کرلیا۔ لہٰذا جو گروہ اس قوم کے بعد امامت کے منصب پر مامور ہوا ہے، اس کو سب سے بہتر سبق اگر کسی قوم کے انجام سے مل سکتا ہے تو وہ یہی قوم ہے۔''

☆......سورہ البقرہ کی آیات ۱۴۲ سے لے کر تا اختتامِ سورت تحویل قبلہ اور اس کے حوالے سے بنی اسرائیل کی معزولی بطور امت مسلمہ اور حضرت محمد ﷺ کی امت کی بطور امت وسط/ امت مسلمہ (تا قیامت) جیسے مہمات مسائل کا ذکر ہے۔ جو ہم اس کتاب کے ایک علیحدہ باب ''بنی اسرائیل کے جرائم'' کے ضمن میں زیر بحث لائے ہیں۔

☆...... اسی طرح سورہ البقرہ میں متعدد مسائل کے بارے میں امت مسلمہ کو ہدایت دی گئی ہیں۔

☆......آیات ۲۴۳ میں مسلمانوں کو جہادِ فی سبیل اللہ کا حکم دیتے ہوئے بنی اسرائیل کی تاریخ کے دو اہم واقعات سے عبرت دلائی گئی جب بنی اسرائیل بہت بڑی تعداد میں مصر سے نکلے تھے (واقعۂ خروج)۔ اس کے بارے میں بھی سورۂ المائدہ کے ضمن میں اس کی تفصیل درج کی گئی ہے۔

پھر اس ضمن میں جب یہود نے سموئیل نبی سے مطالبہ کیا کہ ان کے لیے ایک ''بادشاہ'' بنا دیا جائے کہ وہ بوڑھے ہونے کی بنا پر عدالت نہیں کر سکتے اور لڑائی بھی نہیں کر سکتے۔ اس پر حاشیہ نمبر ۲۶۸ میں سید مودودیؒ نے بائبل کے حوالے سے جو تحریر لکھی ہے، وہ از خود دیکھنے کے لائق ہے انہوں نے طالوت کو ان کا بادشاہ مقرر کر دیا اور ان کے دور میں حضرت داوَد علیہ السلام نے فلسطیوں کے پہلوان جالوت (جولیت) کو قتل کر دیا۔ اس پر طالوت نے حضرت داوَد کی شادی اپنی بیٹی سے کر دی اور اس طرح وہ بنی اسرائیل کے فرمان روا ہوئے'' (حاشیہ نمبر ۲۶۸ تا ۲۷۳ کا خلاصہ)

سورہ البقرہ کی آیات ۲۵۵ تا ۲۵۶ (جو عام طور پر آیت الکرسی کے نام سے موسوم ہیں) میں واضح کیا گیا کہ دین کے معاملے میں زور زبردستی نہیں ''طاغوت'' سے کفر کرنے اور اللہ پر ایمان لانے والوں کے لئے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لینے اور انہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکالنے اور طاغوت سے کفر کی راہ اختیار نہ کرنے والوں کے لیے روشنی سے تاریکیوں کی طرف لے جانے کا بیان ہے۔

لفظ ''طاغوت'' کی تشریح حاشیہ نمبر ۲۸۶ میں یوں کی گئی۔

''طاغوت'' لغت کے اعتبار سے ہر اس شخص کو کہا جائے گا جو اپنی جائز حد سے تجاوز کر گیا ہو۔ قرآن کی اصطلاح میں طاغوت سے مراد وہ بندہ ہے جو بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خود آقائی و خداوندی کا دم بھرے اور خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرائے۔◆ خدا کے مقابلے میں ایک بندے کی سرکشی کے تین مرتبے ہیں۔ پہلا مرتبہ یہ ہے کہ بندہ اصولاً اس کی فرماں برداری کو حق مانے مگر عملاً اس کے احکام کے خلاف ورزی کرے۔ اس کا نام فسق ہے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ اس کی فرماں برداری سے اصولاً منحرف ہو کر یا تو خود مختار بن جائے یا کسی اور کی بندگی کرنے لگے یہ کفر ہے۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ مالک سے باغی ہو کر اس کے ملک اور اس کی رعیت میں خود اپنا حکم چلانے لگے۔ اس آخری مرتبے پر جو بندہ پہنچ جائے اس کا نام طاغوت ہے اور کوئی شخص صحیح معنوں میں اللہ کا مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اس طاغوت کا منکر نہ ہو''

اس ضمن میں حاشیہ نمبر ۲۸۸ میں بھی تشریح کی گئی ہے ''طاغوت'' یہاں طواغیت کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی خدا سے منہ موڑ کر انسان ایک ہی طاغوت کے چنگل میں نہیں پھنستا بلکہ بہت سے طواغیت اس پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ ایک طاغوت شیطان

◆ پیر محمد کرم شاہ نے اپنی تفسیر (۱۹۹۵) میں اس آیت کی تشریح (حاشیہ نمبر ۳۴۴ میں یوں کی ہے ''یعنی وہ بھی طاغوت ہے جو احکام الٰہی کے خلاف اپنے وضع کردہ قوانین کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کرے''

ہے جو اس کے سامنے نت نئی جھوٹی ترغیبات کا سدابہار سبز باغ پیش کرتا ہے۔ دوسرا طاغوت آدمی کا اپنا نفس ہے، جو اسے جذبات وخواہشات کا غلام بنا کر زندگی کے ٹیڑھے سیدھے راستوں میں کھینچے کھینچے لیے پھرتا ہے۔ اور بے شمار طاغوت باہر کی دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بیوی اور بچے، اعزہ اور اقربا، برادری اور خاندان، دوست اور آشنا، سوسائٹی اور قوم، پیشوا اور راہ نما، حکومت اور حکام، یہ سب اس کے لیے طاغوت ہی طاغوت ہوتے ہیں، جن میں سے ہر ایک اس سے اپنی اغراض کی بندگی کراتا ہے اور بے شمار آقاؤں کا یہ غلام ساری عمر اسی چکر میں پھنسا رہتا ہے کہ کس آقا کو خوش کرے اور کس کی ناراضی سے بچے''...... شاید علامہ اقبال نے اس کیفیت کا اظہار اس شعر میں کیا ہے

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

''یہاں خاص طور پر گمراہ کرنے والے پیشواؤں اور لیڈروں اور ان کے نادان پیروؤں کے انجام کا اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ جس غلطی میں مبتلا ہو کر پچھلی امتیں بھٹک گئیں اس سے مسلمان ہوشیار رہیں اور راہبروں میں امتیاز کرنا سیکھیں اور غلط رہبری کرنے والوں کے پیچھے چلنے سے بچیں۔'' (سورہ البقرہ حاشیہ نمبر ۱۶۵)

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے یہ لکھا کہ ''عام لوگوں میں یہ جتنے توہمات پھیلے ہیں اور باطل رسموں اور بے جا پابندیوں کی جو نئی نئی شریعتیں بن گئی ہیں ان سب کی ذمہ داری ان علماء پر ہے جن کے پاس کتابِ الٰہی کا علم تھا مگر انہوں نے عامہ خلائق تک اس علم کو نہ پھیلایا۔ پھر جب لوگوں میں جہالت کی وجہ سے غلط طریقے رواج پانے لگے تو اس وقت بھی وہ ظالم منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ بلکہ ان میں سے بہتوں نے اپنا فائدہ اسی میں دیکھا کہ کتاب اللہ کے احکام پر پردہ ہی پڑا رہے۔'' (سورۃ البقرہ، حاشیہ ۱۷۳)

اس کی مزید تفصیل میں سید مودودی رقمطراز ہیں کہ ''یہ دراصل ان پیشواؤں کے جھوٹے دعوؤں کی تردید اور ان غلط فہمیوں کا رد ہے جو انہوں نے عام لوگوں میں اپنے

متعلق پھیلا رکھی ہیں۔ وہ ہر ممکن طریق سے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں، اور لوگ بھی ان کے متعلق ایسا ہی گمان رکھتے ہیں کہ ان کی ہستیاں بڑی ہی پاکیزہ اور مقدس ہیں اور جو ان کا دامن گرفتہ ہو جائے گا اس کی سفارش کر کے وہ اللہ کے ہاں اسے بخشوا لیں گے۔ جواب میں اللہ فرماتا ہے کہ ہم انہیں ہرگز منہ نہ لگائیں گے اور نہ انہیں پاکیزہ قرار دیں گے۔'' (حاشیہ نمبر ۱۷۴)

سورہ البقرہ آیت نمبر ۲۵۸ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں جو اہم معلومات دی گئی ہیں، ان کا خلاصہ سید مودودی کے حاشیہ نمبر ۲۹۱۔ ۲۹۰ ذیل میں درج ہے۔

''اس شخص سے مراد نمرود ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وطن (عراق) کا بادشاہ تھا۔ جس واقعہ کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے، اس کی طرف کوئی اشارہ بائبل میں نہیں ہے مگر تلمود میں یہ پورا واقعہ موجود ہے اور بڑی حد تک قرآن کے مطابق ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ نمرود کی سلطنت کے سب سے بڑے عہدے دار (CHIEF OFFICER OF THE STATE) کا منصب رکھتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب کھلم کھلا شرک کی مخالفت اور توحید کی تبلیغ شروع کی اور بت خانے میں گھس کر بتوں کو توڑ ڈالا، تو ان کے باپ نے خود ان کا مقدمہ بادشاہ کے دربار میں پیش کیا۔''

حاشیہ نمبر ۲۹۱ میں اسی آیت کی مزید تشریح یوں فرمائی کہ:

> ''اس جھگڑے میں جو بات مابہ النزاع تھی، وہ یہ تھی کہ ابراہیم علیہ السلام اپنا رب کس کو مانتے ہیں۔ اور یہ نزاع اس وجہ سے پیدا ہوئی تھی کہ اس جھگڑنے والے شخص یعنی نمرود کو خدا نے حکومت عطا کر رکھی تھی۔ ان دو فقروں میں جھگڑے کی نوعیت کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے حسب ذیل حقیقتوں پر نگاہ رہنی ضروری ہے۔''

۱۔ ''قدیم ترین زمانے سے آج تک تمام مشرک سوسائٹیوں کی یہ مشترک خصوصیت رہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو رب الارباب اور خدائے خدائیگان کی حقیقت سے تو

مانتے ہیں، مگر صرف اس کو رب اور تنہا اس کو خدا اور معبود نہیں مانتے۔''

۲۔ ''خدائی کو مشرکین نے ہمیشہ دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک فوق الفطری (Supernatural) خدائی جو سلسلہ اسباب پر حکمران ہے اور جس کی طرف انسان اپنی حاجات اور مشکلات میں دستگیری کے لیے رجوع کرتا ہے۔ اس خدائی میں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ارواح اور فرشتوں اور جنوں اور سیاروں اور دوسری بہت سی ہستیوں کو شریک ٹھہراتے ہیں، ان سے دعائیں مانگتے ہیں، ان کے سامنے مراسم پرستش بجالاتے ہیں اور ان کے آستانوں پر نذر و نیاز پیش کرتے ہیں۔ **دوسری تمدنی اور سیاسی معاملات کی خدائی (یعنی حاکمیت) جو قوانین حیات مقرر کرنے کی مجاز اور اطاعتِ امر کی مستحق ہو اور جسے دنیوی معاملات میں فرماں روائی کے مطلق اختیارات حاصل ہوں۔ اس قسم کی خدائی کو دنیا کے تمام مشرکین نے قریب قریب ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ سے سلب کر کے یا اس کے ساتھ شاہی خاندانوں اور مذہبی پروہتوں اور سوسائٹی کے اگلے پچھلے بڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اکثر شاہی خاندان اس دوسرے مضمون میں خدائی کے مدعی ہوئے ہیں اور اسے مستحکم کرنے کے لیے انہوں نے بالعموم پہلے معنی والے خداؤں کی اولاد ہونے کا دعویٰ کیا ہے، اور مذہبی طبقے اس معاملے میں ان کے ساتھ شریک سازش رہے ہیں۔''**

۳۔ نمرود کا دعوئے خداوندی بھی اس دوسری قسم کا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا منکر نہ تھا۔ اس کا دعویٰ یہ نہیں تھا کہ زمین و آسمان کا خالق اور کائنات کا مدبر وہ خود ہے۔ اس کا کہنا یہ نہیں تھا کہ اسباب عالم کے پورے سلسلے پر اُسی کی حکومت چل رہی ہے بلکہ **اسے دعویٰ اس امر کا تھا کہ اس ملک عراق کا اور اس کے باشندوں کا حاکم مطلق میں ہوں، میری زبان قانون ہے، میرے اوپر کوئی بالاتر اقتدار نہیں ہے جس کے سامنے میں جواب دہ ہوں اور عراق کا ہر وہ**

باشندہ، باغی و غدار ہے جو اس حیثیت سے مجھے اپنا رب نہ مانے یا میرے سوا کسی اور کو رب تسلیم کرے۔''

۴۔ ''ابراہیم علیہ السلام نے جب کہا کہ میں صرف ایک رب العالمین ہی کو خدا اور معبود اور رب مانتا ہوں، اور اس کے سوا سب کی خدائی اور ربوبیت کا قطعی منکر ہوں تو سوال صرف یہی پیدا نہیں ہوا کہ قولی مذہب اور مذہبی معبودوں کے بارے میں ان کا یہ نیا عقیدہ کہاں تک قابل برداشت ہے، بلکہ یہ سوال بھی اٹھ کھڑا ہوا کہ قومی ریاست اور اس کے مرکزی اقتدار پر اس عقیدے کی جو زد پڑتی ہے اسے کیونکر نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جرم بغاوت کے الزام میں نمرود کے سامنے پیش کئے گئے۔''

حاشیہ نمبر ۲۹۲ میں اسی آیت کے تسلسل میں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال سے کہ ''اچھا، اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا'' تو وہ منکر حق ششدر رہ گیا''...... اس جواب سے مزید ڈھٹائی سے کچھ کہنا مشکل ہو گیا۔ ''خود بھی جانتا تھا کہ آفتاب و ماہتاب اسی خدا کے زیر فرمان ہیں جس کو ابراہیم علیہ السلام نے رب مانا ہے''......ابراہیم علیہ السلام کے موقف کو ماننے کے لیے اس کے نفس کا طاغوت تیار نہ تھا......تلمود کا بیان ہے کہ اس کے بعد اس بادشاہ کے حکم سے وہ دس روز تک قید میں رہے اور بعد ازاں انہیں آگ میں جلانے کا فیصلہ ہو گیا (مفہوم آیات)

بنی اسرائیل کی تاریخ: چند اہم امور

بنی اسرائیل کی تاریخ کے تسلسل میں جب ہم سورہ بنی اسرائیل کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ سورہ بنی اسرائیل ان سورتوں میں سے ہے جو مکی زندگی کے آخری دور میں نازل ہوئیں۔ اگرچہ نام کی مناسبت سے اس میں موضوع بحث بنی اسرائیل نہیں تاہم سید مودودیؒ نے لکھا ہے کہ جو مختلف اعتراضات توحید و رسالت کی مخالفت میں کفار مکہ کی جانب سے اٹھائے جاتے تھے، ان کے تحت انہیں تنبیہ کی گئی کہ انہیں چاہیے کہ وہ بنی

اسرائیل اور دیگر قوموں کے انجام سے سبق لیں اور اس مہلت کو غنیمت جانیں جواب ختم ہونے کے قریب ہے۔ نیز ضمناً بنی اسرائیل کو بھی جو ہجرت کے بعد عنقریب زبانِ وحی کے مخاطب ہونے والے تھے، یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ پہلے جو سزائیں تمہیں مل چکی ہیں ان سے عبرت حاصل کرو۔ اگر یہ موقعہ جواب تمہیں محمد ﷺ کی بعثت سے مل رہا ہے، اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ یہ آخری موقعہ بھی اگر تم نے کھودیا اور پھر اپنی سابق روش کا اعادہ کیا تو دردناک انجام سے دوچار ہوگے۔ آیت نمبر ۲ سے لیکر ۷ تک بنی اسرائیل کی تاریخ سے واقعات ایک تسلسل کے ساتھ بیان کئے گئے اور انہیں یاددلایا گیا کہ:

(۱) ''تمہارے لیے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کو ذریعہ ہدایت بنایا تھا، اس تاکید کے ساتھ کہ میرے ساتھ کسی کو اپنا وکیل نہ بنانا۔''

(۲) انہیں یاددلایا گیا کہ ان کا تعلق طوفانِ نوح کے بعد بچ جانے والے لوگوں کی اولاد سے ہے اور نوح ایک شکرگزار بندہ تھا۔

(۳) پھر بنی اسرائیل کو اس بات پر بھی متنبہ کردیا تھا کہ تم دومرتبہ زمین میں فسادِ عظیم برپا کروگے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔ (مفہوم آیات ۲ تا ۳)

سید مودودیؒ نے حاشیہ نمبر ۶ تا ۹ (قریباً ۱۲ صفحات میں) بنی اسرائیل کی تاریخ کے ان دو عظیم فسادوں کا ذکر کیا اور تصریح کی: ''اس سے یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ اس پوری تقریر کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں۔ مخاطب تو کفار مکہ ہی ہیں مگر چونکہ ان کو تنبیہ کرنے کے لیے یہاں بنی اسرائیل کی تاریخ کے چند عبرتناک شواہد پیش کئے گئے ہیں اس لیے بطور ایک جملہ معترضہ کے یہ فقرہ بنی اسرائیل کو خطاب کرکے فرمادیا گیا تاکہ ان اصلاحی تقریروں کے لیے تمہید کا کام دے جن کی نوبت ایک ہی سال بعد مدینے میں آنے والی تھی۔'' (حاشیہ نمبر ۱۰) یادرہے کہ یہ وہ اصلاحی خطابات ہیں جو گزشتہ مدنی سورتوں (النساء، آل عمران ودیگر) میں آچکے ہیں۔ اس موقع پر ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ان تاریخی واقعات کو بھی سید مودودیؒ کے قلم سے ہی سمجھنے کی کوشش کریں کہ انہوں نے یہ ایک بہت ہی مربوط انداز میں تحریر کیے ہیں جن سے

عوام تو کجا بہت پڑھے لکھے (جدید اور دینی تعلیم) لوگ ناآشنا ہیں!

بائبل کے مجموعہ کتب مقدسہ میں یہ تنبیہات مختلف مقامات پر ملتی ہیں۔ پہلے فساد اور اس کے برے نتائج پر بنی اسرائیل کو زبور، یسعیاہ، یرمیاہ اور حزقی ایل میں متنبہ کیا گیا ہے، اور دوسرے فساد اور اس کی سخت سزا کی پیش گوئی حضرت مسیح علیہ السلام نے کی ہے جو متی اور لوقا کی انجیلوں میں موجود ہے۔ ذیل میں ہم ان کتابوں کی چند متعلقہ عبارتیں تفہیم القرآن سے نقل کرتے ہیں تاکہ قرآن کے اس بیان کی پوری تصدیق ہو جائے۔ تاہم مزید تفصیلات کے لئے تفہیم القرآن سے رجوع کیا جائے۔

☆...... پہلے فساد پر اولین تنبیہ حضرت داؤد نے کی تھی جس کے الفاظ یہ ہیں:

☆......"انہوں نے ان قوموں کو ہلاک نہ کیا جیسا خداوند نے ان کو حکم دیا تھا بلکہ ان قوموں کے ساتھ مل گئے اور ان کے سے کام سیکھ گئے اور ان کے بتوں کی پرستش کرنے لگے جو ان کے لیے پھندا بن گئے۔ بلکہ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو شیاطین کے لیے قربان کیا اور معصوموں کا، یعنی اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کا خون بہایا...... اس لیے خداوند کا قہر اپنے لوگوں پر بھڑکا اور اسے اپنی میراث سے نفرت ہوگئی اور اس نے ان کو قوموں کے قبضے میں کر دیا اور ان سے عداوت رکھنے والے ان پر حکمراں بن گئے۔"

(زبور، باب ۱۰۶، آیات ۳۴۔۴۱)

پھر جب یہ فساد عظیم رونما ہو گیا تو اس کے نتیجے میں آنے والی تباہی کی خبر حضرت یسعیاہ نبی اپنے صحیفے میں یوں دیتے ہیں:

"آہ، خطا کار گروہ، بدکرداری سے لدی ہوئی قوم، بدکرداروں کی نسل، مکار اولاد، جنہوں نے خداوند کو ترک کیا، اسرائیل کے قدوس کو حقیر جانا اور گمراہ و برگشتہ ہو گئے، تم کیوں زیادہ بغاوت کر کے اور مار کھاؤ گے؟"

(باب ۱۔ آیت ۴۔۵)

پھر جب سیلاب کے بند بالکل ٹوٹنے کو تھے تو یرمیاہ نبی کی آواز بلند ہوئی اور انہوں نے کہا:

☆......'' خداوند یوں فرماتا ہے کہ تمہارے باپ دادا نے مجھ میں کون سی بے انصافی پائی جس کے سبب سے وہ مجھ سے دور ہو گئے اور بطلان کی پیروی کر کے باطل ہوئے؟ ــــــ میں تم کو باغوں والی زمین میں لایا کہ تم اس کے میوے اور اس کے اچھے پھل کھاؤ، مگر جب تم داخل ہوئے تو تم نے میری زمین کو ناپاک کر دیا، اور میری میراث کو مکروہ بنایا ــــــ مدت ہوئی کہ تو نے اپنے جوئے کو توڑ ڈالا اور اپنے بندھنوں کے ٹکڑے کر ڈالے اور کہا کہ میں تابع نہ رہوں گی۔ ہاں، ہر ایک اونچے پہاڑ پر اور ہر ایک ہرے درخت کے نیچے تو بدکاری کے لیے لیٹ گئی (یعنی ہر طاقت کے آگے جھکی اور ہر بت کو سجدہ کیا)......جس طرح چور پکڑا جانے پر رسوا ہوتا ہے اسی طرح اسرائیل کا گھرانا رسوا ہوا، وہ اور اس کے بادشاہ اور امراء اور کاہن اور (جھوٹے) نبی، جو لکڑی سے کہتے ہیں کہ تو میرا باپ ہے اور پتھر سے کہ تو نے مجھے جنم دیا، انہوں نے میری طرف منہ نہ کیا بلکہ پیٹھ کی، پر اپنی مصیبت کے وقت وہ کہیں گے کہ اُٹھ کر ہم کو بچا۔ لیکن تیرے وہ بت کہاں ہیں جن کو تو نے اپنے لیے بنایا؟ اگر وہ تیری مصیبت کے وقت تجھ کو بچا سکتے ہیں تو اٹھیں، کیونکہ اے یہوداہ! جتنے تیرے شہر ہیں اتنے ہی تیرے معبود ہیں۔''

(باب ۲۔ آیت ۵۔۲۸)

☆......'' یروشلم کے کوچوں میں گشت کرو اور دیکھو اور دریافت کرو اور اس کے چوکوں میں ڈھونڈو، اگر کوئی آدمی وہاں ملے جو انصاف کرنے والا اور سچائی کا طالب ہو تو میں اسے معاف کروں گا ــــــ میں تجھے کیسے معاف کروں، تیرے فرزندوں نے مجھ کو چھوڑا اور ان کی قسم کھائی جو خدا نہیں

ہیں۔ جب میں نے ان کو سیر کیا تو انہوں نے بدکاری کی اور پرے باندھ کر قحبہ خانوں میں اکٹھے ہوئے۔ وہ پیٹ بھرے گھوڑوں کے مانند ہوئے، ہر ایک صبح کے وقت اپنے پڑوسی کی بیوی پر ہنہنانے لگا۔ خدا فرماتا ہے کیا میں ان باتوں کے لیے سزا نہ دوں گا اور کیا میری روح ایسی قوم سے انتقام نہ لے گی؟'' (باب ۵۔ آیت ۱۔۹)

☆......پھر عین وقت پر حزقی ایل نبی اُٹھے اور انہوں نے یروشلم کو خطاب کر کے کہا:

''اے شہر، تو اپنے اندر خونریزی کرتا ہے تاکہ تیرا وقت آجائے اور تو اپنے لیے بت بناتا ہے تاکہ تجھے ناپاک کریں ـــــ تیرے اندر وہ ہیں جو بتوں کی قربانی سے کھاتے ہیں۔ تیرے اندر وہ ہیں جو فسق و فجور کرتے ہیں۔ تیرے اندر وہ بھی ہیں جنہوں نے اپنے باپ کی حرم شکنی کی۔ تجھ میں انہوں نے اس عورت سے جو ناپاکی کی حالت میں تھی مباشرت کی۔ کسی نے دوسرے کی بیوی سے بدکاری، کسی نے اپنی بہو سے بدذاتی کی، اور کسی نے اپنی بہن، اپنے باپ کی بیٹی کو تیرے اندر رسوا کیا۔ تیرے اندر انہوں نے خونریزی کے لیے رشوت خواری کی۔ تو نے بیاج اور سود کیا اور ظلم کر کے اپنے پڑوسی کو لوٹا اور مجھے فراموش کیا ـــــ کیا تیرے ہاتھوں میں زور ہوگا جب میں تیرا معاملہ فیصل کروں گا؟ ـــــ ہاں میں تجھ کو قوموں میں تتر بتر کروں گا اور تیری گندگی تجھ میں سے نابود کر دوں گا اور تو قوموں کے سامنے اپنے آپ میں ناپاک ٹھہرے گا اور معلوم کرے گا کہ میں خداوند ہوں۔'' (باب ۲۲۔ آیت ۳۔۱۶)◆

◆ درج بالا گناہوں کی فہرست کو دیکھ کر اپنی قوم کی حالت پر ایمانداری سے جائزہ لیں کہ ان میں سے کونسی برائی ہے جو آج امت میں نہیں پائی جاتی!......مزید برآں یہ کہ کیا یہ وہ تمام اعمال نہیں جن پر آج یورپ/ امریکہ میں عیسائی/ یہودی عمل پیرا ہیں...... گویا یہ ایک قسم کی پیشن گوئیاں تھیں جو عیسائیوں کی الہامی کتب میں درج ہیں اور جنہیں وہ لوگ آج بھی پڑھتے ہیں لیکن کوئی سبق حاصل نہیں کرتے!

یہ تھیں وہ تنبیہات جو بنی اسرائیل کو پہلے فسادِ عظیم کے موقعہ پر کی گئیں۔ پھر دوسرے فسادِ عظیم اور اس کے ہولناک نتائج پر حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کو خبردار کیا۔ متی باب ۲۳ میں آنجناب کا ایک مفصل خطبہ درج ہے۔◆

اس جگہ وہ تمام حالات ختم ہوتے ہیں جو تاریخی اعتبار سے قرآن کریم کی سورت بنی اسرائیل سے لیے گئے ہیں اب ہم قرآنی سورتوں کا مطالعہ ایک ترتیب کے ساتھ کریں گے کہ ان میں جہاں اور جس جگہ بنی اسرائیل کا ذکر ہے اسے مختلف ابواب کے تحت مطالعہ کریں گے...... گویا اب ہمارا مطالعاتی سفر قرآنی ترتیب سورت کے مطابق ہوگا!

سورہ آل عمران

قرآن کریم کی پہلی پانچ طویل سورتیں (البقرہ تا المائدہ) مدینہ میں نازل ہوئیں۔ ان تمام سورتوں میں من جملہ دیگر امور، زیادہ تر گفتگو بنی اسرائیل اور نصاریٰ کی ان کمزوریوں کے بارے میں کی گئی جس کی وجہ سے بنی اسرائیل کو ''امتِ وسط'' کے منصب سے دستبردار کیا گیا۔ سورہ البقرہ کے کسی حد تک تفصیلی مطالعے کے بعد اب سورہ آل عمران ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی جس کا مطالعہ اب ہم کریں گے! یہ سورت چار تقریروں پر مشتمل ہے۔ ''ان مختلف تقریروں کو ملا کر جو چیز ایک مسلسل مضمون بناتی ہے، وہ مقصد اور مرکزی مضمون کی یکسانیت ہے۔ سورت کا خطاب خصوصیت کے ساتھ دو گروہوں کی طرف ہے۔ ایک اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) اور دوسرے وہ لوگ جو محمد ﷺ پر ایمان لائے تھے۔''

◆ ان تمام تر تاریخی واقعات کی تفصیل بیان کرنا اس کتاب کے حیطۂ اختیار میں نہیں۔ ان تاریخی واقعات سے آگہی کے لئے ہمارا مشورہ ہے کہ سید مودودیؒ کی تفسیر سورہ البقرہ میں اور انہی کی دو کتب جو یہود و نصاریٰ کے موضوع پر نعیم صدیقی اور عبدالوکیل علوی نے مرتب کی ہیں، نیز یوسف ظفر کی کتاب سے مطالعہ کریں جو تاریخی واقعات کے لحاظ سے نہایت جامع انداز میں تمام امور کی وضاحت کرتی ہیں۔

''پہلے گروہ کو اسی طرز پر مزید تبلیغ کی گئی ہے جس کا سلسلہ سورہ البقرہ میں شروع کیا گیا تھا۔ ان کی اعتقادی گمراہیوں اور اخلاقی خرابیوں پر تنبیہ کرتے ہوئے انہیں بتایا گیا ہے کہ یہ رسول اور یہ قرآن اس دین کی طرف بلا رہا ہے جس کی دعوت شروع سے تمام انبیاء دیتے چلے آئے ہیں اور جو فطرت اللہ کے مطابق ایک ہی دین حق ہے۔'' (تعارف سورہ ص ۲۲۸)

''دوسرے گروہ کو جواب بہترین امت ہونے کی حیثیت سے حق کا علمبردار اور دنیا کی اصلاح کا ذمہ دار بنایا جا چکا ہے، اس سلسلے میں مزید ہدایات دی گئی ہیں جو سورہ البقرہ میں شروع ہوئی تھیں۔ انہیں پچھلی امتوں کے مذہبی و اخلاقی زوال کا عبرت ناک نقشہ دکھا کر متنبہ کیا گیا ہے کہ ان کے نقش قدم پر چلنے سے بچیں۔'' (تعارف سورہ)

اس سورت کی شان نزول کے بارے میں سید مودودیؒ یوں رقمطراز ہیں:

''کہ ہجرت کے بعد نبی ﷺ نے اطرافِ مدینہ کے یہودی قبائل کے ساتھ جو معاہدے کئے تھے، ان لوگوں نے ان معاہدات کا ذرہ برابر پاس نہ کیا۔ جنگ بدر کے موقع پر ان اہل کتاب کی ہمدردیاں توحید و نبوت اور کتاب و آخرت کے ماننے والے مسلمانوں کے بجائے بت پوجنے والے مشرکین کے ساتھ تھیں۔ بدر کے بعد یہ لوگ کھلم کھلا قریش اور دوسرے قبائل عرب کو مسلمانوں کے خلاف جوش دلا دلا کر بدلہ لینے پر اکسانے لگے۔ خصوصاً بنی نضیر کے سردار کعب بن اشرف نے تو اس سلسلے میں اپنی مخالفانہ کوششوں کو اندھی عداوت بلکہ کمینہ پن کی حد تک پہنچا دیا ـــــ آخر کار نبی ﷺ نے بدر کے چند مہینے بعد بنی قینقاع پر، جو ان یہودی قبیلوں میں سب سے زیادہ شریر لوگ تھے، حملہ کر دیا اور انہیں اطرافِ مدینہ سے نکال باہر کیا۔ لیکن اس سے دوسرے یہودی قبائل کی آتشِ عناد اور زیادہ بھڑک اٹھی۔ انہوں نے مدینے کے منافق مسلمانوں اور حجاز کے مشرک قبیلوں کے ساتھ ساز باز

کر کے اسلام اور مسلمانوں کے لیے ہر طرف خطرات ہی خطرات پیدا کر دیئے حتیٰ کہ خود نبی ﷺ کی جان کے متعلق ہر وقت یہ اندیشہ رہنے لگا کہ نہ معلوم کب آپ پر قاتلانہ حملہ ہو جائے۔'' (تعارف سورہ)

اس پس منظر میں اب ہم یہودیوں کی ان ریشہ دوانیوں اور حرکتوں کا جائزہ لیں گے جو اس سورت میں بیان ہوئی ہیں۔ تاہم اس سے قبل کہ ہم اس تفصیل میں جائیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت میں یہود کے ساتھ نصاریٰ (عیسائیوں) کا ذکر بھی آ رہا ہے، ہم ان کے بارے میں بھی چند معلومات درج کریں جس سے ان دونوں گروہوں کی خلافِ اسلام حرکات کا علم ہو سکے۔ تاہم یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام کے دور اولین سے لے کر آج تک (کہ یورپ اور امریکہ کی بیشتر آبادی عیسائی مذہب کی قائل ہے) نصاریٰ، یہودیوں کے ہاتھوں میں کھیلتے رہے ہیں جبکہ قرآن کریم اور نبی اکرم ﷺ کا رویہ ان کے بارے میں بہت حد تک مفاہمانہ رہا ہے۔ ذیل کے صفحات میں ہم نصاریٰ/عیسائیوں کے بارے میں چند اہم معلومات پیش کریں گے۔

عیسائیت اور چند کتب مقدسہ

سورہ آل عمران کی آیت ۲ میں نزول تورات اور انجیل کے ذکر کی تفصیل سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں دی:

''عام طور پر لوگ تورات سے مراد بائبل کے پرانے عہد نامے کی ابتدائی پانچ کتابیں اور انجیل سے مراد نئے عہد نامے کی چار مشہور انجیلیں لے لیتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ الجھن پیش آتی ہے کہ کیا فی الواقع یہ کتابیں کلامِ الٰہی ہیں؟ اور کیا واقعی قرآن ان سب باتوں کی تصدیق کرتا ہے جو ان میں درج ہیں؟ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ تورات بائبل کی پہلی پانچ کتابوں کا نام نہیں بلکہ وہ ان کے اندر مندرج ہے، اور انجیل نئے عہد نامہ کی اناجیل اربعہ کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ ان کے اندر پائی جاتی ہے۔'' (حاشیہ نمبر ۲)

اسی تسلسل میں مزید لکھا کہ دراصل تورات سے مراد وہ احکام ہیں، جو حضرت

موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے لے کر ان کی وفات تک تقریباً چالیس سال کے دوران ان پر نازل ہوئے۔ ان میں سے دس احکام تو وہ تھے، جو اللہ تعالیٰ نے پتھر کی لوحوں پر کندہ کر کے انہیں دیئے۔ باقی ماندہ احکام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لکھوا کر اس کی ۱۲ نقلیں بنی اسرائیل کے ۱۲ قبیلوں کو دے دی تھیں اور ایک نقل بنی لادی کے حوالے کی تھی تاکہ وہ اس کی حفاظت کریں۔ اسی کتاب کا نام ''تورات'' تھا۔ یہ ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے بیت المقدس کی پہلی تباہی کے وقت تک محفوظ تھی۔ اس کی ایک کاپی جو بنی لاوی کے حوالے کی گئی تھی، پتھر کی لوحوں سمیت، عہد کے صندوق میں رکھ دی گئی اور بنی اسرائیل اس کو ''توریت'' ہی کے نام سے جانتے تھے۔ لیکن اس سے ان کی غفلت اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ یہودیہ کے شاہ یونسیاہ کے عہد میں جب ہیکل سلیمانی کی مرمت ہوئی تو اتفاق سے سردار کاہن (یعنی ہیکل کے سجادہ نشین اور مذہبی پیشوا) خلقیاہ کو ایک جگہ توریت رکھی ہوئی مل گئی اور اس نے ایک عجوبے کی طرح اسے شاہی منشی کو دیا اور شاہی منشی نے اسے لے جا کر بادشاہ کے سامنے اس طرح پیش کیا، جیسے ایک عجیب انکشاف ہوا ہے۔ (ملاحظہ ہو ۲۔سلاطین، باب ۲۲۔آیت ۸ تا ۱۳)۔ یہی وجہ ہے کہ جب بخت نصر نے یروشلم فتح کیا اور ہیکل سمیت شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تو بنی اسرائیل نے تورات کے وہ اصل نسخے، جو ان کے ہاں طاق نسیاں پر رکھے ہوئے تھے اور بہت تھوڑی تعداد میں تھے، ہمیشہ کے لیے گم کر دیے۔ پھر جب عزرا کاہن (عزیر) کے زمانے میں بنی اسرائیل کے بچے کھچے لوگ بابل کی اسیری سے واپس یروشلم آئے اور دوبارہ بیت المقدس تعمیر ہوا، تو عزرا نے اپنی قوم کے چند دوسرے بزرگوں کی مدد سے بنی اسرائیل کی پوری تاریخ مرتب کی، جو اب بائبل کی پہلی ۱۷ کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس تاریخ کے چار باب، یعنی خروج احبار، گنتی اور استثنا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت پر مشتمل ہیں اور اس سیرت ہی میں تاریخ نزول کی ترتیب کے مطابق تورات کی وہ آیات بھی حسب موقع درج کر دی گئی ہیں، جو عزرا اور ان کے مددگار بزرگوں کو دستیاب ہوسکیں۔ پس دراصل اب تورات ان

منتشر اجزا کا نام ہے، جو سیرت موسیٰ علیہ السلام کے اندر بکھرے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں صرف اس علامت سے پہچان سکتے ہیں کہ اس تاریخی بیان کے دوران میں جہاں کہیں سیرت موسوی کا مصنف کہتا ہے کہ خدا نے موسیٰ سے یہ فرمایا، یا موسیٰ نے کہا کہ خداوند تمہارا خدا یہ کہتا ہے، وہاں سے تورات کا ایک جز شروع ہوتا ہے اور جہاں پھر سیرت کی تقریر شروع ہوجاتی ہے، وہاں وہ جز ختم ہوجاتا ہے۔ بیچ میں جہاں کہیں کوئی چیز بائبل کے مصنف نے تفسیر وتشریح کے طور پر بڑھا دی ہے، وہاں ایک عام آدمی کے لیے یہ تمیز کرنا سخت مشکل ہے کہ آیا یہ اصل تورات کا حصہ ہے، یا شرح وتفسیر۔ تاہم جو لوگ کتب آسمانی میں بصیرت رکھتے ہیں، وہ ایک حد تک صحت کے ساتھ یہ معلوم کرسکتے ہیں کہ ان اجزا میں کہاں کہاں تفسیری وتشریحی اضافے ملحق کردیے گئے ہیں۔''

''قرآن انھیں منتشر اجزا کو ''تورات'' کہتا ہے، اور انھیں کی وہ تصدیق کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان اجزا کو جمع کرکے جب قرآن سے ان کا مقابلہ کیا جاتا ہے، تو بجز اس کے کہ بعض بعض مقامات پر جزوی احکام میں اختلاف ہے، اصولی تعلیمات میں دونوں کتابوں کے درمیان یک سر مو فرق نہیں پایا جاتا۔ آج بھی ایک ناظر صریح طور پر محسوس کرسکتا ہے کہ یہ دونوں چشمے ایک ہی منبع سے نکلے ہوئے ہیں۔''

''اسی طرح انجیل دراصل نام ہے ان الہامی خطبات اور اقوال کا، جو مسیح علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری ڈھائی تین برس میں بحیثیت نبی ارشاد فرمائے۔ وہ کلماتِ طیبات آپ کی زندگی میں لکھے اور مرتب کیے گئے تھے یا نہیں، اس کے متعلق اب ہمارے پاس کوئی ذریعہ معلومات نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض لوگوں نے انھیں نوٹ کرلیا ہو، اور ممکن ہے کہ سننے والے معتقدین نے ان کو زبانی یاد کر رکھا ہو۔ بہرحال ایک مدت کے بعد جب آنجناب علیہ السلام کی سیرتِ پاک پر مختلف رسالے لکھے گئے تو ان میں تاریخی بیان کے ساتھ ساتھ وہ خطبات اور ارشادات بھی جگہ جگہ حسب موقع درج کردیے گئے، جو ان رسالوں کے مصنّفین تک زبانی روایات اور تحریری یادداشتوں کے ذریعے سے پہنچے تھے۔ **آج**

متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی جن کتابوں کو اناجیل کہا جاتا ہے، دراصل انجیل وہ نہیں ہیں، بلکہ انجیل حضرت مسیح کے وہ ارشادات ہیں، جو ان کے اندر درج ہیں۔ ہمارے پاس ان کو پہچاننے اور مصنّفین سیرت کے اپنے کلام سے ان کو ممیز کرنے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ جہاں سیرت کا مصنف کہتا ہے کہ مسیح نے یہ فرمایا یا لوگوں کو یہ تعلیم دی، صرف وہی مقامات اصل انجیل کے اجزا ہیں۔قرآن ان ہی اجزا کے مجموعے کو انجیل کہتا ہے اور انہیں کی وہ تصدیق کرتا ہے۔آج کوئی شخص ان بکھرے ہوئے اجزا کو مرتب کر کے قرآن سے ان کا مقابلہ کر کے دیکھے تو وہ دونوں میں بہت ہی کم فرق پائے گا اور جو تھوڑا بہت فرق محسوس ہوگا، وہ بھی غیر متعصّبانہ غور و تامل کے بعد با آسانی حل کیا جا سکے گا۔''(حاشیہ نمبر ۲)

سورہ آل عمران آیت ۳۳ تا ۷۰ میں نجران کے عیسائی وفد کی مدینہ میں نبی ﷺ کی ملاقات سے لے کر حضرت مریم کی والدہ کی دعا برائے اولاد کا تفصیلاً ذکر ہے نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور ان کو دیئے گئے معجزات کا بھی تفصیلاً ذکر ہے۔اس کے چیدہ چیدہ نکات درج ذیل ہیں: (حاشیہ نمبر ۲۹)

☆......۹ ہجری میں نجران کا عیسائی وفد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔(آیت ۳۳)

☆......عمران کی عورت نے اللہ تعالیٰ سے اپنے پیٹ کے بچے کے لیے نذر مانی کہ وہ تیرے ہی کام کے لیے وقف ہوگا۔(آیت ۳۵)

☆......بچی کی پیدائش پر اس کا نام مریم رکھا گیا اور زکریا کو اس کا سر پرست بنا دیا۔(آیت ۳۷)

☆......مریم کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان دیکھ کر زکریا نے ایک اولاد کی دعا کی اور فرشتوں نے اسے یحییٰ کی ولادت کی خوش خبری دی۔

آیت ۴۵ تا ۵۱ میں فرشتے نے مسیح عیسیٰ بن مریم کی اطلاع دی جو

الف) دنیا اور آخرت میں معزز ہوگا۔ اللہ کے مقرب بندوں میں شمار ہوگا۔لوگوں سے گہوارے میں بات کرے گا اور بڑی عمر کا ہوکر بھی، وہ ایک مردصالح ہوگا۔

ب) اللہ اسے کتاب اور حکمت کی تعلیم دے گا۔ تورات اور انجیل کا علم سکھائے گا اور بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول مقرر کرے گا۔

☆......بنی اسرائیل کے پاس بحیثیت رسول آنے پر اس نے کہا:

i) رب کی طرف سے میں تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔

ii) مٹی کے پرندے کو پھونک مارنے سے وہ اللہ کے حکم سے اصلی پرندہ بن جاتا ہے۔

iii) مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں۔

iv) مردے کو زندہ کرتا ہوں۔

v) میں تمہیں، تمہارے کھانے اور کمروں میں ذخیرہ شدہ اشیاء کی اطلاع دیتا ہوں۔

vi) میں اس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرتا ہوں جو تورات میں اس وقت میرے زمانے میں موجود ہے اور

vii) تم پر حرام کی گئی چیزوں کو تمہارے اوپر حلال کرتا ہوں۔

سید مودودیؒ نے آیات ۴۹ تا ۵۰ کی تشریح میں مزید لکھا کہ ''اس سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے بھی بنیادی نکات یہی تین تھے:

☆......ایک یہ کہ اقتدار اعلیٰ جس کے مقابلہ میں بندگی کا رویہ اختیار کیا جانا ہے اور جس کی اطاعت پر اخلاق وتمدن کا پورا نظام قائم ہوتا ہے، صرف اللہ کے لیے مختص تسلیم کیا جائے۔

☆......دوسرے یہ کہ اس مقتدر اعلیٰ کے نمائندے کی حیثیت سے نبی کے حکم کی اطاعت کی جائے۔

☆......تیسرے یہ کہ انسانی زندگی کو حلت وحرمت اور جواز وعدم جواز کی پابندیوں سے جکڑنے والا قانون وضابطہ صرف اللہ کا ہو، دوسروں کے عائد کردہ قوانین منسوخ کردیئے جائیں۔''

''پس درحقیقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ اور دوسرے انبیاء کے مشن میں یک سرمو کوئی فرق نہیں ہے جن لوگوں نے مختلف پیغمبروں کے مختلف مشن قرار دیئے ہیں اور ان کے درمیان مقصد ونوعیت کے اعتبار سے فرق کیا ہے، انہوں نے سخت غلطی کی ہے۔ مالک الملک کی طرف سے اس کی رعیت کی طرف جوشخص بھی مامور ہوکر آئے گا اس کے آنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ ہوسکتا ہی نہیں کہ وہ رعایا کو نافرمانی اور خودمختاری سے روکے اور شرک سے یعنی اس بات سے کہ وہ اقتدار اعلیٰ میں کسی حیثیت سے دوسروں کو مالک الملک کے ساتھ شریک ٹھہرائیں۔'' (خلاصہ حاشیہ ۴۸)

آیت نمبر ۵۲ میں یہ بتایا گیا کہ بنی اسرائیل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ انکار کا رویہ اختیار کرلیا ہے تو پھر حواریوں نے اللہ کا ساتھ دینے کا عہد کیا۔ پھر بنی اسرائیل مسیح کے خلاف خفیہ تدبیریں کرنے لگے اور بالآخر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''اے عیسیٰ! اب میں تجھے واپس بلالوں گا۔'' (آیت: ۵۵)۔اس کی تشریح میں سید مودودی نے لکھا:

''اصل میں لفظ "متوفیك" استعمال ہوا ہے۔ توفی کے اصل معنی لینے اور وصول کرنے کے ہیں۔ ''روح قبض کرنا'' اس لفظ کا مجازی استعمال ہے نہ کہ اصل لغوی معنی۔ یہاں یہ لفظ انگریزی لفظ (To recall) کے معنی میں مستعمل ہوا ہے، یعنی کسی عہدہ دار کو اس کے منصب سے واپس بلا لینا۔ چونکہ بنی اسرائیل صدیوں سے مسلسل نافرمانیاں کر رہے تھے، بار بار کی تنبیہوں اور فہمائشوں کے باوجود ان کی قومی روش بگڑتی ہی چلی جارہی تھی، پے در پے کئی انبیا کو قتل کرچکے تھے اور ہر اس بندۂ صالح کے خون کے پیاسے ہو

جاتے تھے جو نیکی اور راستی کی طرف انہیں دعوت دیتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت تمام کرنے اور انہیں ایک آخری موقع دینے کے لیے حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام جیسے دو جلیل القدر پیغمبروں کو بیک وقت مبعوث کیا جن کے ساتھ مامور من اللہ ہونے کی ایسی کھلی کھلی نشانیاں تھیں کہ ان سے انکار صرف وہی لوگ کر سکتے تھے جو حق و صداقت سے انتہا درجہ کا عناد رکھتے ہوں اور حق کے مقابلہ میں جن کی جسارت و بے باکی حد کو پہنچ چکی ہو۔ مگر بنی اسرائیل نے اس آخری موقع کو بھی ہاتھ سے کھو دیا اور صرف اتنا ہی نہ کیا کہ ان دونوں پیغمبروں کی دعوت رد کر دی، بلکہ ان کے ایک رئیس نے علی الاعلان حضرت یحییٰ جیسے بلند پایہ انسان کا سر ایک رقاصہ کی فرمائش پر قلم کرا دیا، اور ان کے علماء و فقہاء نے سازش کر کے حضرت عیسیٰ کو رومی سلطنت سے سزائے موت دلوانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کی فہمائش پر مزید وقت اور قوت صرف کرنا بالکل فضول تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو واپس بلا لیا اور قیامت تک کے لیے بنی اسرائیل پر ذلت کی زندگی کا فیصلہ لکھ دیا۔'' (حاشیہ ۵۱)۔اسی تسلسل میں سید مودودیؒ نے واضح کیا

''یہاں یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن کی پوری تقریر دراصل عیسائیوں کے عقیدۂ الوہیت مسیح کی تردید و اصلاح کے لیے ہے۔ اور عیسائیوں میں اس عقیدہ کے پیدا ہونے کے اہم ترین اسباب تین تھے:

(۱) حضرت مسیح کی اعجازی ولادت

(۲) ان کے صریح محسوس ہونے والے معجزات

(۳) ان کا آسمان کی طرف اُٹھایا جانا جس کا ذکر صاف الفاظ میں ان کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔''

''قرآن نے پہلی بات کی تصدیق کی اور فرمایا کہ مسیح کا بے باپ پیدا ہونا محض اللہ کی قدرت کا کرشمہ تھا۔ اللہ جس کو جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ یہ غیر معمولی طریق پیدائش ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ مسیح خدا تھا یا خدائی میں کچھ بھی حصہ رکھتا تھا۔''

''دوسری بات کی بھی قرآن نے تصدیق کی اور خود مسیح کے معجزات ایک ایک کر کے گنائے، مگر بتا دیا کہ یہ سارے کام اس نے اللہ کے اذن سے کیے تھے، باختیار خود کچھ بھی نہیں کیا، اس لیے ان میں سے بھی کوئی بات ایسی نہیں ہے جس سے تم یہ نتیجہ نکالنے میں کچھ بھی حق بجانب ہو کہ مسیح کا خدائی میں کوئی حصہ تھا۔''

''اب تیسری بات کے متعلق اگر عیسائیوں کی روایت سرے سے بالکل ہی غلط ہوتی تب تو ان کے عقیدۂ اُلوہیت مسیح کی تردید کے لیے ضروری تھا کہ صاف صاف کہہ دیا جاتا کہ جسے تم الٰہ اور ابن اللہ بنا رہے ہو وہ مر کر مٹی میں مل چکا ہے، مزید اطمینان چاہتے ہو تو فلاں مقام پر جا کر اس کی قبر دیکھ لو۔ لیکن ایسا کرنے کے بجائے قرآن صرف یہی نہیں کہ ان کی موت کی تصریح نہیں کرتا، اور صرف یہی نہیں کہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو زندہ اُٹھائے جانے کے مفہوم کا کم از کم احتمال تو رکھتے ہی ہیں، بلکہ عیسائیوں کو اُلٹا یہ اور بتا دیتا ہے کہ مسیح سرے سے صلیب پر چڑھائے ہی نہیں گئے، یعنی وہ جس نے آخری وقت میں "ایلی ایلی لما سبقتانی" کہا تھا اور وہ جس کی صلیب پر چڑھی ہوئی حالت کی تصویر تم لیے پھرتے ہو وہ مسیح نہ تھا، مسیح کو تو اس سے پہلے ہی خدا نے اُٹھا لیا تھا۔'' (حاشیہ ۵۱)

''اس کے بعد جو لوگ قرآن کی آیات سے مسیح کی وفات کا مفہوم نکالنے کی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل یہ ثابت کرتے ہیں کہ اللہ میاں کو صاف سلجھی ہوئی عبارت میں اپنا مطلب ظاہر کرنے تک سلیقہ نہیں ہے۔ اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْ ذَالِكَ"

''حاشیہ نمبر ۵۲ میں لکھا کہ انکار کرنے والوں سے مراد یہودی ہیں جن کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایمان لانے کی دعوت دی اور انہوں نے اسے رد کر دیا۔ بخلاف اس کے پیروی کرنے والوں سے مراد اگر صحیح پیروی کرنے والے ہوں تو وہ صرف مسلمان ہیں، اور اگر اس سے مراد فی الجملہ آنجناب کے ماننے والے ہوں تو ان میں عیسائی اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔''

اس کے بعد کی آیات میں کہا گیا کہ یہ اصل حقیقت ہے جو تمہارے رب کی طرف

سے بتائی جارہی ہے اس لیے تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو جو اس میں شک کرتے ہیں۔

آیت ۵۹ کی تشریح حاشیہ نمبر ۵۴ میں یوں کی گئی ''یہاں تک کی تقریر میں جو بنیادی نکات عیسائیوں کے سامنے پیش کئے گئے ان کا مقصد علی الترتیب حسب ذیل ہے۔''

☆......''پہلا امر جو ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہ ہے کہ مسیح کی اُلوہیت کا اعتقاد تمہارے اندر سے پیدا ہوا ہے، ان میں سے کوئی وجہ بھی ایسے اعتقاد کے لیے صحیح نہیں ہے۔ ایک انسان تھا جس کو اللہ نے اپنی مصلحتوں کے تحت مناسب سمجھا کہ غیر معمولی صورت سے پیدا کرے اور اسے ایسے معجزے عطا کرے جو نبوت کی صریح علامت ہوں اور منکرین حق کو اسے صلیب پر نہ چڑھانے دے بلکہ اس کو اپنے پاس اُٹھالے۔ مالک کو اختیار ہے، اپنے جس بندے کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ محض اس غیر معمولی برتاؤ کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا کیسے صحیح ہوسکتا ہے کہ وہ خود مالک تھا یا مالک کا بیٹا تھا، یا ملکیت میں اس کا شریک تھا۔''

☆......''دوسری اہم بات جو ان کو سمجھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مسیح جس چیز کی طرف دعوت دینے آئے تھے وہ وہی چیز ہے جس کی طرف محمد ﷺ دعوت دے رہے ہیں۔ دونوں کے مشن میں یک سرمو فرق نہیں ہے۔''

☆......''تیسرا بنیادی نکتہ اس تقریر کا یہ ہے کہ مسیح کے بعد ان کے حواریوں کا مذہب بھی یہی اسلام تھا جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ بعد کی عیسائیت نہ اس تعلیم پر قائم رہی جو مسیح علیہ السلام نے دی تھی اور نہ اس مذہب کی پیرو رہی جس کا اتباع مسیح کے حواری کرتے تھے۔''(حاشیہ نمبر ۵۴)

آیت ۶۴ میں اہل کتاب کو یکساں امور پر شرکت کی دعوت دیتے ہوئے سید مودودیؒ نے لکھا۔(ص ۵۵)

''فیصلہ کی یہ صورت پیش کرنے سے دراصل یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ وفد نجران جان بوجھ کر ہٹ دھرمی کر رہا ہے۔ اوپر کی تقریر میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان میں

سے کسی کا جواب بھی ان لوگوں کے پاس نہ تھا۔ مسیحیت کے مختلف عقائد میں سے کسی کے حق میں بھی وہ خود اپنی کتب مقدسہ کی ایسی سند نہ پاتے تھے جس کی بنا پر کامل یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے کہ ان کا عقیدہ امر واقعہ کے عین مطابق ہے اور حقیقت اس کے خلاف ہرگز نہیں ہے۔ پھر نبی ﷺ کی سیرت، آپ کی تعلیم اور آپ کے کارناموں کو دیکھ کر اکثر اہل وفد اپنے دلوں میں آپ کی نبوت کے قائل بھی ہو گئے تھے یا کم از کم اپنے انکار میں متزلزل ہو چکے تھے۔ اس لیے جب اُن سے کہا گیا کہ اچھا اگر تمہیں اپنے عقیدے کی صداقت کا پورا یقین ہے تو آؤ ہمارے مقابلہ میں دعا کرو کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو، تو ان میں سے کوئی اس مقابلے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اس طرح یہ بات تمام عرب کے سامنے کھل گئی کہ نجرانی مسیحیت کے پیشوا اور پادری، جس کے تقدس کا سکہ دور دور تک رواں ہے، دراصل ایسے عقائد کا اتباع کر رہے ہیں جن کی صداقت پر خود انہیں کامل یقین نہیں ہے۔''

☆......آیت نمبر ۶۴ میں یہود کو اس ایک کلمہ پر باہم اکٹھے ہونے کی دعوت دی گئی کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔

☆......اسی کے متصل یہ کہا گیا کہ تورات اور انجیل تو ابراہیم علیہ السلام کے بعد نازل ہوئی ہیں جبکہ تم ہم سے جھگڑا کرتے ہو...... ابراہیم نہ یہودی تھا نہ عیسائی بلکہ وہ تو ایک مسلم یک سو (حنیف) تھا اور ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا...... مزید فرمایا کہ ابراہیم سے نسبت رکھنے کے اصل حقدار تو اب یہ نبی ﷺ اور ان کے پیروکار ہیں۔ (مفہوم آیات ۶۶، ۶۷)

☆......اہل کتاب پر واضح کیا گیا کہ تم جانتے بوجھتے آنحضرت ﷺ کی نبوت کا انکار کر رہے ہو جبکہ تم اور تمہارے اہل علم جان چکے ہیں کہ یہ وہی نبی ہیں جن کے آنے کا وعدہ انبیائے سابقین نے کیا تھا۔

☆......آیت نمبر ۷۲ میں یہود کی اس بات پر گرفت کی گئی کہ ان کا ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے، صبح ایمان لاؤ اور شام کو انکار

کردو۔(مزید تفصیل باب ۲ میں)

☆......یہودیت کی تعلیم کہ اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کے درمیان جھگڑا ہونے پر اسرائیلی ہی کو جتانا چاہیے۔(تفصیل کے لیے دیکھئے باب بنی اسرائیل کے جرائم)

☆......کتاب کو پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا الٹ پھیر کرنا کہ کوئی شخص سمجھے کہ جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب (الٰہی) ہی کی عبارت ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا۔

☆......اسی سورت کی آیت نمبر ۹۲ میں اللہ تعالیٰ نے واضح انداز میں یہودی علماء کے نیکی کے خودساختہ تصور کی تردید کی تفصیل باب نمبر ۲ میں درج ہے۔

☆......اس ضمن میں آیات ۹۳ میں کھانے پینے کی چیزوں کی حلت وحرمت پر اعتراضات کے ساتھ تحویل قبلہ پر دوبارہ اعتراض کیا گیا جبکہ اس کا شافی جواب سورہ البقرہ میں دیا جاچکا ہے۔

اس ضمن میں جہاں مکہ میں کعبۃ اللہ کی بزرگی وعظمت کی مختلف وجوہات کا سید مودودیؒ نے ذکر کیا ہے وہاں یہ وضاحت بھی بہت اہم ہے کہ: خود بائبل ہی کی شہادت موجود ہے کہ بیت المقدس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساڑھے چار سو برس بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو تعمیر کیا(سلاطین، باب ۶ آیت ۱) اور انہی کے زمانے میں وہ قبلہ اہل توحید قرار دیا گیا۔ برعکس اس کے یہ تمام عرب کی متواتر اور متفق علیہ روایت سے ثابت ہے کہ کعبہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے آٹھ نو سو برس پہلے گزرے ہیں۔ لہٰذا کعبے کی اولیت ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی کلام کی گنجائش نہیں۔(حاشیہ نمبر ۷۹)

☆......سورہ آل عمران کی آیت ۱۸۱ میں: ''اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا قول سنا جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔'' نیز آیت ۱۸۳ میں انہوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم کرنے کے لیے ایسی قربانی کی شرط لگادی جسے (غیب سے آکر) آگ

کھالے۔اس پر سید مودودی نے لکھا کہ:''بائبل میں متعدد مقامات پر یہ ذکر آیا ہے کہ خدا کے ہاں کسی قربانی کے مقبول ہونے کی علامت یہ تھی کہ غیب سے ایک آگ نمودار ہو کر اسے بھسم کر دیتی تھی۔(قضاۃ ٦: ٢٠۔٢١، ١٣: ١٩۔٢٠)۔نیز یہ ذکر بھی بائبل میں آتا ہے۔کہ بعض مواقع پر کوئی نبی سوختنی قربانی کرتا تھا اور ایک غیبی آگ آکر اسے کھا لیتی تھی (احبار۔ ۹: ۲۴۔۲۔تواریخ: ۱۔۲) لیکن یہ کسی جگہ بھی نہیں لکھا کہ اس طرح کی قربانی نبوت کی کوئی ضروری علامت ہے، یا یہ کہ جس شخص کو یہ معجزہ نہ دیا گیا ہو وہ ہرگز نبی نہیں ہوسکتا۔ یہ محض ایک من گھڑت بہانہ تھا جو یہودیوں نے محمد ﷺ کی نبوت کا انکار کرنے کے لیے تصنیف کرلیا تھا۔لیکن اس سے بھی بڑھ کر ان کی حق دشمنی کا ثبوت یہ تھا کہ خود انبیاء بنی اسرائیل میں سے بعض نبی ایسے گزرے ہیں جنہوں نے آتشیں قربانی کا یہ معجزہ پیش کیا اور پھر بھی یہ جرائم پیشہ لوگ ان کے قتل سے باز نہ رہے۔مثال کے طور پر بائبل میں حضرت الیاس (ایلیاہ تشبی) کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے بعل کے پجاریوں کو چیلنج دیا کہ مجمع عام میں ایک بیل کی قربانی تم کرو اور ایک کی قربانی میں کرتا ہوں۔جس کی قربانی کو غیبی آگ کھالے وہی حق پر ہے۔ چنانچہ ایک خلق کثیر کے سامنے یہ مقابلہ ہوا اور غیبی آگ نے حضرت الیاس کی قربانی کھائی۔لیکن اس کا جو کچھ نتیجہ نکلا وہ یہ تھا کہ اسرائیل کے بادشاہ کی بعل پرست ملکہ حضرت الیاس کی دشمن ہوگئی، اور وہ زن پرست بادشاہ اپنی ملکہ کی خاطر ان کے قتل کے درپے ہوا اور ان کو مجبوراً ملک سے نکل کر جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی۔(ا۔سلاطین۔ باب ۱۸، ۱۹) اسی بناء پر ارشاد ہوا کہ حق کے دشمنو! تم کس منہ سے آتشیں قربانی کا معجزہ مانگتے ہو؟ جن پیغمبروں نے یہ معجزہ دکھایا تھا انہی کے قتل سے تم کب باز رہے۔(حاشیہ ۱۲۹)''

درج بالا آیات کے تسلسل میں آیت نمبر ۱۸۷ میں ''ان اہل کتاب کو وہ وعدہ بھی یاد دلایا گیا ہے جو اللہ نے ان سے لیا تھا کہ تمہیں کتاب کی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا ہوگا، انہیں پھر پوشیدہ رکھنا نہیں ہوگا۔مگر انہوں نے اسے پس پشت ڈال دیا.....'' اس پر سید

مودودی کا حاشیہ نمبر ۱۳۲ پڑھنے کے لائق ہے۔'' یعنی انہیں یہ تو یاد رہ گیا کہ بعض پیغمبروں کو آگ میں جلنے والی قربانی بطور نشانی دی گئی تھی، مگر یہ یاد نہ رہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب ان کے سپرد کرتے وقت ان سے کیا عہد لیا تھا اور کس خدمت عظمیٰ کی ذمہ داری ان پر ڈالی تھی۔'' ...... سید صاحب نے مزید وضاحت کی کہ'' یہاں جس عہد کا ذکر کیا گیا ہے اس کا ذکر جگہ جگہ بائبل میں آتا ہے۔ خصوصاً کتاب استثناء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جو آخری تقریر نقل کی گئی ہے اس میں تو وہ بار بار بنی اسرائیل سے عہد لیتے ہیں کہ'' جو احکام میں نے تم کو پہنچائے ہیں انہیں اپنے دل پر نقش کرنا، اپنی آئندہ نسلوں کو سکھانا، گھر بیٹھے اور راہ چلتے اور لیٹتے اور اُٹھتے، ہر وقت ان کا چرچا کرنا جیسے گھر کی چوکھٹوں پر اور اپنے پھاٹکوں پر ان کو لکھ دینا (۶: ۴۔ ۹) پھر اپنی آخری وصیت میں انہوں نے تاکید کی کہ فلسطین کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد پہلا کام یہ کرنا کہ کوہ عیبال پر بڑے بڑے پتھر نصب کر کے تورات کے احکام کندہ کر دینا (۲۷: ۲۔ ۴)۔ نیز بنی لاوی کو تورات کا ایک نسخہ دے کر ہدایت فرمائی کہ ہر ساتویں برس عید خیام کے موقع پر قوم کے مردوں، عورتوں، بچوں سب کو جگہ جگہ جمع کر کے یہ پوری کتاب لفظ بلفظ ان کو سناتے رہنا۔ لیکن اس پر بھی اللہ سے بنی اسرائیل کی غفلت رفتہ رفتہ یہاں تک بڑھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سات سو برس بعد ہیکل سلیمانی کے سجادہ نشین یروشلم کے یہودی فرماں روا تک کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان کے ہاں تورات نامی بھی کوئی کتاب موجود ہے۔ (۲۔ سلاطین۔ ۸۔ ۱۳)''(حاشیہ ۱۳۲)

سورہ النساء ۴

گزشتہ دو طویل ترین سورتوں (البقرہ اور آل عمران) کے بعد سورہ النساء چوتھی طویل سورت ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی۔ اس سورت میں من جملہ ان مضامین کے جو مسلم سوسائٹی کی تنظیم نو اور نشوونما کے لیے ضروری تھے، مشرکین عرب، یہودی قبائل اور

منافقین کے بارے ہدایات دی گئی ہیں۔ اہل کتاب کے اخلاقی و مذہبی رویہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اپنی ان پیش رو امتوں کے نقش قدم پر چلنے سے پرہیز کریں۔ یہودیوں میں سے بنی نضیر جو نہ صرف معاہدات کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے دشمنانِ اسلام کا ساتھ دے رہے تھے۔ ان کی اس روش پر سخت گرفت کی گئی اور انہیں صاف الفاظ میں آخری تنبیہ دے کر ان کے اخراجِ مدینہ کا عمل واقع ہوا۔ اس پس منظر میں اب ہم ان آیات کا مطالعہ کریں گے جن میں اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) پر گرفت کی گئی ہے۔

سورہ النساء کی آیت ۲۷ تا ۲۸ میں یہ فرمایا کہ: ''ہاں اللہ تو تم پر رحمت کے ساتھ توجہ کرنا چاہتا ہے مگر جو لوگ خود اپنی خواہشات نفس کی پیروی کر رہے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہِ راست سے ہٹ کر دور نکل جاؤ۔'' ان آیات کی تشریح میں سید مودودیؒ نے لکھا:

''یہ اشارہ ہے منافقین اور قدامت پرست جہلاء اور نواحی مدینہ کے یہودیوں کی طرف۔ منافقین اور قدامت پرستوں کو تو وہ اصلاحات سخت ناگوار تھیں جو تمدن و معاشرت میں صدیوں کے جملے اور رچے ہوئے تعصّبات اور رسم ورواج کے خلاف کی جا رہی تھیں۔ (۱) میراث میں لڑکیوں کا حصہ۔ (۲) بیوہ عورت کا سسرال کی بندشوں سے رہائی پانا (۳) اور عدت کے بعد اس کا ہر شخص سے نکاح کے لیے آزاد ہو جانا۔ (۴) سوتیلی ماں سے نکاح حرام ہونا۔ (۵) دو بہنوں کے ایک ساتھ نکاح میں جمع کیے جانے کو ناجائز قرار دینا۔ (۶) متبنیٰ کو وراثت سے محروم کرنا اور منہ بولے باپ کے لیے متبنیٰ کی بیوہ (۷) اور مطلقہ کا حلال ہونا۔ یہ اور اس طرح کی دوسری اصلاحات میں سے ایک ایک چیز ایسی تھی جس پر بڑے بوڑھے اور آبائی رسوم کے پرستار چیخ اُٹھتے تھے۔ مدتوں ان احکام پر چہ میگوئیاں ہوتی رہتی تھیں۔ شرارت پسند لوگ ان باتوں کو لے کر نبی ﷺ اور آپ کی دعوتِ اصلاح کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتے پھرتے تھے۔ مثلاً جو شخص کسی ایسے نکاح سے پیدا ہوا تھا جسے اب اسلامی شریعت حرام قرار دے رہی تھی، اس کو یہ کہہ کہہ کر اشتعال دلایا

جاتا تھا کہ لیجیے، آج جو نئے احکام وہاں آئے ہیں۔ ان کی رو سے آپ کی ماں اور آپ کے باپ کا تعلق ناجائز ٹھہرا دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ نادان لوگ اس اصلاح کے کام میں رکاوٹیں ڈال رہے تھے جو اس وقت احکام الٰہی کے تحت انجام دیا جا رہا تھا۔" (حاشیہ ۴۹)

اسی حاشیہ کے تسلسل میں دوسری طرف یہودی تھے جنہوں نے صدیوں کی موشگافیوں سے اصل خدائی شریعت پر اپنے خود ساختہ احکام وقوانین کا ایک بھاری خول چڑھا رکھا تھا۔ بے شمار پابندیاں اور باریکیاں اور سختیاں تھیں جو انہوں نے شریعت میں بڑھا لی تھیں۔ بکثرت حلال چیزیں ایسی تھیں جنہیں وہ حرام کر بیٹھے تھے۔ بہت سے اوہام تھے جن کو انہوں نے قوانینِ خداوندی میں داخل کر لیا تھا۔ اب یہ بات ان کے علماء اور عوام دونوں کی ذہنیت اور مذاق کے بالکل خلاف تھی کہ وہ سیدھی سادھی شریعت کی قدر پہچان سکتے جو قرآن پیش کر رہا تھا۔ وہ قرآن کے احکام کو سن کر بے تاب ہو جاتے تھے۔ ایک چیز پر سو سو اعتراضات کرتے تھے۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ **یا تو قرآن ان کے فقہاء کے تمام اجتہادات اور ان کے اسلاف کے سارے اوہام وخرافات کو شریعت الٰہی قرار دے، ورنہ یہ ہرگز کتابِ الٰہی نہیں ہے۔** مثال کے طور پر یہودیوں کے ہاں دستور تھا کہ ایامِ ماہواری میں عورت کو بالکل پلید سمجھا جاتا تھا۔ نہ اس کا پکایا ہوا کھانا کھاتے۔ نہ اس کے ہاتھ کا پانی پیتے، نہ اس کے ساتھ فرش پر بیٹھتے۔ بلکہ اس کے ہاتھ سے چھو جانے کو بھی مکروہ سمجھتے تھے۔ ان چند دنوں میں عورت خود اپنے گھر میں اچھوت بن کر رہ جاتی تھی۔ یہی رواج یہودیوں کے اثر سے مدینہ کے انصار میں بھی چل پڑا تھا۔ جب نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے تو آپ ﷺ سے اس کے متعلق سوال کیا گیا۔ جواب میں وہ آیت آئی جو سورۂ بقرہ رکوع ۲۸ کے آغاز میں درج ہے۔ نبی ﷺ نے اس آیت کی رو سے حکم دیا کہ ایامِ ماہواری میں صرف مباشرت ناجائز ہے۔ باقی تمام تعلقات عورتوں کے ساتھ اسی طرح رکھے جائیں جس طرح دوسرے دنوں میں ہوتے ہیں۔ اس پر یہودیوں میں شور مچ گیا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ شخص تو قسم کھا کر بیٹھا ہے کہ جو جو کچھ ہمارے

ہاں حرام ہے اسے حلال کر کے رہے گا اور جس جس چیز کو ہم ناپاک کہتے ہیں اسے پاک قرار دے گا۔''◆

آیات ۴۴ تا ۵۷ میں یہود کی متعدد اخلاقی کمزوریوں اور شرارتوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کا خلاصہ اوران پر سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ کا تبصرہ ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

☆......آیت ۴۴ میں علمائے اہل کتاب کے متعلق یہ الفاظ استعمال کیے ہیں کہ ''انہیں کتاب کے علم کا کچھ حصہ دیا گیا ہے'' اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو انہوں نے کتاب الٰہی کا ایک حصہ گم کر دیا تھا۔ پھر جو کچھ کتاب الٰہی میں سے ان کے پاس موجود تھا، اس کی روح اور اس کے مقصد و مدعا سے وہ بیگانہ ہو چکے تھے۔ ان کی تمام تر دلچسپیاں لفظی بحثوں اور احکام کے جزئیات اور عقائد کی فلسفیانہ پیچیدگیوں تک محدود تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دین کی حقیقت سے نا آشنا اور دینداری کے جوہر سے خالی تھے، اگرچہ علماء دین اور پیشوایان ملت کہے جاتے تھے۔'' (حاشیہ ۷۱)

آیت: ۴۶ تا ۴۸ میں قرآن نے بتایا کہ:

i) اہل کتاب یہودی بن گئے ہیں۔ (جبکہ اصل دین اسلام تھا)

ii) ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو الفاظ کو ان کے محل سے پھیر دیتے ہیں اور دین حق کے خلاف نیش زنی کرتے ہیں سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ اور رَاعِنَا حالانکہ اگر وہ کہتے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا اوراِسْمَعْ اور اُنْظُرْنا تو یہ انہی کے لیے بہتر تھا۔

iii) اہل کتاب کو کہا گیا کہ وہ اس کتاب (قرآن) کو مان لیں قبل اس کے کہ ان کے چہرے بگاڑ دیئے جائیں یا ان کو اس طرح لعنت زدہ کر دیں جس طرح سبت والوں کے ساتھ ہم نے کیا تھا۔

◆ کیا اسی قسم کا استدلال آج کل ایک دوسرے فقہی مسائل کے بارے میں نہیں کیا جاتا؟
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی!

iv) اللہ شرک ہی کو معاف نہیں کرتا، اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے، معاف کر دیتا ہے۔ (آیت ۴۸)

اہل کتاب کی ان درج بالا تمام حرکات اور شرارتوں سے انہیں روکا گیا تاہم اس میں ایک سبق امت مسلمہ کے لیے بھی ہے کہ ان کے عوام بالخصوص اہل علم اس قسم کی حرکتوں اور طریقوں سے باز رہیں۔ اس ضمن میں شرک سے گریز کے سلسلے میں سید مودودیؒ نے تشریح کی کہ شرک جس کو ان لوگوں نے بہت معمولی چیز سمجھ رکھا تھا، تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے۔ علمائے یہود شریعت کے چھوٹے چھوٹے احکام کا تو بڑا اہتمام کرتے تھے بلکہ ان کا سارا وقت ان جزئیات کی ناپ تول میں گزرتا تھا جو ان کے فقیہوں نے استنباط در استنباط کر کے نکالے تھے، مگر شرک ان کی نگاہ میں ایسا ہلکا فعل تھا کہ نہ خود اس سے بچنے کی فکر کرتے تھے، نہ اپنی قوم کو مشرکانہ خیالات اور اعمال سے بچانے کی کوشش کرتے تھے اور نہ مشرکین کی دوستی اور حمایت ہی میں انہیں کوئی مضائقہ نظر آتا تھا۔ (حاشیہ ۸)

ان کی شرک پسندی کی یہ انتہا تھی کہ آیت نمبر ۵۰ میں قرآن کریم نے بتایا کہ "اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔"......

اس ضمن میں سید مودودی نے جو تبصرہ کیا وہ پڑھنے کے لائق ہے۔ آپ نے واضح کیا:

> "علماء یہود کی ہٹ دھرمی یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ جو لوگ نبی ﷺ پر ایمان لائے تھے، ان کو وہ مشرکین عرب کی نسبت زیادہ گمراہ قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ان سے تو یہ مشرکین ہی زیادہ راہِ راست پر ہیں حالانکہ وہ صریح طور پر دیکھ رہے تھے کہ ایک طرف توحید خالص ہے جس میں شرک کا شائبہ تک نہیں، اور دوسری طرف صریح بت پرستی ہے جس کی مذمت سے ساری بائبل بھری پڑی ہے۔" (حاشیہ ۸۳)

اہل کتاب کے علماء نے امت مسلمہ کے بارے میں درج بالا جو اعتراضات کیے، ان سب کا شافی جواب ملنے کے باوجود وہ حسد اور بغض میں مبتلا ہو گئے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ

وہ اپنے طرزِ عمل اور حرکتوں پر نادم ہوتے لیکن انہوں نے حسد کی بناء پر مشرکین مکہ کو مسلمانوں پر ترجیح دینی شروع کر دی۔ اس پر قرآن کریم نے فرمایا کہ:

''انہیں معلوم ہو کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا کی اور ملکِ عظیم بخش دیا مگر ان میں سے کوئی اس پر ایمان لایا اور کوئی اس سے منہ موڑ گیا اور منہ موڑنے والوں کے لیے تو بس جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کافی ہے۔ (آیت: ۵۵:۵۴)''

سید مودودیؒ نے اس کی تشریح یوں کی کہ: ''تم لوگ آخر جلتے کس بات پر ہو؟ تم بھی ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہو اور یہ بنی اسمٰعیل بھی ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام سے دنیا کی امامت کا جو وعدہ ہم نے کیا تھا وہ آلِ ابراہیم میں سے صرف ان لوگوں کے لیے تھا جو ہماری بھیجی ہوئی کتاب اور حکمت کی پیروی کریں۔ یہ کتاب اور حکمت ہم نے تمہارے پاس بھیجی تھی مگر تمہاری اپنی نالائقی تھی کہ تم اس سے منہ موڑ گئے۔ اب وہی چیز ہم نے بنی اسمٰعیل کو دی ہے اور یہ ان کی خوش نصیبی ہے کہ وہ اس پر ایمان لے آئے ہیں۔''

سورۃ النساء کی درج بالا آیت ۵۸ میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا کہ ''امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔''......اس کی تشریح میں سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر کیا: ''یعنی تم ان برائیوں سے بچے رہنا جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے ہیں۔ بنی اسرائیل کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک یہ تھی کہ انہوں نے اپنے انحطاط کے زمانے میں امانتیں یعنی ذمہ داری کے منصب اور مذہبی پیشوائی اور قومی سرداری (سیاسی لیڈرشپ) کے مرتبے (POSITIONS OF TRUST) ایسے لوگوں کو دینے شروع کر دیے جو نااہل، کم ظرف، بداخلاق، بددیانت اور بدکار تھے۔ ◆ نتیجہ یہ

◆ آج امت مسلمہ کی سیاسی لیڈرشپ اور (اگر طبع نازک پر گراں نہ گذرے) تو مذہبی لیڈروں میں سے کتنے ایسے پاکباز ہیں جن کا دامن ان کبائر گناہوں سے صاف ہے؟

ہوا کہ برے لوگوں کی قیادت میں ساری قوم خراب ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں کو ہدایت کی جارہی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا بلکہ امانتیں ان لوگوں کے سپرد کرنا جو ان کے اہل ہوں، یعنی جن میں بارِ امانت اٹھانے کی صلاحیت ہو۔ بنی اسرائیل کی دوسری بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ انصاف کی روح سے خالی ہو گئے تھے۔ وہ شخصی اور قومی اغراض کے لیے بے تکلف ایمان نگل جاتے تھے۔ صریح ہٹ دھرمی برت جاتے تھے۔ انصاف کے گلے پر چھری پھیرنے میں انہیں ذرا تامل نہ ہوتا تھا۔ ان کی بے انصافی کا تلخ ترین تجربہ اس زمانے میں خود مسلمانوں کو ہو رہا تھا۔ ایک طرف ان کے سامنے محمد رسول اللہ ﷺ اور ان پر ایمان لانے والوں کی پاکیزہ زندگیاں تھیں۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو بتوں کو پوج رہے تھے، بیٹیوں کو زندہ گاڑتے تھے، سوتیلی ماؤں تک سے نکاح کر لیتے تھے اور کعبہ کے گرد مادرزاد ننگے ہو کر طواف کرتے تھے۔ یہ نام نہاد اہل کتاب ان میں سے دوسرے گروہ کو پہلے گروہ پر ترجیح دیتے تھے اور ان کو یہ کہتے ہوئے ذرا شرم نہ آتی تھی کہ پہلے گروہ کے مقابلے میں یہ دوسرا گروہ زیادہ صحیح راستہ پر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس بے انصافی پر تنبیہ کرنے کے بعد اب مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ تم کہیں ایسے بے انصاف نہ بن جانا۔ خواہ کسی سے دوستی ہو یا دشمنی، بہرحال بات جب کہو انصاف کی کہو اور فیصلہ جب کرو عدل کے ساتھ کرو۔

سورہ النساء کے اسی تسلسل میں آیات ۵۹ میں اللہ، رسول اور اپنے میں اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیتے ہوئے، اس پر جو فاضلانہ تبصرہ کیا گیا ہے، وہ تفہیم القرآن میں دیکھنے کی چیز ہے تاہم ان تبصرے کے آخر میں درج بالا ہدایت کا اعادہ کیا گیا ہے۔

''یہ نصیحت ٹھیک اس تقریر کے خاتمہ پر ارشاد ہوئی ہے جس میں یہودیوں کی اخلاقی و دینی حالت پر تبصرہ کیا جا رہا تھا۔ اس طرح ایک نہایت لطیف طریقہ سے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تمہاری پیش رو امت دین کے ان بنیادی اصولوں سے منحرف ہو کر جس پستی میں گر چکی ہے اس سے عبرت حاصل کرو۔ جب کوئی گروہ خدا کی

کتاب اور اس کے رسول کی ہدایت کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور ایسے سرداروں اور رہنماؤں کے پیچھے لگ جاتا ہے جو خدا اور رسول ﷺ کے مطیع فرمان نہ ہوں اور اپنے مذہبی پیشواؤں اور سیاسی حاکموں سے کتاب وسنت کی سند پوچھے بغیر ان کی اطاعت کرنے لگتا ہے تو وہ ان خرابیوں میں مبتلا ہونے سے کس طرح بچ نہیں سکتا جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہوئے۔'' (حاشیہ ۹۰)

آیت نمبر ۶۱ میں کہا گیا کہ'' آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی اور آؤ رسول کی طرف تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمہاری طرف آنے سے کتراتے ہیں۔'' اس کی تشریح حاشیہ نمبر ۹۲ میں یوں کی گئی۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منافقین کی عام روش تھی کہ جس مقدمہ میں انہیں توقع ہوتی تھی کہ فیصلہ ان کے حق میں ہوگا تو اس کو تو نبی ﷺ کے پاس لے آتے تھے مگر جس مقدمہ میں اندیشہ ہوتا تھا کہ فیصلہ ان کے خلاف ہوگا اس کو آپ کے پاس لانے سے انکار کر دیتے تھے۔یہی حال اب بھی بہت سے منافقوں کا ہے کہ اگر شریعت کا فیصلہ ان کے حق میں ہو تو سر آنکھوں پر ورنہ ہر اس قانون، ہر اس رسم و رواج اور ہر اس عدالت کے دامن میں پناہ لیں گے جس سے انہیں اپنے منشاء کے مطابق فیصلہ کرنے کی توقع ہو۔'' (حاشیہ ۹۲)

''اس ضمن میں قرآن کریم نے آیت ۶۴ میں واضح کیا کہ (انہیں بتاؤ کہ) ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ اذنِ خداوندی کی بناء پر اس کی اطاعت کی جائے۔اس کی تفصیل سید مودودی نے یوں کی:'' یعنی خدا کی طرف سے رسول اس لیے نہیں آتا کہ بس اس کی رسالت پر ایمان لے آؤ اور پھر اطاعت جس کی چاہو کرتے رہو۔ بلکہ رسول کے آنے کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ زندگی کا جو قانون وہ لے کر آیا ہے، تمام قوانین کو چھوڑ کر صرف اس کی پیروی کی جائے اور خدا کی طرف سے جو احکام وہ دیتا ہے، تمام احکام کو چھوڑ کر صرف انہی پر عمل کیا جائے،اگر کسی نے یہی نہ کیا تو پھر اس کا محض رسول کو رسول مان لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔'' (حاشیہ نمبر ۹۴)

اللہ کریم نے درج بالا آیت سے متصل ہی مزید یہ فرمایا کہ:

''نہیں، اے محمد ﷺ، تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ فیصلہ تم کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں، بلکہ سر بسر تسلیم کر لیتے۔'' (آیت ۶۵)

اس آیت کی تشریح میں سید مودودیؒ نے لکھا کہ '' کہ اس آیت کا حکم صرف حضور ﷺ کی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ قیامت تک کے لیے ہے۔ جو کچھ اللہ کی طرف سے نبی ﷺ لائے ہیں اور جس طریقہ پر اللہ کی ہدایت و راہ نمائی کے تحت آپ ﷺ نے عمل کیا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کن سند ہے اور اس سند کو ماننے یا نہ ماننے ہی پر آدمی کے مومن ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ ہے۔ حدیث میں اس بات کو نبی ﷺ نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے کہ **لا یومن احدکم حتیٰ یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ** تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس اس طریقہ کی تابع نہ ہو جائے جسے میں لے کر آیا ہوں۔(حاشیہ نمبر ۹۵)

سورۃ النساء کی آیات ۱۵۲ سے لے کر ۱۷۱ تک یہودیوں اور عیسائیوں کے مختلف دعوؤں اور حضور ﷺ کی دعوت کے مقابلے میں جن جن کٹ حجتیوں کا مظاہرہ کیا، ان پر گرفت کی گئی ہے۔ ذیل میں ہم ان کا ایک مختصر جائزہ لیں گے۔

☆......آیت ۱۵۳ میں یہود نے مطالبہ کیا کہ آسمان سے ان پر کوئی تحریر نازل کراؤ، خدا کو علانیہ دکھانے نیز بچھڑے کو معبود بنانے اور بعد ازاں کوہ طور کو ان پر اٹھا کر ان سے اپنے فرمان کی اطاعت کرانے کے عہد کا ذکر ہے۔ اس ضمن میں سید مودودی نے تشریح کی کہ:

☆......'' مدینہ کے یہودی، نبی ﷺ سے جو عجیب عجیب مطالبے کرتے تھے

ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ہم آپ کی رسالت اس وقت تک تسلیم نہ کریں گے جب تک کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک لکھی لکھائی کتاب آسمان سے نازل نہ ہو یا ہم میں سے ایک ایک شخص کے نام اوپر سے اس مضمون کی تحریر نہ آ جائے کہ یہ محمد ﷺ ہمارے رسول ہیں، ان پر ایمان لاؤ۔'' (حاشیہ نمبر ۱۸۱)

آیات ۱۵۴ تا ۱۵۵ میں یہودیوں کی حرکتوں (سبت کا قانون توڑنے، عہد شکنی کرنے اور آیات الٰہی کو جھٹلانے نیز پیغمبروں کے ناحق قتل وغیرہ) حتیٰ کہ یہ کہنے کہ ''ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں''، پر سید مودودی نے یوں تشریح کی: یہودیوں کے اس قول کی طرف سورہ بقرہ آیت نمبر ۸۸ میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ درحقیقت یہ لوگ تمام باطل پرست جہلاء کی طرح اس بات پر فخر کیا کرتے تھے کہ جو خیالات اور تعصّبات اور رسم و رواج ہم نے اپنے باپ دادا سے پائے ہیں ان پر ہمارا عقیدہ اتنا پختہ ہے کہ کسی طرح ہم ان سے نہیں ہٹائے جا سکتے۔ جب کبھی خدا کی طرف سے پیغمبروں نے آ کر ان کو سمجھانے کی کوشش کی، انہوں نے ان کو یہی جواب دیا کہ تم خواہ کوئی دلیل اور کوئی آیت لے آؤ ہم تمہاری کسی بات کا اثر نہ لیں گے، جو کچھ مانتے اور کرتے چلے آئے ہیں وہی مانتے رہیں گے اور وہی کیے چلے جائیں گے۔'' (سورہ البقرہ حاشیہ ۹۴)

سورہ النساء کی آیت ۱۵۶ سے ۱۵۸ میں یہودیوں کے مریم پر بہتان لگانے اور مسیح عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم کو قتل کرنے اور اس کی تردید میں جو تفصیلی نوٹ لکھے، وہ ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔ (حاشیہ نمبر ۱۹۰)

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا معاملہ یہودی قوم میں فی الواقع ذرہ برابر بھی مشتبہ نہ تھا بلکہ جس روز وہ پیدا ہوئے تھے اسی روز اللہ تعالیٰ نے پوری قوم کو اس بات پر گواہ بنا دیا تھا کہ یہ ایک غیر معمولی شخصیت کا بچہ ہے، معجزے کا نتیجہ ہے نہ کہ کسی اخلاقی جرم کا۔ جب بنی اسرائیل کے ایک شریف ترین اور مشہور و نامور مذہبی بن بیاہی لڑکی گود میں بچہ لیے ہوئے آئی، اور قوم کے بڑے اور چھوٹے سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اس

کے سامنے آ گئے تو اس لڑکی نے ان کے سوالات کا جواب دینے کے بجائے خاموشی کے ساتھ اس نوزائیدہ بچے کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ تمہیں جواب دے گا۔ مجمع نے حیرت سے کہا کہ اس بچہ سے ہم کیا پوچھیں جو گہوارے میں لیٹا ہوا ہے۔ بچہ گویا ہو گیا اور اس نے نہایت صاف اور فصیح زبان میں مجمع کو خطاب کر کے کہا کہ: اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا... ''میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔'' (سورۂ مریم آیت ۳۰)۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کی ہمیشہ کے لیے جڑ کاٹ دی تھی جو ولادتِ مسیح کے بارے میں پیدا ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مریم علیہا السلام کے سن شباب کو پہنچنے تک کبھی کسی نے نہ حضرت مریم پر زنا کا الزام لگایا، نہ حضرت عیسیٰ کو ناجائز لیکن جب تیس برس کی عمر کو پہنچ کر آپ نے نبوت کے کام کی ابتدا فرمائی، اور جب آپ نے یہودیوں کو ان کی بداعمالیوں پر ملامت کرنی شروع کی، ان کے علماء وفقہاء کو ان کی ریاکاریوں پر ٹوکا، ان کے عوام اور خواص سب کو اس اخلاقی زوال پر متنبہ کیا جس میں وہ مبتلا ہو گئے تھے اور اس پر خطر راستے کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی جس میں خدا کے دین کو عملاً قائم کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں اور ہر محاذ پر شیطانی قوتوں سے لڑائی کا سامنا تھا وہ صداقت کی آواز کو دبانے کے لیے ہر ناپاک سے ناپاک ہتھیار استعمال کرنے پر اتر آئے۔ اس وقت انہوں نے وہ بات کہی جو تیس سال تک نہ کہی تھی کہ مریم علیہا السلام معاذ اللہ زانیہ ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم ولد الزنا۔ حالانکہ یہ ظالم بالیقین جانتے تھے کہ یہ دونوں ماں بیٹے اس گندگی سے بالکل پاک ہیں۔ پس در حقیقت ان کا یہ بہتان کسی حقیقی شبہ کا نتیجہ نہ تھا جو واقعی ان کے دلوں میں موجود ہوتا، بلکہ خالص بہتان تھا جو انہوں نے جان بوجھ کر محض حق کی مخالفت کے لیے گھڑا تھا۔ اس بناء پر اللہ تعالیٰ نے اسے ظلم اور جھوٹ کے بجائے کفر قرار دیا ہے کیونکہ اس الزام سے ان کا اصل مقصد خدا کے دین کا روکنا تھا نہ کہ ایک بے گناہ عورت پر الزام لگانا'' (حاشیہ ۱۹۰)

''جملہ معترضہ ختم ہونے کے بعد یہاں سے پھر وہی سلسلہ تقریر شروع ہوتا ہے جو

اوپر سے چلا آرہا تھا۔

آیت نمبر ۱۵۹ کے ضمن میں سید مودودیؒ نے حاشیہ نمبر ۱۹۹ میں واضح کیا یعنی ''صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ خود اللہ کے راستے سے منحرف ہیں، بلکہ اس قدر بے باک مجرم بن چکے ہیں کہ دنیا میں خدا کے بندوں کو گمراہ کرنے کے لیے جو تحریک بھی اُٹھتی ہے، اکثر اس کے پیچھے یہودی دماغ اور یہودی سرمایہ ہی کام کرتا نظر آتا ہے، اور راہِ حق کی طرف بلانے کے لیے جو تحریک بھی شروع ہوتی ہے اکثر اس کے مقابلہ میں یہودی ہی سب سے بڑھ کر مزاحم بنتے ہیں، درآحالانکہ یہ کم بخت کتاب اللہ کے حامل اور انبیاء کے وارث ہیں۔ ان کا تازہ ترین جرم یہ اشتراکی تحریک ہے جسے یہودی دماغ نے اختراع کیا اور یہودی رہنمائی ہی نے پروان چڑھایا ہے۔ ان نام نہاد اہل کتاب کے نصیب میں یہ جرم بھی مقدر تھا کہ دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جو نظامِ زندگی اور نظامِ حکومت خدا کے صریح انکار پر، خدا سے کھلم کھلا دشمنی پر، خدا پرستی کو مٹا دینے کے علی الاعلان عزم وارادہ پر تعمیر کیا گیا اس کے موجد و مخترع اور بانی وسربراہ موسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا ہوں۔ اشتراکیت کے بعد زمانۂ جدید میں گمراہی کا دوسرا بڑا استون فرائڈ کا فلسفہ ہے اور لطف یہ ہے وہ بھی بنی اسرائیل ہی کا ایک فرد ہے!

سورہ النساء کی آیت نمبر ۱۶۰ میں یہود کو سود لینے سے منع کیا گیا تھا جس کا توراۃ میں بالفاظِ صریح یہ حکم موجود ہے کہ:

> ''اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو جو تیرے پاس رہتا ہو، قرض دے تو اس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اس سے سود لینا۔ اگر تو کسی وقت اپنے ہمسایہ کے کپڑے گروی رکھ بھی لے تو سورج کے ڈوبنے تک اس کو واپس کر دینا کیونکہ فقط وہی ایک اس کا اوڑھنا ہے، اس کے جسم کا وہی لباس ہے پھر وہ کیا اوڑھ کر سوئے گا۔ پس جب وہ فریاد کرے گا تو میں اس کی سنوں گا کیونکہ میں مہربان ہوں۔'' (خروج باب ۲۲:۲۵-۲۷)۔

(حاشیہ نمبر ۲۰۰) مزید صراحت کی کہ ''اس کے علاوہ اور بھی کئی مقامات پر توراۃ میں سود کی حرمت وارد ہوئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسی تورات کے ماننے والے یہودی آج دنیا کے سب سے بڑے سود خوار ہیں اور اپنی تنگ دلی وسنگ دلی کے لیے ضرب المثل بن چکے ہیں۔''

سورۃ المائدہ:

سورۃ المائدہ چوتھی سورت ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی۔ سید مودودی کی تحقیق کے مطابق یہ صلح حدیبیہ کے بعد ٦ ہجری کے اواخر یا ٧ ہجری کے اوائل میں نازل ہوئی۔ یاد رہے کہ ذی القعدہ ٦ ہجری میں رسول اللہ ﷺ چودہ سو مسلمانوں کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ تشریف لے گئے مگر کفار قریش نے عرب کی قدیم ترین روایت کے خلاف عمرہ کرنے کی اجازت نہ دی اور بڑی ردوکد کے بعد یہ قبول کیا کہ آئندہ سال آپ زیارتِ مکہ کے لیے آسکتے ہیں ــــ تاہم اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس میں خیر وبرکت کے بہت سے ایسے مواقع بہم پہنچادیئے کہ جس کا کوئی انسان شاید تصور بھی نہیں کرسکتا تھا ــــ اس کے چند پہلو درج ذیل ہیں:

- سورۃ آل عمران اور النساء کے زمانۂ نزول سے اس سورہ کے نزول تک پہنچتے پہنچتے حالات میں بہت بڑا تغیر ہوچکا تھا۔ اسلام اب ایک ناقابلِ شکست طاقت نظر آنے لگا تھا۔
- مدینہ کے چاروں طرف ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو سو میل تک تمام مخالف قبائل کا زور ٹوٹ گیا۔
- مدینہ پر جو یہودی خطرہ ہر وقت منڈلاتا رہتا تھا اس کا ہمیشہ کے لیے استیصال ہوگیا۔ اور حجاز میں دوسرے مقامات پر بھی جہاں جہاں یہودی آباد تھے، سب مدینہ کی حکومت کے باج گزار بن گئے۔
- علاوہ ازیں اسلامی تہذیب وتمدن کے لیے اخلاق، معاشرت اور تمدن کی تمام تر

تفصیلات طے ہوئیں۔

- صلح حدیبیہ کی وجہ سے موقعہ ملا کہ اسلام کی دعوت گرد و پیش تک دینے کا موقع فراہم ہوگیا اور جس کا افتتاح حضور اکرم ﷺ نے ایران، روم، مصر اور عرب کے بادشاہوں اور رئیسوں کو خطوط لکھنے سے کیا اور مختلف قبیلوں اور قوموں میں تبلیغ اسلام کے لیے داعی پھیل گئے۔ مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ چونکہ اب وہ ایک حکمران گروہ بن گئے ہیں اس لیے ہر حال میں عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔
- اس موقعہ پر عیسائیوں کو بھی تفصیل کے ساتھ خطاب کر کے ان کے عقائد کی غلطیاں بتائی گئیں اور نبی عربی ﷺ پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی اب ہم ان آیات کا مطالعہ کریں گے جن کا تعلق بنی اسرائیل (یہودی اور عیسائی دونوں مذاہب) کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے نازل فرمائیں۔

اس سورت میں سب سے پہلا ذکر یہودیوں کے اس گروہ سے متعلق ہے جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کو اپنے خاص خاص صحابہ کے ہمراہ کھانے کی دعوت پر بلایا لیکن خفیہ طور پر یہ سازش کی کہ اچانک ان پر ٹوٹ پڑیں گے اور اس طرح اسلام کی جان نکال دیں گے۔ لیکن عین وقت پر اللہ کے فضل سے حضور ﷺ کو اس سازش کا علم ہوگیا اور آپ دعوت پر تشریف نہ لے گئے۔ (خلاصہ آیت ۱۱)

درج بالا آیت کے حاشیہ نمبر ۳۰ میں سید مودودی نے مزید لکھا کہ ''یہاں سے جو تقریر شروع ہو رہی ہے، اس کے دو مقاصد ہیں۔''

☆...... پہلا مقصد مسلمانوں کو یہود کی پیروی نہ کرنے سے متعلق ہے اور یہ کہ وہ اس عہد کو نہ توڑیں جس طرح بنی اسرائیل نے عہد کرنے کے بعد توڑ دیا تھا۔

☆......دوسرا مقصد یہ کہ یہود و نصاریٰ کو تنبیہ کی جائے اور انہیں دین حق کی جانب دعوت دی جائے اس ضمن میں آیت ۱۲ تا ۲۶ میں یہود و نصاریٰ کو درج ذیل احکامات دیئے گئے جن کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

☆...... یہود کے ۱۲ قبیلوں میں نماز وزکوۃ کی ادائیگی نیز رسولوں پر ایمان لانا اور اللہ کو اچھا قرض دینا اور اس کے عوض میں انہیں ایسے باغوں میں داخل کرنے کا وعدہ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔

☆...... تاہم درج بالا سے انحراف/ کفر کی حالت میں ان کا سواء السبیل کو گم کر دینا ہے...... یادر ہے کہ سواء السبیل کی تشریح ایک خاکے کی مدد سے واضح کی گئی ہے جو ازخود پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔(حاشیہ ۳۵)

☆...... یہود کا اپنے عہد کو توڑ دینا اور ان کا الفاظ کا الٹ پھیر کرنا نیز اس تعلیم کا بھول جانا۔

☆...... یہود کا خیانت کرنا۔

اس ضمن میں نصاریٰ کو خطاب کرتے ہوئے ان کے جرائم اور گناہوں کی جانب متوجہ کرانا (آیت ۱۳)

☆......نصاریٰ کا اس سبق کو بھلا دینا جو انہیں یاد کرایا تھا۔

☆......ان کے درمیان قیامت تک دشمن اور بغض وعناد کا بیج بو دینا۔

☆......جن لوگوں نے مسیح ابن مریم کو خدا کہا، انہوں نے کفر کا ارتکاب کیا۔

☆...... یہود و نصاریٰ کو کہنا کہ اگر تم اللہ کے بیٹے اور چہیتے ہو تو پھر تمہیں سزا کیوں دی جاتی ہے؟

☆......آیت ۲۰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ کی نعمتوں کی یاد دلائی اور انہیں مقدس سرزمین (فلسطین) میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ تاہم انہوں نے حکم عدولی کی، بزدلی دکھائی اور یوں وہ چالیس سال تک اس ملک سے محروم رہے۔ (خلاصہ آیات ۱۴)

درج بالا کے علاوہ آیات ۴۱ تا ۲۷ میں یہود و نصاریٰ کے مختلف جرائم اور ان زیادتیوں کا اعادہ کیا گیا جس کا مختصراً ذکر ذیل میں درج ہے۔

۞ بنی اسرائیل یہودی بن گئے ہیں، جھوٹ کے لیے کان لگاتے ہیں، تمہاری باتوں کی سن گن لیتے ہیں، کتاب اللہ کے اصل معنی بدل دیتے ہیں، لوگوں کو کہتے ہیں کہ اگر تمھیں یہ حکم دیا جائے تو مانو، نہیں تو نہ مانو ...... یہ جھوٹ سننے والے، اور حرام مال کھانے والے ہیں ...... پس تم چاہو تو ان کا فیصلہ کرو ورنہ انکار کرو۔ (خلاصہ حاشیہ ٦٣ تا ٦٨)

درج بالا جرائم گنوانے کے بعد آیت ۴۳ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
''یہ تمھیں کیسے حکم بناتے ہیں جبکہ ان کے پاس توراۃ موجود ہے جس میں اللہ کا حکم لکھا ہوا ہے اور پھر یہ اس سے منہ موڑ رہے ہیں۔'' اس کی تفصیل میں سید مودودیؒ نے لکھا

امر واقعہ یہ ہے کہ ان آیات کے نزول تک یہود اسلامی حکومت کی باقاعدہ رعایا نہیں بنے تھے بلکہ اسلامی حکومت کے ساتھ ان کے تعلقات معاہدات پر مبنی تھے اور ان کے مقدمات کے فیصلے ان کے جج خود کرتے تھے لیکن اپنی چالاکی اور تورات کے احکاماتِ الٰہی سے بچنے کے لیے یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید کسی جرم کے لیے اسلامی شریعت میں کوئی دوسرا حکم ہو جس سے انہیں رعایت مل جائے، وہ اپنے مقدمات رسول اللہ ﷺ کے پاس بھی بھیج دیتے تھے (تاہم یہ بھی کہتے تھے کہ اگر تمھیں یہ حکم دیا جائے تو مانو نہیں تو نہ مانو) ...... یوں ان حیلہ جوئیوں سے ان کا مقصد شریعت موسوی سے بچنا ہوتا تھا۔ (حاشیہ نمبر ٧٠)

''اس ضمن میں یہاں ایک خاص مقدمہ کی طرف اشارہ ہے۔ خیبر کے معزز یہودی خاندانوں میں سے ایک عورت اور مرد زنا میں ملوث ہو گئے۔ تورات کی رو سے اس کی سزا سنگسار کرنا تھا لیکن یہودی اس سزا سے بچنا چاہتے تھے اس لیے یہ مقدمہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیج دیا۔ آپ ﷺ نے رجم کا حکم دیا۔ جس پر عمل کرنے سے انہوں نے انکار دیا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ تمہارے مذہب میں اس کی کیا سزا ہے تو انہوں نے

کہا کہ توراۃ میں کوڑے مارنا اور منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کرنا ہے۔ آپ ﷺ نے علماء یہود کو قسم دے کر پوچھا تو وہ جھوٹ بول گئے کہ یہی حکم ہے۔ آیت ۴۲ میں اللہ تعالیٰ نے ان مفتیوں/قاضیوں کے بارے میں یہ فرمایا تھا کہ ''یہ جھوٹ سننے والے اور حرام کے مال کھانے والے ہیں۔ تاہم حضور ﷺ نے ان کے ایک اور عالم (ابن صوریا) جو یہودیوں کے ہاں ایک قابل اعتبار عالم تھا کو یہ قسم دے کر پوچھا کہ: ''میں تجھے اس خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے تم لوگوں کو فرعون سے بچایا اور (کوہ) طور پر تمہیں شریعت عطا کی، کیا واقعی توراۃ میں زنا کی یہی سزا لکھی ہے؟''......اس نے جواباً کہا کہ اگر آپ مجھے ایسی بھاری قسم نہ دیتے تو میں نہ بتاتا...... واقعہ یہ ہے کہ زنا کی سزا تو رجم ہی ہے لیکن زنا کی کثرت ہونے پر ہمارے لوگ بڑے لوگوں کو رجم نہ کرتے تھے اور غریب لوگوں کو رجم کر دیا کرتے تھے۔ اس پر جب عوام الناس بھی ناراضگی پیدا ہوئی تو ہم نے زنا کا قانون بدل کر یہ قاعدہ بنالیا''......اس کے بعد نبی ﷺ کے حکم سے زانی اور زانیہ کو سنگسار کر دیا گیا۔''(حاشیہ ۷۰)

اس تمام واقعہ پر سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے جو تبصرہ کیا ہے، وہ پڑھنے کے لائق ہے جس میں یہود اور ان کے علماء کی بددیانتی کو بے نقاب کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے لکھا کہ:

''یہ (مذہبی لوگ) جنہوں نے تمام عرب پر اپنی دینداری اور اپنے علم کتاب کا سکہ جما رکھا تھا، ان کی حالت یہ تھی کہ جس کتاب کو خود کتاب اللہ مانتے تھے اور جس پر ایمان رکھنے کے مدعی تھے، اس کے حکم کو چھوڑ کر نبی ﷺ کے پاس اپنا مقدمہ لائے تھے جن کے پیغمبر ہونے سے ان کو بشدت انکار تھا۔ اس سے یہ راز بالکل فاش ہو گیا کہ یہ کسی چیز پر صداقت کے ساتھ ایمان نہیں رکھتے تھے، دراصل ان کا ایمان اپنے نفس اور اس کی خواہشات پر ہے، جسے کتاب اللہ مانتے ہیں (تورات)، اس سے صرف اس لیے منہ موڑتے ہیں کہ اس کا حکم ان کے نفس کو ناگوار ہے اور جسے معاذ اللہ جھوٹا مدعی

نبوت کہتے ہیں اس کے پاس صرف اس امید پر جاتے ہیں کہ شاید وہاں سے کوئی ایسا فیصلہ ہو جائے جو ان کے منشاء کے مطابق ہو۔'' (حاشیہ ۷۱)

اس ضمن میں آگے چل کر آیت ۶۱ تا ۶۳ میں یہود کی اس حالت پر کہ جب ''یہ تم لوگوں کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے حالانکہ کفر لیے ہوئے آئے تھے اور کفر ہی لیے واپس گئے۔'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''کہ تم دیکھتے ہو کہ ان میں سے بکثرت لوگ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں اور حرام کے مال کھاتے ہیں۔ بہت بری حرکات ہیں جو یہ کر رہے ہیں کیونکہ ان کے علماء اور مشائخ انہیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے۔ ◆ یقیناً بہت ہی برا کارنامہ زندگی ہے جو وہ تیار کر رہے ہیں۔''

آیت ۶۸ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت فرمائی کہ ''وہ پیغام جو آپ کو دیا گیا ہے، اسے لوگوں تک پہنچا دو...... اور صاف کہہ دو کہ اے اہل کتاب! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ توراۃ اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔''

اس کی تشریح میں حاشیہ نمبر ۹۷ میں سید مودودی نے لکھا کہ:

''تورات اور انجیل کو قائم کرنے سے مراد راست بازی کے ساتھ ان کی پیروی کرنا اور انہیں اپنا دستورِ زندگی بنانا ہے۔ اس موقع پر یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ بائبل کے مجموعہ مقدسہ میں ایک قسم کی عبارات تو وہ ہیں جو یہودی اور عیسائی مصنفین نے بطور خود لکھی ہیں۔ اور دوسری قسم کی عبارات وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارشادات یا حضرت موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں کے اقوال ہونے کی حیثیت سے منقول ہیں

◆ قرآن کریم کے یہ الہامی الفاظ کس قدر آج کے علماء و مشائخ پر صادق آ رہے ہیں، کیا موجودہ زمانے کے ان تمام حضرات اور ان کے معتقدین نے کبھی اس پر غور کیا؟

اور جن میں اس بات کی تصریح ہے کہ اللہ نے ایسا فرمایا یا فلاں نبی نے ایسا کہا۔ ان میں سے پہلی قسم کی عبارات کو الگ کر کے کوئی شخص صرف دوسری قسم کی عبارات کا تتبع کرے تو بآسانی یہ دیکھ سکتا ہے کہ ان کی تعلیم اور قرآن کی تعلیم میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ اگرچہ مترجموں اور شارحوں کی دراندازی سے، اور بعض جگہ زبانی راویوں کی غلطی سے یہ دوسری قسم کی عبارات بھی پوری طرح محفوظ نہیں رہی ہیں، لیکن اس کے باوجود کوئی شخص یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان میں بعینہ اس خالص توحید کی دعوت دی گئی ہے جس کی طرف قرآن بلا رہا ہے، وہی عقائد پیش کیے گئے ہیں جو قرآن پیش کرتا ہے اور اس طریق زندگی کی طرف راہ نمائی کی گئی ہے جس کی ہدایت قرآن دیتا ہے۔ پس حقیقت یہ ہے کہ اگر یہودی اور عیسائی اس تعلیم پر قائم رہتے جو ان پر کتابوں میں خدا اور پیغمبروں کی طرف سے منقول ہے تو یقیناً نبی ﷺ کی بعثت کے وقت وہ ایک حق پرست اور راست رو گروہ پائے جاتے اور انہیں قرآن کے اندر وہی روشنی نظر آتی جو پچھلی کتابوں میں پائی جاتی تھی۔ اس سورت میں ان کے لیے نبی ﷺ کی پیروی اختیار کرنے میں تبدیلی مذہب کا سرے سے سوال پیدا ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ اس راستہ کے تسلسل میں، جس پر وہ پہلے سے چلے آ رہے تھے، آپ ﷺ کے متبع بن کر آگے چل سکتے تھے۔''

آیت ۷۳ تا ۷۷ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا کہ:

''یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے، حالانکہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔'' پھر مزید فرمایا:

''مسیح علیہ السلام ابن مریم اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول تھا، اس سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے تھے۔ اس کی ماں ایک راستباز عورت تھی اور وہ

دونوں کھانا کھاتے تھے۔'' (آیت ۷۴)

ان آیات کی تشریح میں سید مودودیؒ کا تشریحی نوٹ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

''ان چند لفظوں میں عیسائیوں کے عقیدۂ اُلوہیت مسیح کی ایسی صاف تردید کی گئی ہے کہ اس سے زیادہ صفائی ممکن نہیں ہے۔ مسیح کے بارے میں اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ فی الحقیقت وہ کیا تھا تو ان علامات سے بالکل غیر مشتبہ طور پر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ محض ایک انسان تھا۔ ظاہر ہے کہ جو ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا، جس کا شجرۂ نسب تک موجود ہے، جو انسانی جسم رکھتا تھا، جو ان تمام حدود سے محدود اور تمام صفات سے متصف تھا جو انسان کے لیے مخصوص ہیں، جو سوتا تھا، کھاتا تھا، گرمی اور سردی محسوس کرتا تھا حتیٰ کہ جسے شیطان کے ذریعہ سے آزمائش میں بھی ڈالا گیا، اس کے متعلق کون معقول انسان یہ تصور کر سکتا ہے کہ وہ خود خدا ہے یا خدائی میں خدا کا شریک و سہیم ہے۔ لیکن یہ انسانی ذہن کی ضلالت پذیری کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ عیسائی خود اپنی مذہبی کتابوں میں مسیح کی زندگی کو صریحاً ایک انسانی زندگی پاتے ہیں اور پھر بھی اسے خدائی سے متصف قرار دینے پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس تاریخی مسیح کے قائل ہی نہیں ہیں جو عالم واقعہ میں ظاہر ہوا تھا بلکہ انہوں نے خود اپنے وہم و گمان سے ایک خیالی مسیح تصنیف کر کے اسے خدا بنالیا ہے۔ (حاشیہ نمبر ۱۰۰) اس سورت کے حاشیہ نمبر ۱۰۱ میں لکھا کہ

آیت نمبر ۷۷ میں عیسائیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ''اپنے دین میں غلو نہ کرو اور ان لوگوں کے تخیلات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا یہاں اشارہ ہے اُن گمراہ قوموں کی طرف جن سے عیسائیوں نے غلط عقیدے اور باطل طریقے اخذ کیے۔ خصوصاً فلاسفہ یونان کی طرف جن کے تخیلات سے متاثر ہو کر عیسائی اس صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے جس کی طرف ابتداً ان کی رہنمائی کی گئی تھی۔ مسیح کے ابتدائی پیرو جو عقائد رکھتے تھے وہ بڑی حد تک اس حقیقت کے مطابق تھے جس کا مشاہدہ انہوں نے خود کیا تھا اور جس کی تعلیم ان کے ہادی و رہنما نے ان کو دی تھی۔ مگر بعد کے

عیسائیوں نے ایک طرف مسیح کی عقیدت اور تعظیم میں غلو کر کے، اور دوسری طرف ہمسایہ قوموں کے اوہام اور فلسفوں سے متاثر ہو کر، اپنے عقائد کی مبالغہ آمیز فلسفیانہ تعبیریں شروع کر دیں اور ایک بالکل ہی نیا مذہب تیار کر لیا جس کو مسیح کی اصل تعلیمات سے دور کا واسطہ بھی نہ رہا۔ اس باب میں خود ایک مسیحی عالم دینیات (ریورینڈ چارلس اینڈرسن اسکاٹ) کا بیان قابل ملاحظہ ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے چودھویں ایڈیشن میں ''یسوع مسیح''(Jesus Christ) کے عنوان پر اس نے جو طویل مضمون لکھا ہے اس میں وہ کہتا ہے:

> ''پہلی تین انجیلوں (متی، مرقس، لوقا) میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جا سکتا ہو کہ ان انجیلوں کے لکھنے والے یسوع کو انسان کے سوا کچھ اور سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں وہ ایک انسان تھا، ایسا انسان جو خاص طور پر خدا کی روح سے فیض یاب ہوا تھا اور خدا کے ساتھ ایک ایسا غیر منقطع تعلق رکھتا تھا جس کی وجہ سے اگر اس کو خدا کا بیٹا کہا جائے تو حق بجانب ہے۔ خود متی اس کا ذکر بڑھئی کے بیٹے کی حیثیت سے کرتا ہے اور ایک جگہ بیان کرتا ہے کہ پطرس نے اس کو ''مسیح'' تسلیم کرنے کے بعد ''الگ ایک طرف لے جا کر اسے ملامت کی'' (متی ۱۶، ۲۲)۔ لوقا میں ہم دیکھتے ہیں کہ واقعہ صلیب کے بعد یسوع کے دو شاگرد اماؤس کی طرف جاتے ہوئے اس کا ذکر اس حیثیت سے کرتے ہیں کہ ''وہ خدا اور ساری امت کے نزدیک کام اور کلام میں قدرت والا نبی تھا (لوقا ۲۴:۱۹)۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اگرچہ ''مرقس'' کی تصنیف سے پہلے مسیحیوں میں یسوع کے لیے لفظ ''خداوند''(Lord) کا استعمال عام طور پر چل پڑا تھا، لیکن نہ مرقس کی انجیل میں یسوع کو کہیں اس لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور نہ متی کی انجیل میں۔ بخلاف اس کے دونوں کتابوں میں یہ لفظ اللہ کے لیے بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔

یسوع کے ابتلاء کا ذکر تینوں انجیلیں پورے زور کے ساتھ کرتی ہیں جیسا کہ اس واقعہ کے شایانِ شان ہے، مگر مرقس کی ''فدیہ'' والی عبارت (مرقس ۱۰، ۴۵) اور آخری فسح کے موقع پر چند الفاظ کو مستثنیٰ کر کے ان کتابوں میں کہیں اس واقعے کو وہ معنی نہیں پہنائے گئے ہیں جو بعد میں پہنائے گئے۔ حتیٰ کہ اس بات کی طرف کہیں اشارہ تک نہیں کیا گیا کہ یسوع کی موت کا انسان کے گناہ اور اس کے کفارہ سے کوئی تعلق تھا۔''

آگے چل کر وہ پھر لکھتا ہے:

''یہ بات کہ یسوع خود اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتا تھا اناجیل کی متعدد عبارتوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ ''مجھے آج اور کل اور پرسوں اپنی راہ پر چلنا ضرور ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو'' (لوقا ۱۳، ۲۳)۔ وہ اکثر اپنا ذکر ابن آدم کے نام سے کرتا ہے......

اس کے بعد یہ مصنف پھر لکھتا ہے:

''وہ سینٹ پال تھا جس نے اعلان کیا کہ واقعہ رفع کے وقت اسی فعل رفع کے ذریعہ سے یسوع پورے اختیارات کے ساتھ ''ابن اللہ'' کے مرتبہ پر علانیہ فائز کیا گیا...... یہ ''ابن اللہ'' کا لفظ یقینی طور پر ذاتی ابنیت کی طرف ایک اشارہ اپنے اندر رکھتا ہے جسے پال نے دوسری جگہ یسوع کو ''خدا کا اپنا بیٹا'' کہہ کر صاف کر دیا ہے۔ اس امر کا فیصلہ اب نہیں کیا جا سکتا کہ آیا وہ ابتدائی عیسائیوں کا گروہ تھا یا پال جس نے مسیح کے لیے ''خداوند'' کا خطاب اصل مذہبی معنی میں استعمال کیا۔ شاید یہ فعل مقدم الذکر گروہ ہی کا ہو۔ لیکن بلاشبہ وہ پال تھا جس نے اس خطاب کو پورے معنی میں بولنا شروع کیا، پھر اپنے مدعا کو اس طرح اور بھی زیادہ واضح کر دیا کہ ''خداوند یسوع مسیح'' کی طرف بہت سے وہ تصورات اور اصطلاحی الفاظ منتقل کر دیے جو قدیم کتب

سے مقدسہ خداوند یہُوَہ (اللہ تعالیٰ) کے لیے مخصوص تھے۔اس کے ساتھ ہی اس نے مسیح کو خدا کی عظمت کے مساوی قرار دیا اور اسے مطلق معنی میں خدا کا بیٹا ٹھہرایا۔ تاہم متعدد حیثیات اور پہلوؤں سے مسیح کو خدا کے برابر کر دینے کے باوجود پال اس کو قطعی طور پر اللہ کہنے سے باز رہا۔''

سید مودودیؒ نے اپنی تفسیر میں اس موضوع پر بہت تحقیقی گفتگو کی ہے جس میں تاریخی واقعات کے حوالے سے ثابت کیا گیا ہے کہ باپ، بیٹا اور روح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں جبکہ یہود بھی یونانی اثرات کے تحت متاثر ہو چکے تھے۔اس امر کا فیصلہ عیسائیت کی تاریخ میں ان مختلف النوع اجلاسوں میں وقتاً فوقتاً ہوتا رہا جس کا نہایت مختصر خلاصہ میں پیش کیا جا رہا ہے: (حاشیہ ۱۰۱)

i) تیسری صدی عیسوی سے پہلے عیسائی، عیسیٰ کی الوہیت کے قائل نہ تھے۔

ii) چوتھی صدی عیسوی میں اس مسئلے پر بہت سخت بحثیں چھڑیں جس سے کلیسا کی بنیادیں ہل گئیں تاہم ۳۲۵ء میں نیقیاہ کی کونسل نے الوہیت مسیح کو باضابطہ سرکاری طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا۔

iii) بعد ازاں اس موضوع پر مزید مختلف فلسفیانہ بحثوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ۴۵۱ء میں کالیسڈن کی کونسل نے فیصلہ کیا کہ مسیح کی ذات میں دو مکمل طبیعتیں مجتمع ہیں، ایک الٰہی طبیعت دوسری انسانی طبیعت۔

iv) تیسری کونسل جو ۶۸۰ء میں بمقام قسطنطنیہ منعقد ہوئی اس میں یہ اضافہ کیا گیا کہ یہ دونوں طبیعتیں اپنی الگ الگ مشیتیں بھی رکھتی ہیں، یعنی مسیح بیک وقت دو مشیتوں کا حامل ہے۔

v) ۵۲۹ء میں اورینج کی کونسل نے یہ نظریہ اختیار کیا کہ آدم کو جنت سے نکالے جانے کے سبب (Orignil Sin theory) کی وجہ سے کوئی انسان نجات حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اصطباغ (Baptisim) کے ذریعے نئی زندگی نہ حاصل

کر لے اور اس نئی زندگی میں بھی اسے استمرار نصیب نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ فضل خداوندی ا کا مددگار نہ رہے اور فضل خداوندی کی یہ دائمی اعانت اسے صرف رومن کیتھولک کلیسا ہی کے توسط سے حاصل ہوسکتی ہے۔''

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے ایک دوسرے مضمون ''مسیحیت'' میں رونڈ جارج ولیم ناکس مسیحی کلیسا کے بنیادی عقیدے پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''عقیدۂ تثلیث کا فکری سانچہ یونانی ہے اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ہمارے لیے ایک عجیب قسم کا مرکب ہے، مذہبی خیالات بائبل کے ڈھلے ہوئے ایک اجنبی فلسفے کی صورتوں میں۔''

سید مودودیؒ نے مزید لکھا کہ مسیحی علماء کے ان بیانات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ابتداءً جس چیز نے مسیحیوں کو گمراہ کیا وہ عقیدت اور محبت کا غلو تھا۔ اسی غلو کی بنا پر مسیح علیہ السلام کے لیے خداوند اور ابن اللہ کے الفاظ استعمال کیے گئے، خدائی صفات ان کی طرف منسوب کی گئیں، اور کفارہ کا عقیدہ ایجاد کیا گیا، حالانکہ حضرت مسیح کی تعلیمات میں ان باتوں کے لیے قطعاً کوئی گنجائش موجود نہ تھی۔ پھر جب فلسفہ کی ہوا مسیحیوں کو لگی تو بجائے اس کے کہ یہ لوگ اس ابتدائی گمراہی کو سمجھ کر اس سے بچنے کی سعی کرتے، انہوں نے اپنے گزشتہ پیشواؤں کی غلطیوں کو نباہنے کے لیے ان کی توجیہات شروع کر دیں اور مسیح کی اصل تعلیمات کی طرف رجوع کیے بغیر محض منطق اور فلسفہ کی مدد سے عقیدے پر عقیدہ ایجاد کرتے چلے گئے یہی وہ ضلالت ہے جس پر قرآن نے ان آیات میں مسیحیوں کو متنبہ فرمایا ہے۔

اس سے اگلی آیت نمبر ۷۸ میں بنی اسرائیل پر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کا ذکر ہے کیونکہ وہ سرکش ہوگئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے، انہوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا، برا عمل تھا جو انہوں نے اختیار کیا—— اس کی تشریح میں سید مودودی نے بتایا کہ ''ہر قوم کا

بگاڑ ابتداً چند افراد سے شروع ہوتا ہے۔ اگر قوم کا اجتماعی ضمیر زندہ ہوتا ہے تو رائے عامہ ان بگڑے ہوئے افراد کو دبائے رکھتی ہے اور قوم بحیثیت مجموعی بگڑنے نہیں پاتی، لیکن اگر قوم ان افراد کے معاملہ میں تساہل شروع کر دیتی ہے اور غلط کار لوگوں کو ملامت کرنے کی بجائے انہیں سوسائٹی میں غلط کاری کے لیے آزاد چھوڑ دیتی ہے تو پھر رفتہ رفتہ وہی خرابی جو پہلے چند افراد تک محدود تھی، پوری قوم میں پھیل کر رہتی ہے۔ یہی چیز تھی جو آخر کار بنی اسرائیل کے بگاڑ کی موجب ہوئی۔ (حاشیہ ۱۰۲)

درج بالا آیت کے تسلسل میں یہودیوں کے اس طرز عمل کی مذمت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ:

☆......وہ اہل ایمان کے مقابلے میں کفار کی حمایت و رفاقت کرتے ہیں۔

(آیت:۸۲)

☆......اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین

☆......نصاریٰ، ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب تر کیونکہ

i) ان میں عبارت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں۔

ii) ان میں غرورِ نفس نہیں ہے۔

iii) کلام الٰہی کو سن کر ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔

iv) وہ دعا کرتے ہیں کہ پروردگار ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔

(آیت ۸۱ تا ۸۳)

''درج بالا خصوصیات کی بناء پر ایک تقابلی تصویر یہود اور نصاریٰ دونوں کی ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ خدا اور رسول پر ایمان لانے والوں کی تمام تر ہمدردیاں، فطرتاً مشرکین کے مقابلے میں ان لوگوں کے ساتھ ہونی چاہئیں جو انہی کی طرح خدا اور رسول پر یقین رکھتے ہیں لیکن یہاں ایک طرفہ تماشہ ہے کہ یہود، توحید اور شرک کی جنگ میں کھلم کھلا مشرکین کا

ساتھ دے رہے ہیں۔ اور پھر بھی وہ بلا کسی شرم و حیا کے یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ
ہم خدا اور پیغمبروں اور کتابوں کے ماننے والے ہیں۔'' (حاشیہ ۱۰۳)

آیت نمبر ۱۱۰ تا آخر سورت میں اللہ تعالیٰ کے اس استفسار کا تذکرہ ہے جو نہ صرف تمام رسولوں سے پوچھا جائے گا بلکہ خصوصاً عیسیٰ علیہ السلام سے ان تمام معجزات کے بارے میں سوال ہوگا جو آنجناب کو عطا ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھے گا کہ ''کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی خدا بنا لو۔'' (آیت: ۱۱۶) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب میں جو عرض کریں گے وہ ان کی بندگی اور عبودیت کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔ تاہم اس آیت کے مندرجات پر سید مودودی کا تفصیلی اور توضیحی حاشیہ نمبر ۱۳۰ بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ جو درج ذیل ہے

''عیسائیوں نے اللہ کے ساتھ صرف مسیح اور روح القدس ہی کو خدا بنانے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مسیح کی والدۂ ماجدہ حضرت مریم کو بھی ایک مستقل معبود بنا ڈالا۔ حضرت مریم علیہا السلام کی اُلوہیت یا قدوسیت کے متعلق کوئی اشارہ تک بائبل میں موجود نہیں ہے۔ مسیح کے بعد ابتدائی تین سو برس تک عیسائی دنیا اس تخیل سے بالکل نا آشنا تھی۔ تیسری صدی عیسوی کے آخری دور میں اسکندریہ کے بعض علماء دینیات نے پہلی مرتبہ حضرت مریم کے لیے ''ام اللہ'' یا ''مادرِ خدا'' کے الفاظ استعمال کیے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اُلوہیت مریم کا عقیدہ اور مریم پرستی کا طریقہ عیسائیوں میں پھیلنا شروع ہوا۔ لیکن اول اول چرچ اسے باقاعدہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا، بلکہ مریم پرستوں کو فاسد العقیدہ قرار دیتا تھا۔ ۴۳۱ء میں شہر افسوس میں ایک کونسل منعقد ہوئی، اور اس کونسل میں پہلی مرتبہ کلیسا کی سرکاری زبان میں حضرت مریم کے لیے ''مادرِ خدا'' کا لقب استعمال کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مریم پرستی کا جو مرض اب تک کلیسا کے باہر پھیل رہا تھا وہ اس کے بعد کلیسا کے اندر بھی تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا، حتیٰ کہ نزولِ قرآن کے زمانہ تک پہنچتے پہنچتے حضرت مریم اتنی بڑی دیوی بن گئیں کہ باپ، بیٹا اور روح القدس تینوں ان کے سامنے ہیچ ہو گئے۔ ان

کے مجسمے جگہ جگہ کلیساؤں میں رکھے ہوئے تھے، ان کے آگے عبادت کے جملہ مراسم ادا کیے جاتے تھے، انہی سے دعائیں مانگی جاتی تھیں، وہی فریادرس، حاجت روا، مشکل کشا اور بیکسوں کی پشتیبان تھیں، اور ایک مسیحی بندے کے لیے سب سے بڑا ذریعہ اعتماد اگر کوئی تھا تو وہ یہ تھا کہ مادرِ خدا کی حمایت و سرپرستی اسے حاصل ہو۔ نبی ﷺ کے ہم عصر ہرقل نے اپنے جھنڈے پر ''مادرِ خدا'' کی تصویر بنا رکھی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس تصویر کی برکت سے یہ جھنڈا سرنگوں نہ ہوگا۔ اگرچہ بعد کی صدیوں میں تحریک اصلاح کے اثر سے پروٹسٹنٹ عیسائیوں نے مریم پرستی کے خلاف شدت سے آواز اُٹھائی لیکن رومن کیتھولک کلیسا آج تک اس مسلک پر قائم ہے۔

سورۃ الانعام:

اب ہم اپنے مطالعہ قرآن کے سفر میں سورہ الانعام تک پہنچ چکے ہیں۔سورہ الانعام قرآن کریم کی چھٹی سورت ہے جو مکہ میں نازل ہوئی۔ سید مودودی نے اس کے آغاز میں جو کچھ لکھا ہے، وہ از خود پڑھنے کی چیز ہے۔اس میں انہوں نے حضور ﷺ کی مکی زندگی کے چہار ادوار پر ابتلا اور آزمائشیوں کی جو داستان نہایت مختصراً لکھی ہے۔ وہ ہم جیسے مسلمانوں بالخصوص منبر و محراب اور میدان سیاست کے جغادری لوگوں کے لیے سامانِ عبرت ہونی چاہیے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے کن کن مصائب اور تکالیف کا مقابلہ کر کے ہمارے لیے دین مبین کی راہوں کو آسان کر دیا لیکن ہم ایک ایسی بدنصیب امت ہیں جو اس دین کے صدقے، دنیا کی تمام تر آسائشوں اور آرام سے تو بہرہ مند ہوئے، اسلام نے امت کو زندگی کے مختلف ادوار میں ایک پناہ گاہ تو فراہم کی لیکن ہم نے اس کا حق ادا کرنے میں مجرمانہ غفلت اور بے حسی کا مظاہرہ کیا۔

اگرچہ اس تمام سورۃ میں خطاب، زیادہ تر شرک کا ابطال اور عقیدۂ توحید اور اس سے متعلقہ موضوعات پر ہے تاہم کہیں کہیں بنی اسرائیل (یہود و نصاریٰ دونوں) کا ذکر بھی آیا ہے۔آیئے ان آیات کا مطالعہ کریں اس ذہن کے ساتھ (نہایت چوکنے رہتے ہوئے)

کہ کہیں یہ ہمارا ذکر تو نہیں ہو رہا کہ ''اے ایمان لانے والو، تم وہ بات کیوں کہتے ہو جس پر عامل نہیں'' (مفہوم سورہ الصّف)۔ اور یہ یاد دہانی خاص طور پر اہل علم و فضل کے لیے ہے جنہیں دین مبین کی صحیح دعوت عوام الناس اور صاحبان اقتدار دونوں گروہوں تک پہنچانے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے!

آیات ۸۲ میں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قصے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جو ان کے باپ (آذر) کے درمیان ہوا تھا۔ سید مودودی نے حضرت ابراہیم کے دور کے حالات کے بارے میں ایک تفصیلی نوٹ حاشیہ ۵۲ میں لکھا ہے (اس بارے میں معلومات کسی دوسری جگہ دی جا رہی ہیں)۔ اس تسلسل میں آیت نمبر ۹۱ میں (یہود) سے سوال کیا گیا کہ ''ان لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے۔ ان سے پوچھو، پھر وہ کتاب جسے موسیٰ لایا تھا، جو تمام انسانوں کے لیے روشنی اور ہدایت تھی، جسے تم پارہ پارہ کر کے رکھتے ہو، کچھ دکھاتے ہو اور بہت کچھ چھپا جاتے ہو، اور جس کے ذریعے سے تم کو وہ علم دیا گیا جو نہ تمہیں حاصل تھا اور نہ تمہارے باپ دادا کو، آخر اس کا نازل کرنے والا کون تھا؟''

اس ضمن میں سورہ الانعام کی آیت ۹۱ کے حاشیہ نمبر ۶۰ میں سید مودودی نے وضاحت کی کہ ''پچھلے سلسلہ بیان اور بعد کی جوابی تقریر سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ یہ قول یہودیوں کا تھا۔ چونکہ نبی ﷺ کا دعویٰ یہ تھا کہ میں نبی ہوں اور مجھ پر کتاب نازل ہوئی ہے، اس لیے قدرتی طور پر کفارِ قریش اور دوسرے مشرکین عرب اس دعویٰ کی تحقیق کے لیے یہود و نصاریٰ کی طرف رجوع کرتے تھے اور ان سے پوچھتے تھے کہ تم بھی اہل کتاب ہو، پیغمبروں کو مانتے ہو، بتاؤ کیا واقعی اس شخص پر اللہ کا کلام نازل ہوا ہے؟ پھر جو کچھ جواب وہ دیتے اسے نبی ﷺ کے سرگرم مخالفین جگہ جگہ بیان کر کے لوگوں کو برگشتہ کرتے پھرتے تھے۔ اس لیے یہاں یہودیوں کے اس قول کو، جسے مخالفین اسلام نے حجت بنا رکھا تھا، نقل کر کے جواب دیا جا رہا ہے۔'' نیز اسی سورت کے حاشیہ نمبر ۶۰ میں

اس امر کی مزید وضاحت کی کہ:

''یہ جواب چونکہ یہودیوں کو دیا جا رہا ہے اس لیے موسیٰ علیہ السلام پر توراۃ کے نزول کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے کیونکہ وہ خود اس کے قائل تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ تسلیم کرنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توراۃ نازل ہوئی تھی، ان کے اس قول کی آپ سے آپ تردید کر دیتا ہے کہ خدا نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا۔ نیز اس سے کم از کم اتنی بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ بشر پر خدا کا کلام نازل ہو سکتا ہے اور ہو چکا ہے۔''

سورۃ الانعام کی آیت ۱۲۳ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا دیا ہے کہ وہاں اپنے مکر وفریب کا جال بچھائیں۔ دراصل وہ اپنے فریب کے جال میں آپ پھنستے ہیں، مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔'' بستی کے بڑے بڑے مجرموں اور ان کے مکر وفریب کے بارے میں قرآن میں متعدد بار ذکر آیا ہے جس میں قیامت کے روز عوام الناس (ان کے مقلدین / ماننے والوں) اور ان کے درمیان لڑائی جھگڑے کے متعدد واقعات کا ذکر ہے۔ (مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے باب ۲)

سورہ مریم:

بنی اسرائیل کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے جب ہم سورہ مریم تک پہنچتے ہیں تو قرآن کریم نے واضح کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کو یہود کے لیے ایک آزمائش کے طور پر پیش کیا گیا جسے ''نشانی'' کہا گیا ہے۔ (آیت: ۲۱)

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَ لِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا ۚ (مریم ۲۱)

''فرشتے نے کہا ایسا ہی ہوگا، تیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے۔ اور ہم یہ اس لیے کریں گے کہ اس لڑکے کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں اور اپنی طرف سے ایک رحمت۔۔۔۔۔۔''

اس کی تشریح میں حاشیہ نمبر ۲۱ میں سید مودودی رقمطراز ہیں: ''یہ ہے وہ نشانی'' جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات میں بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی گئی۔ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو ان کی مسلسل بدکرداریوں پر عبرت ناک سزا دینے سے پہلے ان پر حجت قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے یہ تدبیر فرمائی کہ بنی ہارون کی ایک ایسی زاہدہ وعابدہ لڑکی کو جو بیت المقدس میں معتکف اور حضرت زکریا علیہ السلام کے زیر تربیت تھی، دوشیزگی کی حالت میں حاملہ کر دیا تا کہ جب وہ بچہ لیے ہوئے آئے تو ساری قوم میں ہیجان برپا ہو جائے اور لوگوں کی توجہات یک لخت اس پر مرکوز ہو جائیں۔ پھر اس تدبیر کے نتیجے میں جب ایک ہجوم حضرت مریم علیہا السلام پر ٹوٹ پڑا تو اللہ تعالیٰ نے اس نوزائیدہ بچے سے کلام کرایا تا کہ جب یہی بچہ بڑا ہو کر نبوت کے منصب پر سرفراز ہو تو قوم میں ہزاروں آدمی اس امر کی شہادت دینے والے موجود ہوں کہ اس کی شخصیت میں وہ اللہ تعالیٰ کا ایک حیرت انگیز معجزہ دیکھ چکے ہیں۔ اس پر بھی جب یہ قوم اس کی نبوت کا انکار کرے اور اس کی پیروی قبول کرنے کی بجائے اسے مجرم بنا کر صلیب پر چڑھانے کی کوشش کرے تو پھر اس کو ایسی عبرت ناک سزا دی جائے جو دنیا میں کسی قوم کو نہیں دی گئی۔''

سورہ السجدہ:

قرآن کریم میں سورہ السجدہ کا مطالعہ ہمیں اس کی آیت ۲۲ سے ۲۵ تک لاتا ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات بیان کر کے بتایا گیا ہے کہ جو کتاب انہیں دی گئی تھی اس کو بنی اسرائیل کی ہدایت کا ذریعہ بنایا تھا۔ اس ضمن میں حاشیہ جات ۳۵ تا ۳۸ میں جو کہا گیا ہے وہ ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔

''خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر دراصل مخاطب وہ لوگ ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں، اور آپ کے اوپر کتابِ الٰہی کے نازل ہونے میں شک کر رہے تھے۔ یہاں سے کلام کا رُخ اسی مضمون کی طرف پھر رہا ہے جو آغاز سورہ (آیات نمبر ۲ اور ۳ میں بیان ہوا تھا۔ کفارِ مکہ کہہ رہے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر خدا کی طرف سے کوئی کتاب

نہیں آئی ہے، انہوں نے اسے خود گھڑ لیا ہے اور دعویٰ یہ کر رہے ہیں کہ خدا نے اسے نازل کیا ہے۔ اس کا ایک جواب ابتدائی آیات میں دیا گیا تھا۔ اب اس کا دوسرا جواب دیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات جو فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اے نبی، یہ نادان لوگ تم پر کتابِ الٰہی کے نازل ہونے کو اپنے نزدیک بعید از اِمکان سمجھ رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر دوسرا شخص بھی اگر اس کا انکار نہ کرے تو کم از کم اس کے متعلق شک ہی میں پڑ جائے۔ لیکن ایک بندے پر خدا کی طرف سے کتاب نازل ہونا ایک نرالا واقعہ تو نہیں ہے جو انسانی تاریخ میں آج پہلی مرتبہ ہی پیش آیا ہو۔ اس سے پہلے متعدد انبیاء پر کتابیں نازل ہو چکی ہیں، جن میں سے مشہور ترین کتاب وہ ہے جو موسیٰ (علیہ السلام) کو دی گئی تھی۔ لہٰذا اسی نوعیت کی ایک چیز آج تمہیں دی گئی ہے تو آخر اس میں انوکھی بات کیا ہے جس پر خواہ مخواہ شک کیا جائے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کے حوالے سے اہل عرب کو بتایا جا رہا ہے کہ ''وہ کتاب بنی اسرائیل کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنائی گئی تھی، اور یہ کتاب اسی طرح تم لوگوں کی رہنمائی کے لیے بھیجی گئی ہے، جیسا کہ آیت نمبر ۳ میں پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ اس ارشاد کی پوری معنویت اس کے تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھنے سے ہی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ یہ بات تاریخ سے ثابت ہے، اور کفار مکہ بھی اس سے ناواقف نہ تھے کہ بنی اسرائیل کئی صدی تک مصر میں انتہائی ذلت و نکبت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان موسیٰ (علیہ السلام) کو پیدا کیا، ان کے ذریعہ سے اس قوم کو غلامی کی حالت سے نکالا، پھر ان پر کتاب نازل کی اور اس کے فیض سے وہی دبی اور پسی ہوئی قوم ہدایت پا کر دنیا میں ایک نامور قوم بن گئی۔ اس تاریخ کی طرف اشارہ کر کے اہل عرب سے فرمایا جا رہا ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے وہ کتاب بھیجی گئی تھی، اسی طرح تمہاری ہدایت کے لیے یہ کتاب بھیجی گئی ہے۔'' (حاشیہ ۳۶)

حاشیہ نمبر ۳۷ میں کفارِ مکہ کو یاد دلایا گیا کہ ''بنی اسرائیل کو اس کتاب نے جو کچھ

بنایا اور جن مدارج پر ان کو پہنچایا، وہ محض ان کے درمیان کتاب کے آ جانے کا کرشمہ نہ تھا کہ گویا یہ کوئی تعویذ ہو جو باندھ کر اس قوم کے گلے میں لٹکا دیا گیا ہو اور اس کے لٹکتے ہی قوم نے بامِ عروج پر چڑھنا شروع کر دیا ہو، **بلکہ یہ ساری کرامت اس یقین کی تھی جو وہ اللہ کی آیات پر لائے، اور اس صبر اور ثابت قدمی کی تھی جو انہوں نے احکام الٰہی کی پیروی میں دکھائی۔** خود بنی اسرائیل کے اندر بھی پیشوائی انہی کو نصیب ہوئی جو ان میں سے کتاب اللہ کے سچے مومن تھے اور دنیوی فائدوں اور لذتوں کی طمع میں پھسل جانے والے نہ تھے۔ انہوں نے جب حق پرستی میں ہر خطرے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، ہر نقصان اور ہر تکلیف کو برداشت کیا، اور اپنے نفس کی شہوات سے لے کر باہر کے اعدائے دین تک ہر ایک کے خلاف مجاہدہ کا حق ادا کر دیا تب ہی وہ دنیا کے امام بنے۔ اس سے مقصود کفارِ عرب کو متنبہ کرنا ہے کہ جس طرح خدا کی کتاب کے نزول نے بنی اسرائیل کے اندر قسمتوں کے فیصلے کیے تھے، اسی طرح اب اس کتاب کا نزول تمہارے درمیان بھی قسمتوں کا فیصلہ کر دے گا۔ اب وہی لوگ امام بنیں گے جو اس کو مان کر صبر و ثبات کے ساتھ حق کی پیروی کریں گے۔ اس سے منہ موڑنے والوں کی تقدیر گردش میں آ چکی ہے۔''

پھر ان اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے جو یہود نے کتاب موسیٰ کی تعلیمات میں کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''یہ اشارہ ہے ان اختلافات اور فرقہ بندیوں کی طرف جن کے اندر بنی اسرائیل ایمان و یقین کی دولت سے محروم ہونے، اور اپنے راست رو آئمہ کی پیروی چھوڑ دینے اور دنیا پرستی میں پڑ جانے کے بعد مبتلا ہوئے۔ اس حالت کا ایک نتیجہ تو ظاہر ہے جسے ساری دنیا دیکھ رہی ہے کہ بنی اسرائیل ذلت و نکبت میں گرفتار ہیں۔ دوسرا نتیجہ وہ ہے جو دنیا نہیں جانتی اور وہ قیامت کے روز ظاہر ہوگا۔ (حاشیہ ۳۸)

سورہ الحشر:

بنی اسرائیل کی تاریخ کے ضمن میں سورہ الحشر ایک بہت ہی اہم سورت ہے۔ گزشتہ سورتوں البقرہ، بنی اسرائیل و دیگر میں جن تاریخی واقعات کا یہود کے ماضی کے حوالے

سے ذکر کیا گیا ہے، ان کا تعلق بیشتر ان کے اس دور سے متعلق ہے جو طوفانِ نوح علیہ السلام کے بعد بچ جانے والے یہود کی سرگزشت سے ہے تاہم سورہ الحشر میں اس قوم کا چہرہ اس میں دیکھا جاسکتا ہے جو بعثت نبوی ﷺ بالخصوص مدینہ میں ہجرت کے بعد گزرا۔ ماضی کی طرح یہ چہرہ بھی جھوٹ فریب، وعدہ خلافیوں، کہہ مکرنیوں، انبیائے سابقہ کی قتل کی سازشوں اور اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں کا ایک ایسا موقع نظر آتا ہے جس کی روشنی میں بنی اسرائیل کی منصب امامت سے معزولی کی وجوہات بآسانی سمجھی جاسکتی ہیں۔

اس سورت کے ابتدائی تعارف میں سید مودودیؒ نے متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دیگر اہل علم کی متفقہ رائے لکھی ـــــ یہ پوری سورت غزوۂ بنی نضیر کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ سید مودودیؒ نے دس سے زائد صفحات پر محیط ان کی تاریخ بالخصوص مدینہ میں، اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ ان کی مجرمانہ حرکتوں کا ایک بہت ہی مبسوط جائزہ لیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس قوم کے واقعات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے ایک قاری کو ان کا مطالعہ کرنا چاہیے تاہم ہم اس تحریر کے چیدہ چیدہ نکات ذیل میں درج کر رہے ہیں۔

☆......''عرب کے یہودیوں کی کوئی مستند تاریخ دنیا میں موجود نہیں۔ یہودِ عرب کی بیشتر تاریخ کا انحصار ان زبانی روایات پر ہے جو اہل عرب میں مشہور تھیں اور ان میں اچھا خاصا حصہ خود یہودیوں کا اپنا پھیلایا ہوا ہے۔'' (تعارف سورہ ص ۳۷۰)

☆......''حجاز کے یہودیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ سب سے پہلے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آخر عہد میں یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ اس طرح یہودی گویا اس بات کے مدعی تھے کہ وہ بارہ سو برس قبل مسیح یہاں آباد ہیں لیکن درحقیقت اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ اور اغلب یہ ہے کہ یہودیوں نے یہ افسانہ اس لیے گھڑا تھا کہ اہل عرب پر اپنے قدیم الاصل اور عالی منصب ہونے کی دھونس جمائیں۔''

☆......درحقیقت جو بات ثابت ہے یہ ہے کہ جب ۷۰ عیسوی میں رومیوں نے فلسطین میں یہودیوں کا قتل عام کیا اور پھر ۱۳۲ء میں انہیں اس سرزمین سے بالکل نکال

باہر کیا تو اس دور میں بہت سے یہودی قبائل بھاگ کر حجاز میں پناہ گزین ہوئے تھے۔۔۔۔۔ یہاں آ کر انہوں نے جہاں جہاں چشمے اور سرسبز مقامات دیکھے وہاں ٹھہر گئے اور پھر رفتہ رفتہ اپنے جوڑ توڑ اور سود خواری کے ذریعے سے ان پر قبضہ جما لیا...... ایلہ، تبوک، تیماء، فدک اور خیبر پر ان کا تسلط اس دور میں قائم ہوا اور بنی قریظہ، بنی نضیر اور بنی قینقاع اس دور میں آ کر یثرب پر قابض ہوئے۔''

☆...... یثرب میں آباد ہونے والے قبائل میں سے بنی نضیر اور بنی قریظہ زیادہ ممتاز تھے کیونکہ وہ کاہنوں (PRIEST) یا (COHEN) کے طبقے میں سے تھے۔ انہیں یہودیوں میں عالی نسب مانا جاتا تھا۔ اور ان کو اپنی ملت میں مذہبی ریاست حاصل تھی۔

☆......''تقریباً تین صدی بعد ۴۵۰ یا ۴۵۱ میں یمن میں سیلاب عظیم کا واقعہ پیش آیا...... اس سیلاب کی وجہ سے قوم سبا کے مختلف قبیلے یمن سے نکل کر عرب کے اطراف میں پھیل گئے۔ ان میں دیگر قبائل کے علاوہ اوس وخزرج یثرب میں جا کر آباد ہوئے جہاں یہودیوں نے ان کی دال نہ گلنے دی اور وہ بنجر زمینوں پر رہنے پر مجبور ہو گئے۔۔۔۔۔ بالآخر بھوک سے تنگ آ کر ان کے سرداروں میں سے کسی ایک نے شام جا کر اپنے غسانی بھائیوں سے مدد مانگی اور ایک بڑا لشکر لے کر یہودیوں کا زور توڑا۔۔۔۔۔ یوں اوس وخزرج کو یثرب پر پورا غلبہ حاصل ہو گیا اور یہودیوں کے دو بڑے قبیلے بنی نضیر اور بنی قریظہ شہر کے باہر جا کر بسنے پر مجبور ہو گئے۔ مگر تیسرے بنی قینقاع کی چونکہ ان دونوں یہودی قبیلوں سے ان بن تھی اس لیے وہ شہر کے اندر ہی مقیم رہا مگر یہاں رہنے کے لیے اسے قبیلہ خزرج کی پناہ لینی پڑی۔ اور اس کے مقابلے میں بنی نضیر اور بنی قریظہ نے قبیلہ اوس کی پناہ لی تاکہ اطرافِ یثرب میں رہ سکیں۔ یہاں سید مودودیؒ نے ایک نقشے کے ذریعے ان مقامات کی وضاحت کی ہے جہاں یہ قبیلے آباد تھے۔ سید مودودی نے اس ضمن میں مزید لکھا کہ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے حجاز میں عموماً اور یثرب میں خصوصاً یہودیوں کی پوزیشن کے نمایاں خدوخال یہ تھے۔

اولاً۔ زبان، لباس، تہذیب وتمدن ہر لحاظ سے پوری طرح عربیت ان پر غالب تھی حتیٰ کہ ان کی غالب اکثریت کے نام تک عربی ہو گئے تھے۔ بارہ قبیلوں میں سوائے ایک قبیلے کے کسی کی زبان عبرانی نہ تھی ـــــ ان کے اور عربوں کے درمیان شادی بیاہ تک کے تعلق قائم ہو چکے تھے ـــــ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انہوں نے اپنی یہودی عصبیت برقرار رکھی ـــــ یہ ظاہری عربیت انہوں نے صرف اس لیے اختیار کی کہ اس کے بغیر وہ عرب میں رہ نہ سکتے تھے۔''

☆......سید مودودیؒ نے بعض مستشرقین کے اس دعوی کو رد کیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل نہ تھے بلکہ یہودی مذہب قبول کرنے والے عرب تھے......مزید صراحت کی کہ یہودیوں نے عرب میں رہتے ہوئے اپنے مذہب کی تبلیغ نہیں کی کیونکہ ان کے اندر اسرائیلیت کا شدید تعصب اور نسلی فخر وغرور پایا جاتا تھا۔ اہل عرب کو وہ امی (GENTILES) کہتے تھے جس کے معنی صرف اَن پڑھ کے نہیں بلکہ وحشی اور جاہل کے تھے۔''

''حجاز میں یہودیت ایک دین کی حقیقت سے نہیں پھیلی بلکہ محض چند اسرائیلی قبیلوں کا سرمایہ فخر و ناز ہی بنی رہی۔ البتہ یہودی علماء نے تعویز گنڈوں اور فال گیری اور جادوگری کا کاروبار خوب چمکا رکھا تھا اس کی وجہ سے عربوں پر ان کے ''علم'' اور ''عمل'' کی دھاک بیٹھی ہوتی تھی۔''◆

☆......''معاشی حیثیت سے بھی یہود کی پوزیشن عرب قبائل کی نسبت زیادہ مضبوط تھی۔ وہ بہت سے ایسے فنون جانتے تھے جو اہل عرب میں رائج نہ تھے...... بالائی حجاز اور یثرب میں غلے کی درآمد اور یہاں سے چھوہاروں کی برآمد ان کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ مرغ بانی اور ماہی گیری پر بھی انہی کا زیادہ تر قبضہ تھا۔ پارچہ بافی کا کام بھی ان کے ہاں ہوتا

◆ کیا آج کی امت مسلمہ بھی اس قسم کے حالات سے دوچار نہیں؟ کہ پنجاب/ سندھ اور دیگر جگہوں پر چند قدیم بزرگوں کی اولاد ''قابض'' ہے اور عرسوں وغیرہ کے ذریعے نہ صرف سالانہ کروڑوں روپے جمع کرتے ہیں بلکہ سیاسی اثر رسوخ سے اسمبلیوں میں بھی پہنچ جاتے ہیں!

تھا۔ جگہ جگہ میخانے بھی انہوں نے قائم کر رکھے تھے جہاں شام سے شراب لا کر فروخت کی جاتی تھی۔ بنی قینقاع زیادہ تر سنار اور لوہار اور ظروف سازی کا پیشہ کرتے تھے ـــــ تاہم ان کا سب سے بڑا کاروبار سودخوری کا تھا جس کے جال میں شیوخ اور سردار، جنہیں قرض لے کر ٹھاٹھ جمانے اور شیخی بگھارنے کی بیماری لگی ہوئی تھی، گرد و پیش کی عرب آبادیوں کو پھانس رکھا تھا اور خاص طور پر عرب قبائل کو۔ یہ بھاری شرح سود پر قرضے دیتے تھے ـــــ بہرحال اس کا فطری نتیجہ یہ بھی تھا کہ عربوں میں بالعموم ان کے خلاف ایک گہری نفرت پائی جاتی تھی۔''

☆......''ان کے تجارتی مفادات کا تقاضا یہ تھا کہ عربوں میں کسی کے دوست بن کر کسی سے نہ بگاڑیں۔ تاہم وہ عربوں کو باہم متحد نہ ہونے دیتے تھے......یہی وجہ تھی کہ انہوں نے عرب قبیلوں میں سے کسی نہ کسی ایک کے ساتھ حلیفانہ تعلقات قائم کر لیے تھے۔ یثرب میں بنی قریظہ اور بنی نضیر، اوس کے حلیف تھے اور بنی قینقاع، خزرج کے۔ ہجرت سے تھوڑی مدت پہلے اوس و خزرج کے درمیان جو خوں ریز لڑائی بعاث کے مقام پر ہوئی تھی اس میں یہ اپنے اپنے حلیفوں کے ساتھ مل کر ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے۔ یاد رہے کہ عبداللہ بن ابی (رئیس المنافقین) بنی قینقاع کا حلیف تھا۔''

☆......''یہ حالات تھے جب مدینے میں اسلام پہنچا اور بالآخر رسول ﷺ کی تشریف آوری کے بعد وہاں ایک اسلامی ریاست قائم ہوئی۔ آپ ﷺ نے اولین کام یہ کیا اوس و خزرج اور مہاجرین کو ملا کر ایک برادری بنائی اور دوسرا یہ کہ مسلم معاشرے اور یہودیوں کے درمیان واضح شرائط پر ایک معاہدہ طے کیا۔ یہ طے پایا کہ کوئی کسی کے حقوق پر دست درازی نہ کرے گا اور بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں سب متحدہ دفاع کریں گے'' (معاہدے کی تفصیلات کیلئے دلچسپی رکھنے والے اصحاب تفہیم القرآن سے رجوع فرمائیں)۔

☆......''اگرچہ یہودیوں نے اس معاہدے کو قبول کیا تھا لیکن بہت جلدی انہوں نے اپنی معاندانہ روش کا اظہار شروع کیا جو روز بروز سخت سے سخت تر ہوتا چلا گیا۔''

☆......اس عناد اور بغض کی متعدد وجوہ تھیں۔ یہودیوں کو خیال تھا کہ یہ ایک سیاسی معاہدہ ہے لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے دین کی دعوت دینی شروع کی تو یہ چیز ان کو سخت ناگوار گزری۔ دوسرے اوس وخزرج اور مہاجرین کو بھائی بھائی بنتے دیکھ کر، ان کی صدیوں پھوٹ ڈالو اور زندہ رہو کی پالیسی ٹوٹتی نظر آئی۔ تیسرے یہ کہ کاروبار اور لین دین میں سود کی حرمت اور دیگر اخلاقی تعلیمات کا رواج ان کے لیے موت کا پیغام تھا۔''

''ان وجوہ سے انہوں نے حضور ﷺ کی مخالفت کو اپنا قومی نصب العین بنالیا۔ آپ کو زک دینے کے لیے کوئی چال، کوئی تدبیر اور کوئی ہتھکنڈا استعمال کرنے میں ان کو ذرہ برابر تامل نہ تھا۔ وہ آپ کے خلاف طرح طرح کی جھوٹی باتیں پھیلاتے تھے تاکہ لوگ آپ سے بدگمان ہوجائیں۔ اسلام قبول کرنے والوں کے دلوں میں ہر قسم کے شکوک وشبہات اور وسوسے ڈالتے تھے تاکہ وہ اس دین سے برگشتہ ہوجائیں۔ خود جھوٹ موٹ کا اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہوجاتے تھے تاکہ لوگوں میں اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف زیادہ سے زیادہ غلط فہمیاں پھیلائی جاسکیں۔ اوس اور خزرج کے لوگ خاص طور پر ان کے ہدف تھے جن سے ان کے مدتہائے دراز کے تعلقات چلے آرہے تھے۔ جنگ بُعاث کے تذکرے چھیڑ چھیڑ کر وہ ان کو پرانی دشمنیاں یاد دلانے کی کوشش کرتے تھے تاکہ ان کے درمیان پھر ایک دفعہ تلوار چل جائے اور اُخوت کا وہ رشتہ تار تار ہوجائے جس میں اسلام نے ان کو باندھ دیا تھا۔ مسلمانوں کو مالی حیثیت سے تنگ کرنے کے لیے بھی وہ ہر قسم کی دھاندلیاں کرتے تھے۔''

''معاہدے کے خلاف یہ کھلی کھلی معاندانہ روش تو جنگ بدر سے پہلے ہی وہ اختیار کرچکے تھے۔ مگر جب بدر میں رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو قریش پر فتح مبین حاصل ہوئی تو وہ تلملا اُٹھے اور ان کے بغض کی آگ اور زیادہ بھڑک اُٹھی۔ اس جنگ سے وہ یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ قریش کی طاقت سے ٹکرا کر مسلمانوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اسی لیے انہوں نے فتح اسلام کی خبر پہنچنے سے پہلے مدینے میں یہ افواہیں اڑانی شروع کردی

تھیں کہ رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے، اور مسلمانوں کو شکست فاش ہوئی۔ بنی نضیر کا سردار کعب بن اشرف چیخ اُٹھا کہ ''خدا کی قسم اگر محمد ﷺ نے ان اشرافِ عرب کو قتل کر دیا ہے تو زمین کا پیٹ ہمارے لیے اس کی پیٹھ سے زیادہ بہتر ہے، پھر وہ مکہ پہنچا اور بدر میں جو سردارانِ قریش مارے گئے تھے ان کے نہایت اشتعال انگیز مرثیے کہہ کر مکہ والوں کو انتقام پر اُکسایا۔ پھر مدینہ واپس آ کر اس نے اپنے دل کی جلن نکالنے کے لیے ایسی غزلیں کہنی شروع کیں جن میں مسلمان شرفاء کی بہو بیٹیوں کے ساتھ اظہارِ عشق کیا گیا تھا۔ آخر کار اس کی شرارتوں سے تنگ آ کر رسول اللہ ﷺ نے ربیع الاول ۳ھ میں محمد بن مسلمہ انصاری کو بھیج کر اسے قتل کرا دیا۔ (ابن سعد، ابن ہشام، تاریخ طبری)''

''یہودیوں کا پہلا قبیلہ جس نے اجتماعی طور پر جنگ بدر کے بعد کھلم کھلا اپنا معاہدہ توڑ دیا، بنی قینقاع تھا۔ یہ لوگ خود شہر مدینہ کے اندر ایک محلہ میں آباد تھے اور چونکہ یہ سنار، لوہار اور ظروف ساز تھے۔ اس لیے ان کے بازار میں اہل مدینہ کو کثرت سے جانا آنا پڑتا تھا۔ ان کو اپنی شجاعت پر بڑا ناز تھا۔ آہن گر ہونے کی وجہ سے ان کا بچہ بچہ مسلح تھا۔ سات سو مردانِ جنگی ان کے اندر موجود تھے۔ اور ان کو اس بات کا بھی زعم تھا کہ قبیلہ خزرج سے ان کے پرانے حلیفانہ تعلقات تھے اور خزرج کا سردار عبداللہ بن ابی ان کا پشتیبان تھا۔ بدر کے واقعہ سے یہ اس قدر مشتعل ہوئے کہ انہوں نے اپنے بازار میں آنے جانے والے مسلمانوں کو ستانا، اور خاص طور پر ان کی عورتوں کو چھیڑنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک روز ان کے بازار میں ایک مسلمان عورت کو برسرِ عام برہنہ کر دیا گیا۔ اس پر سخت جھگڑا ہوا اور ہنگامے میں ایک مسلمان اور ایک یہودی قتل ہو گیا۔ جب حالات اس حد کو پہنچ گئے تو رسول اللہ ﷺ ان کے محلہ میں تشریف لے گئے اور ان کو جمع کر کے آپ نے ان کو راہِ راست پر آنے کی تلقین فرمائی۔ مگر انہوں نے جواب دیا'' اے محمد ﷺ، تم نے شاید ہمیں بھی قریش سمجھا ہے؟ وہ لڑنا نہیں جانتے تھے، اس لیے تم نے انہیں مار لیا۔ ہم سے سابقہ پیش آئے گا تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ مرد کیسے ہوتے

ہیں۔ یہ گویا صاف صاف اعلانِ جنگ تھا۔ آخر کار رسول اللہ ﷺ نے شوال (اور بروایت بعض ذی القعدہ) ۳ھ کے آخر میں ان کے محلہ کا محاصرہ کرلیا۔ صرف پندرہ روز ہی یہ محاصرہ رہا تھا کہ انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور ان کے تمام قابل جنگ آدمی باندھ لیے گئے۔ اب عبداللہ بن ابی اُن کی حمایت کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے سخت اصرار کیا کہ آپ انہیں معاف کردیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اس کی درخواست قبول کرکے یہ فیصلہ فرمادیا کہ بنی قینقاع اپنا سب مال، اسلحہ اور آلاتِ صنعت چھوڑ کر مدینہ سے نکل جائیں۔''

''ان دو سخت اقدامات (یعنی بنی قینقاع کے اخراج اور کعب بن اشرف کے قتل) سے کچھ مدت تک یہودی اتنے خوف زدہ رہے کہ انہیں کوئی مزید شرارت کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مگر اس کے بعد شوال ۳ھ میں قریش کے لوگ جنگ بدر کا بدلہ لینے کے لیے بڑی تیاریوں کے ساتھ مدینہ پر چڑھ کر آئے اور ان یہودیوں نے دیکھا کہ قریش کی تین ہزار فوج کے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صرف ایک ہزار آدمی لڑنے کے لیے نکلے ہیں، اور ان میں سے بھی تین سو منافقین الگ ہو کر پلٹ آئے ہیں، تو انہوں نے معاہدے کی پہلی اور صریح خلاف ورزی اس طرح کی کہ مدینہ کی مدافعت میں آپ کے ساتھ شریک نہ ہوئے، حالانکہ وہ اس کے پابند تھے۔ پھر جب معرکہ اُحد میں مسلمانوں کو نقصان عظیم پہنچا تو ان کی جرأتیں اور بڑھ گئیں، یہاں تک کہ بنی نضیر نے رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کے لیے باقاعدہ ایک سازش کی جو عین وقت پر ناکام ہوگئی۔''

حضور اکرم ﷺ خون بہا کی ادائیگی کا ایک معاملہ چکانے کے لیے یہودیوں کی ایک بستی میں تشریف لے گئے وہاں انہوں نے آپ کو باتوں میں لگایا اور اندر ہی اندر یہ سازش کی کہ ایک شخص اُس مکان کی چھت پر سے آپ کے اوپر ایک بھاری پتھر گرادے جس کی دیوار کے سائے میں آپ تشریف فرما تھے۔ مگر قبل اس کے کہ وہ اپنی اس تدبیر پر عمل کرتے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو بروقت خبردار کردیا، اور آپ فوراً وہاں سے اٹھ کر مدینہ واپس تشریف لے آئے۔''

''اب ان کے ساتھ کسی رعایت کا سوال باقی نہ رہا۔حضور ﷺ نے ان کو بلا تاخیر یہ الٹی میٹم بھیج دیا کہ تم نے جو غداری کرنی چاہی تھی وہ میرے علم میں آ گئی ہے۔ لہٰذا دس دن کے اندر مدینہ سے نکل جائیں اس کے بعد اگر تم یہاں ٹھہرے رہے تو جو شخص بھی تمہاری بستی میں پایا جائے گا اس کی گردن ماردی جائے گی۔ دوسری طرف عبداللہ بن اُبی نے ان کو پیغام بھیجا کہ میں دو ہزار آدمیوں سے تمہاری مدد کروں گا اور بنی قریظہ اور بنی غطفان بھی تمہاری مدد کو آئیں گے،تم ڈٹ جاؤاور ہرگز اپنی جگہ نہ چھوڑو۔ اس جھوٹے بھروسے پر انہوں نے حضور ﷺ کے الٹی میٹم کا یہ جواب دیا کہ ہم یہاں سے نہیں نکلیں گے،آپ سے جو کچھ ہو سکے کر لیجیے۔ اس پر ربیع الاول ۴ھ میں رسول اللہ ﷺ نے ان کا محاصرہ کرلیا،اورصرف چندروز کے محاصرہ کے بعد(جس کی مدت بعض روایات میں چھ دن اور بعض میں پندرہ دن آئی ہے) وہ اس شرط پر مدینہ چھوڑ دینے کے لیے راضی ہوگئے کہ اسلحہ کے سوا جو کچھ بھی وہ اپنے اونٹوں پر لاد کر لے جاسکیں گے لے جائیں گے۔ اس طرح یہودیوں کے اس دوسرے شریر قبیلے سے مدینہ کی سرزمین خالی کرالی گئی۔ ان میں سے صرف دو آدمی مسلمان ہو کر یہاں ٹھہر گئے۔ باقی شام اور خیبر کی طرف نکل گئے۔''(تعارف سورہ حشر کا خلاصہ)

سورہ الصّف:

بنی اسرائیل کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے جب ہم سورہ الصّف تک پہنچتے ہیں تو آیت نمبر ۵ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ قول نقل فرمایا کہ:''اے میری قوم کے لوگو،تم کیوں مجھے اذیت دیتے ہو۔ حالانکہ تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔''

اس آیت کی تشریح میں سید مودودی نے جو نوٹ لکھا کہ اس میں بتایا گیا کہ''قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا نبی اور اپنا محسن ماننے کے باوجود کس کس طرح تنگ کیا کیا اور کیسی کیسی

بے وفائیاں ان کے ساتھ کیں۔ مثال کے طور پر البقرہ آیات ۵۱ تا ۵۵ ...... ۶۰، ۶۷ تا ۷۱، النساء ۳:۵، المائدہ ۲۰ تا ۲۶، الاعراف ۱۳۸ تا ۱۴۱۔ ۱۴۸ تا ۱۵۱، طہٰ ۸۶ تا ۹۸۔ بائبل میں خود یہودیوں کی اپنی بیان کردہ تاریخ بھی اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے۔ یہاں مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے بائبل کے حوالہ جات کی تفصیل درج کی ہے۔ ان واقعات کی طرف اشارہ کر کے مسلمانوں کو خبردار کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے کہ وہ اپنے نبی ﷺ کے ساتھ وہ روش اختیار نہ کریں جو بنی اسرائیل نے اپنے نبی کے ساتھ اختیار کی تھی ورنہ وہ اس انجام سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جس سے بنی اسرائیل دوچار ہوئے۔ (حاشیہ نمبر ۴)____ یہاں امت مسلمہ کے تمام طبقوں سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا ان کا طرز عمل ایسا ہے جس سے نبی ﷺ کو خوشی ہوتی ہو؟ ......اگر ہم سب امتی ایمانداری کے ساتھ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں تو اس کا جواب کروڑوں میں ایک فرد بھی اثبات میں نہیں دے سکتا

دل مردہ دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ!

سورہ الجمعۃ:

مدینہ منورہ میں نازل ہونے والی سورت اس لحاظ سے بہت ہی اہم امور پر مشتمل ہے جس میں یہودیوں کے بارے میں بہت ہی ضروری معلومات پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس سورت کے زمانۂ نزول کے بارے میں سید مودودیؒ نے لکھا:

> ''پہلے رکوع کا زمانۂ نزول ۷ھ ہے، اور غالباً یہ فتح خیبر کے موقع پر یا اس کے بعد قریبی زمانے میں نازل ہوا ہے۔ بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی اور ابن جریر نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم حضور ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے جب یہ آیات نازل ہوئیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ صلح حدیبیہ کے بعد

اور فتح خیبر سے پہلے ایمان لائے تھے۔ پس قرین قیاس یہ ہے کہ یہودیوں کے اس آخری گڑھ کو فتح کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو خطاب کرتے ہوئے یہ آیات نازل فرمائی ہوں گی، یا پھر ان کا نزول اس وقت ہوا ہوگا جب خیبر کا انجام دیکھ کر شمالی حجاز کی تمام یہودی بستیاں اسلامی حکومت کی تابع فرمان بن گئی تھیں۔'' (تعارف سورہ الجمعہ)

''دوسرا رکوع ہجرت کے بعد قریبی زمانے ہی میں نازل ہوا ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ نے مدینہ طیبہ پہنچتے ہی پانچویں روز جمعہ قائم کر دیا تھا، اور اس رکوع کی آخری آیت میں جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ صاف بتا رہا ہے کہ وہ اقامت جمعہ کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد لازماً کسی ایسے زمانے ہی میں پیش آیا ہوگا جب لوگوں کو دینی اجتماعات کے آداب کی پوری تربیت ابھی نہیں ملی تھی۔'' (تعارف سورہ الجمعہ)

''اس سورہ کے دو رکوع دو الگ زمانوں میں نازل ہوئے ہیں۔ اسی لیے دونوں کے موضوع الگ ہیں اور مخاطب بھی الگ اگرچہ ان کے درمیان ایک نوع کی مناسبت ہے جس کی بنا پر انہیں ایک سورہ میں جمع کیا گیا ہے، لیکن مناسبت سے پہلے ہمیں دونوں کے موضوعات کو الگ الگ سمجھ لینا چاہیے۔''

سید مودودیؒ نے اس سورۃ کے تعارف میں مزید لکھا کہ ''پہلا رکوع اس وقت نازل ہوا جب یہودیوں کی وہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں جو اسلام کی دعوت کا راستہ روکنے کے لیے پچھلے چھ سال کے دوران میں انہوں نے کی تھیں۔ پہلے مدینہ میں ان کے تین تین طاقتور قبیلے رسول اللہ ﷺ کو نیچا دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی تک کا زور لگاتے رہے اور نتیجہ یہ دیکھا کہ ایک قبیلہ پوری طرح تباہ ہوگیا اور دو قبیلوں کو جلا وطن ہونا پڑا۔ پھر وہ سازشیں کر کے عرب کے بہت سے قبائل کو مدینے پر چڑھا لائے، مگر غزوہ احزاب میں ان سب نے منہ کی کھائی۔ اس کے بعد ان کا سب سے بڑا گڈھ خیبر رہ گیا تھا جہاں مدینہ سے

نکلے ہوئے یہودیوں کی بھی بڑی تعداد جمع ہوگئی تھی۔ ان آیات کے نزول کے وقت وہ بھی بغیر کسی غیر معمولی زحمت کے فتح ہوگیا، اور یہودیوں نے خود درخواست کرکے وہاں مسلمانوں کے کاشتکاروں کی حیثیت سے رہنا قبول کرلیا۔ اس آخری شکست کے بعد عرب میں یہودی طاقت کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔ وادی القریٰ، فدک، تیما، تبوک، سب ایک ایک کرکے ہتھیار ڈالتے چلے گئے، یہاں تک کہ عرب کے تمام یہودی اُسی اسلام کی رعایا بن کر رہ گئے جس کے وجود کو برداشت کرنا تو درکنار، جس کا نام سننا تک انہیں گوارا نہ تھا۔ یہ موقع تھا جب اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں ایک مرتبہ پھر ان کو خطاب فرمایا، اور غالباً یہ آخری خطاب تھا جو قرآنِ مجید میں ان سے کیا گیا۔ اس میں انہیں مخاطب کرکے تین باتیں فرمائی گئی ہیں:''

(۱)''تم نے اس رسول کو اس لیے ماننے سے انکار کیا کہ یہ اس قوم میں مبعوث ہوا تھا جسے تم حقارت کے ساتھ ''اُمی'' کہتے ہو۔ تمہارا زعم باطل یہ تھا کہ رسول لازماً تمہاری اپنی قوم ہی کا ہونا چاہیے۔ تم یہ فیصلہ کیے بیٹھے تھے کہ تمہاری قوم سے باہر کا جو شخص رسالت کا دعویٰ کرے وہ ضرور جھوٹا ہے، کیونکہ یہ منصب تمہاری نسل کے لیے مختص ہو چکا ہے اور ''امیوں'' میں کبھی کوئی رسول نہیں آسکتا۔ لیکن اللہ نے انہی اُمیوں میں سے ایک رسول اٹھایا ہے جو تمہاری آنکھوں کے سامنے اس کی کتاب سنا رہا ہے، نفوس کا تزکیہ کر رہا ہے، اور ان لوگوں کو ہدایت دے رہا ہے جن کی گمراہی کا حال تم خود جانتے ہو۔''

(۲)''تم کو توراۃ کا حامل بنایا گیا تھا، مگر تم نے اس کی ذمہ داری نہ سمجھی، نہ ادا کی۔ تمہارا حال اس گدھے کا سا ہے جس کی پیٹھ پر کتابیں لدی ہوئی ہوں اور اسے کچھ نہیں معلوم کہ وہ کس چیز کا بار اٹھائے ہوئے ہے۔ بلکہ تمہاری حالت گدھے سے بھی بدتر ہے۔ وہ تو سمجھ بوجھ نہیں رکھتا، مگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو اور پھر کتاب اللہ کے حامل ہونے کی ذمہ داری سے فرار ہی نہیں کرتے، دانستہ اللہ کی آیات کو جھٹلانے سے بھی باز نہیں رہتے۔ اور اس پر تمہارا زعم یہ ہے کہ تم اللہ کے چہیتے ہو اور رسالت کی نعمت ہمیشہ کے لیے تمہارے نام لکھ دی گئی ہے۔ گویا تمہاری رائے یہ ہے کہ خواہ تم اللہ کے پیغام کا حق ادا کرو یا نہ کرو،

بہرحال اللہ اس کا پابند ہے کہ وہ اپنے پیغام کا حامل تمہارے سوا کسی کو نہ بنائے!''

(۳) ''تم اگر واقعی اللہ کے چہیتے ہوتے اور تمہیں اگر یقین ہوتا کہ اس کے ہاں تمہارے لیے بڑی عزت اور قدر و منزلت کا مقام محفوظ ہے تو تمہیں موت کا ایسا خوف نہ ہوتا کہ ذلت کی زندگی قبول ہے مگر موت کسی طرح قبول نہیں۔ یہی موت کا خوف ہی تو ہے جس کی بدولت پچھلے چند سالوں میں تم شکست پر شکست کھاتے چلے گئے ہو۔ تمہاری یہ حالت آپ ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اپنے کرتوتوں سے تم خود واقف ہو۔ اور تمہارا ضمیر خوب جانتا ہے کہ ان کرتوتوں کے ساتھ مرو گے تو اللہ کے ہاں اس سے زیادہ ذلیل و خوار ہو گے جتنے دنیا میں ہو رہے ہو۔''

☆...... ''یہ ہے پہلے رکوع کا مضمون۔ اس کے بعد دوسرا رکوع، جو کئی سال پہلے نازل ہوا تھا اس سورہ میں لا کر اس لیے شامل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے سبت کے مقابلہ میں مسلمانوں کو جمعہ عطا فرمایا ہے، اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو متنبہ فرمانا چاہتا ہے کہ وہ اپنے جمعہ کے ساتھ وہ معاملہ نہ کریں جو یہودیوں نے سبت کے ساتھ کیا تھا۔

آیات ۲ تا ۴ میں فرمایا گیا کہ

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ (الجمعہ آیت ۲)

''وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا، جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے اور ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

ان آیات کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ حدید، حواشی نمبر ۱، ۲، الحشر، حواشی ۳۶، ۷، ۴۳، ۴۱۔ آگے کے مضمون سے یہ تمہید بڑی گہری مناسبت رکھتی ہے۔

اس کی تشریح حاشیہ نمبر ۱ میں یوں کی گئی ہے عرب کے یہودی رسول اللہ ﷺ کی

ذات وصفات اور کارناموں میں رسالت کی صریح نشانیاں بچشم سر دیکھ لینے کے باوجود، اوراس کے باوجود کہ توراۃ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آپ کے آنے کی صریح بشارت دی تھی جو آپ کے سوا کسی اور پر چسپاں نہیں ہوتی تھی، صرف اس بنا پر آپ کا انکار کر رہے تھے کہ اپنی قوم اور نسل سے باہر کے کسی شخص کی رسالت مان لینا انہیں سخت ناگوار تھا۔ وہ صاف کہتے تھے کہ جو کچھ ہمارے ہاں آیا ہے ہم صرف اسی کو مانیں گے۔ دوسری کسی تعلیم کو، جو کسی غیر اسرائیلی نبی کے ذریعہ سے آئے، خواہ وہ خدا ہی کی طرف سے ہو، تسلیم کرنے کے لیے وہ قطعی تیار نہ تھے۔ آگے کی آیتوں میں اسی رویہ پر انہیں ملامت کی جا رہی ہے، اس لیے کلام کا آغاز اس تمہیدی فقرے سے کیا گیا ہے۔ اس میں پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کر رہی ہے۔ یعنی یہ پوری کائنات اس بات پر شاہد ہے کہ اللہ ان تمام نقائص اور کمزوریوں سے پاک ہے جن کی بنا پر یہودیوں نے اپنی نسلی برتری کا تصور قائم کر رکھا ہے کہ وہ کسی کا رشتہ دار نہیں ہے۔ جانب داری (Favouritism) کا اس کے ہاں کوئی کام نہیں۔ اپنی ساری مخلوق کے ساتھ اس کا معاملہ یکساں عدل اور رحمت اور ربوبیت کا ہے۔ کوئی خاص نسل اور قوم اس کی چہیتی نہیں ہے کہ وہ خواہ کچھ کرے بہر حال اس کی نوازشیں اسی کے لیے مخصوص رہیں، اور کسی دوسری نسل یا قوم سے اس کو عداوت نہیں ہے کہ وہ اپنے اندر خوبیاں بھی رکھتی ہو تو وہ اس کی عنایات سے محروم رہے۔ پھر فرمایا گیا کہ وہ بادشاہ ہے، یعنی دنیا کی کوئی طاقت اس کے اختیارات کو محدود کرنے والی نہیں ہے۔ تم بندے اور رعیت ہو۔ تمہارا یہ منصب کب سے ہو گیا کہ تم یہ طے کرو وہ تمہاری ہدایت کے لیے اپنا پیغمبر کسے بنائے اور کسے نہ بنائے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ وہ قدوس ہے۔ یعنی اس سے بدر جہا منزہ اور پاک ہے کہ اس کے فیصلے میں کسی خطا اور غلطی کا امکان ہو۔ غلطی تمہاری سمجھ بوجھ میں ہوسکتی ہے۔ اس کے فیصلے میں نہیں ہوسکتی۔ آخر میں اللہ تعالیٰ کی دو مزید صفتیں بیان فرمائی گئیں۔ ایک یہ کہ وہ زبردست ہے، یعنی اس سے لڑ کر کوئی جیت نہیں سکتا۔ دوسری یہ کہ وہ حکیم ہے، یعنی جو کچھ

کرتا ہے وہ عین مقتضائے دانش ہوتا ہے، اور اس کی تدبیریں ایسی محکم ہوتی ہیں کہ دنیا میں کوئی ان کا توڑ نہیں کرسکتا۔'' (حاشیہ نمبر ۱)

''سید مودودیؒ نے مزید واضح کیا کہ یہاں اُمی کا لفظ یہودی اصطلاح کے طور پر آیا، اور اس میں ایک لطیف طنز پوشیدہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن کو یہودی حقارت کے ساتھ اُمی کہتے ہیں اور اپنے مقابلہ میں ذلیل سمجھتے ہیں، اُنہی میں اللہ غالب و دانا نے ایک رسول اٹھایا ہے۔ وہ خود نہیں اُٹھ کھڑا ہوا ہے بلکہ اس کا اٹھانے والا وہ ہے جو کائنات کا بادشاہ ہے، زبردست اور حکیم ہے، جس کی قوت سے لڑ کر یہ لوگ اپنا ہی کچھ بگاڑیں گے، اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔'' اس ضمن میں حاشیہ ۲ میں مزید لکھا کہ ''معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن مجید میں ''اُمی'' کا لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے اور سب جگہ اس کے معنی ایک ہی نہیں ہیں بلکہ مختلف مواقع پر وہ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہیں وہ اہل کتاب کے مقابلہ میں ان لوگوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں ہے جس کی پیروی وہ کرتے ہوں۔ مثلاً فرمایا وَ قُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ (آل عمران: ۲۰) ''پھر اہلِ کتاب اور غیر اہل کتاب دونوں سے پوچھو'' کیا تم نے بھی اس کی اطاعت و بندگی قبول کی؟'' یہاں اُمیوں سے مراد مشرکین عرب ہیں، اور ان کو اہل کتاب، یعنی یہود و نصاریٰ سے الگ ایک گروہ قرار دیا گیا ہے۔ کسی جگہ یہ لفظ خود اہل کتاب کے اَن پڑھ اور کتاب اللہ سے ناواقف لوگوں کے لیے استعمال ہوا ہے جیسے فرمایا: وَ مِنْهُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِیَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ۝ (البقرہ: ۷۸) ''ان میں ایک دوسرا گروہ امیوں کا ہے، جو کتاب کا تو علم رکھتے نہیں، بس اپنی بے بنیاد امیدوں اور آرزؤں کو لیے بیٹھے ہیں اور محض وہم گمان پر چلے جا رہے ہیں۔'' اور کسی جگہ یہ لفظ خالص یہودی اصطلاح کے طرز پر استعمال ہوا ہے جس سے مراد دنیا کے تمام غیر یہودی ہیں۔ مثلاً فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ ۚ (آل عمران: ۷۵) ''کہ وہ کہتے ہیں کہ امیوں (غیر یہودی لوگوں) کے معاملے میں ہم پر

کوئی مواخذہ نہیں ہے'' یعنی ان کے اندر یہ بد دیانتی پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں امیوں کا مال مار کھانے میں ہم پر کوئی گرفت نہیں ہے۔'' یہی تیسرے معنی ہیں جو آیت زیر بحث میں مراد لیے گئے ہیں۔ یہ لفظ عبرانی زبان کے لفظ گوئیم کا ہم معنی ہے، جس کا ترجمہ انگریزی بائبل میں Gentiles کہا گیا ہے اور اس سے مراد تمام غیر یہودی یا غیر اسرائیلی لوگ ہیں۔'' (حاشیہ نمبر ۲)

''لیکن اس یہودی اصطلاح کی اصل معنویت محض اس کی اس تشریح سے سمجھ میں نہیں آسکتی۔ دراصل عبرانی زبان کا لفظ گوئیم ابتداءً محض اقوام کے معنی میں بولا جاتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہودیوں نے اسے پہلے تو اپنے سوا دوسری قوموں کے لیے مخصوص کر دیا، پھر اس کے اندر یہ معنی پیدا کر دیے کہ یہودیوں کے سوا باقی تمام اقوام ناشائستہ بدمذہب، ناپاک اور ذلیل ہیں، حتیٰ کہ حقارت اور نفرت میں یہ لفظ یونانیوں کی اصطلاح Barbarian سے بھی بازی لے گیا جسے وہ تمام غیر یونانیوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ربیوں کے لٹریچر میں گوئیم اس قدر قابلِ نفرت لوگ ہیں ان کو انسانی بھائی نہیں سمجھا جاسکتا، ان کے ساتھ سفر نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اگر ان میں سے کوئی شخص ڈوب رہا ہو تو اسے بچانے کی کوشش بھی نہیں کی جاسکتی۔ یہودیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ آنے والا مسیح تمام گوئیم کو ہلاک کر دے گا اور جلا کر خاکستر کر ڈالے گا (حاشیہ نمبر ۲) (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، آل عمران، حاشیہ ۶۴)۔''

آیت نمبر ۳ کی مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ نے حاشیہ نمبر ۳ میں لکھا کہ ''قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کی یہ صفات چار مقامات پر بیان کی گئی ہیں، اور ہر جگہ ان کے بیان کی غرض مختلف ہے۔ البقرہ آیت ۱۲۹ میں ان کا ذکر اہلِ عرب کو یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ آنحضور ﷺ کی بعثت، جسے وہ اپنے لیے زحمت و مصیبت سمجھ رہے تھے، درحقیقت ایک بڑی نعمت ہے جس کے لیے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام اپنی اولاد کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگا کرتے تھے۔ البقرہ آیت

۱۵۱ میں انہیں اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ مسلمان حضور ﷺ کی قدر پہچانیں اور اس نعمت سے پورا پورا فیض حاصل کریں جو حضور ﷺ کی بعثت کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائی ہے۔ آلِ عمران آیت ۱۶۴ میں منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کو یہ احساس دلانے کے لیے ان کا اعادہ کیا گیا ہے کہ وہ کتنا بڑا احسان ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان اپنا رسول بھیج کر کیا ہے اور یہ لوگ کتنے نادان ہیں کہ اس کی قدر نہیں کرتے۔ اب چوتھی مرتبہ انہیں اس سورہ میں دہرایا گیا ہے جس سے مقصود یہودیوں کو یہ بتانا ہے کہ محمد ﷺ تمہاری آنکھوں کے سامنے جو کام کر رہے ہیں وہ صریحاً ایک رسول کا کام ہے۔ وہ اللہ کی آیات سنا رہے ہیں جن کی زبان، مضامین، اندازِ بیان، ہر چیز اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ فی الواقع وہ اللہ ہی کی آیات ہیں۔ وہ لوگوں کی زندگیاں سنوار رہے ہیں، ان کے اخلاق اور عادات اور معاملات کو ہر طرح کی گندگیوں سے پاک کر رہے ہیں، اور ان کو اعلیٰ درجے کے اخلاقی فضائل سے آراستہ کر رہے ہیں۔ یہ وہی کام ہے جو اس سے پہلے تمام انبیاء کرتے رہے ہیں۔ پھر وہ صرف آیات ہی سنانے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ہر وقت اپنے قول اور عمل سے اور اپنی زندگی کے نمونے سے لوگوں کو کتابِ الٰہی کا منشا سمجھا رہے ہیں اور ان کو اس حکمت و دانائی کی تعلیم دے رہے ہیں جو انبیاء کے سوا آج تک کسی نے نہیں دی ہے۔ یہی سیرت اور کردار اور کام ہی تو انبیاء کا وہ نمایاں وصف ہے جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ پھر یہ کیسی ہٹ دھرمی ہے کہ جس کا رسولِ برحق ہونا اس کے کارناموں سے ثابت ہو رہا ہے اس کو ماننے سے تم نے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ اللہ نے اسے تمہاری قوم کے بجائے اس قوم میں سے اٹھایا جسے تم اُمی کہتے ہو۔'' (حاشیہ نمبر ۳)

سورہ جمعہ کی آیت ۲ کے تشریحی حاشیہ نمبر ۴ میں وضاحت کی ''یہ حضور ﷺ کی رسالت کا ایک اور ثبوت ہے جو یہودیوں کی آنکھوں کھولنے کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ یہ لوگ صدیوں سے عرب کی سرزمین میں آباد تھے اور اہل عرب کی مذہبی، اخلاقی، معاشرتی، اور تمدنی زندگی کا کوئی گوشہ ان سے چھپا ہوا نہ تھا۔ ان کی اس سابق حالت کی

طرف اشارہ کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ چند سال کے اندر محمد ﷺ کی قیادت و رہنمائی میں اس قوم کی جیسی کایا پلٹ گئی ہے اس کے تم عینی شاہد ہو۔ تمہارے سامنے وہ حالت بھی ہے جس میں یہ لوگ اسلام قبول کرنے سے پہلے مبتلا تھے۔ وہ حالت بھی ہے جو اسلام لانے کے بعد ان کی ہوگئی اور اسی قوم کے ان لوگوں کی حالت بھی تم دیکھ رہے ہو جنہوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا ہے۔ کیا یہ کھلا کھلا فرق جسے ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے، تمہیں یہ یقین دلانے کے لیے کافی نہیں ہے کہ یہ ایک نبی کے سوا کسی کا کارنامہ نہیں ہو سکتا؟ بلکہ اس کے سامنے تو پچھلے انبیاء تک کے کارنامے ماند پڑ گئے ہیں۔''

مزید لکھا کہ ''محمد ﷺ کی رسالت صرف عرب قوم تک محدود نہیں ہے بلکہ دنیا بھر کی ان دوسری قوموں اور نسلوں کے لیے بھی ہے جو ابھی آ کر اہل ایمان میں شامل نہیں ہوئی ہیں مگر آگے قیامت تک آنے والی ہیں۔ اصل الفاظ ہیں: **وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ** ''دوسرے لوگ اُن میں سے جو ابھی اُن سے نہیں ملے ہیں۔'' اس میں لفظ **مِنْهُمْ** (ان میں سے) کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دوسرے لوگ اُمیوں میں سے، یعنی دنیا کی غیر اسرائیلی قوموں میں سے ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ وہ محمد ﷺ کو ماننے والے ہوں گے جو ابھی اہلِ ایمان میں شامل نہیں ہوئے ہیں مگر بعد میں آ کر شامل ہو جائیں گے۔ اس طرح **یہ آیت منجملہ ان آیات کے ہے جن میں تصریح کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت تمام نوع انسانی کی طرف ہے اور ابد تک کے لیے ہے۔** قرآنِ مجید کے دوسرے مقامات جہاں اس مضمون کی صراحت کی گئی ہے، حسب ذیل ہیں: الانعام، آیت ۱۹۔ الاعراف: ۱۵۸۔ الانبیاء: ۱۰۷۔ الفرقان، ۱۔ سباء: ۲۸ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ سبا، حاشیہ ۴۷)'' (حاشیہ نمبر ۵)

مفتی محمد شفیعؒ نے اپنی تفسیر (۲۰۱۱ ص ۴۳۴) میں لکھا کہ لفظ ''امیین'' اُمی کی جمع ہے، ناخواندہ شخص کو کہا جاتا ہے۔ عرب کے لوگ اس لقب سے معروف ہیں کیونکہ ان میں نوشت و خواند کا رواج نہیں تھا بہت کم آدمی لکھے پڑھے ہوتے تھے۔ اس آیت میں حق

تعالیٰ کی عظیم قدرت کے اظہار کے لئے خاص طور پر عربوں کے لیے یہ لقب اختیار فرمایا اور یہ بھی کہ جو رسول بھیجا گیا وہ بھی انہی میں سے ہے یعنی اُمی ہے۔ اس لیے یہ معاملہ بڑا حیرت انگیز ہے کہ قوم ساری اُمی اور جو رسول بھیجا گیا وہ بھی امی اور جو فرائض اس رسول کے سپرد کیے گئے جن کا ذکر اگلی آیت میں آرہا ہے وہ سب تعلیمی اصلاحی ایسے ہیں کہ نہ کوئی امی ان کو سکھا سکتا ہے اور نہ امی قوم ان کو سیکھنے کے قابل ہے''

''آیت ۵ تا ٦ میں ایک نہایت ہی نادر مثال کے ذریعے بنی اسرائیل کے عوام اور اہل علم و دیگر خواص کو تشبیہ دی گئی ہے۔ حاشیہ نمبر ۷ / ۸ / ۹ اور ۱۰ میں یوں تشریح کی۔

''اس فقرے کے دو معنی ہیں۔ ایک عام اور دوسرا خاص۔ عام معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں پر توراۃ کے علم و عمل، اور اس کے مطابق دنیا کی ہدایت کا بار رکھا گیا تھا، مگر نہ انہوں نے اپنی اس ذمہ داری کو سمجھا اور نہ اس کا حق ادا کیا۔ خاص معنی یہ ہیں کہ حامل توراۃ گروہ ہونے کی حیثیت سے جن کا کام یہ تھا کہ سب سے پہلے آگے بڑھ کر اس رسول کا ساتھ دیتے جس کے آنے کی صاف صاف بشارت توراۃ میں دی گئی تھی، مگر انہوں نے سب سے بڑھ کر اس کی مخالفت کی اور توراۃ کی تعلیم کے تقاضے کو پورا نہ کیا۔''

''یعنی جس طرح گدھے پر کتابیں لدی ہوں اور وہ نہیں جانتا کہ اس کی پیٹھ پر کیا ہے، اسی طرح یہ توراۃ کو اپنے اوپر لادے ہوئے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ کتاب کس لیے آئی ہے اور ان سے کیا چاہتی ہے۔'' (حاشیہ نمبر ۸)

''یعنی ان کا حال گدھے سے بھی بدتر ہے۔ وہ تو سمجھ بوجھ نہیں رکھتا اس لیے معذور ہے۔ مگر یہ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ توراۃ کو پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ اس کے معنی سے ناواقف نہیں ہیں۔ پھر بھی یہ اس کی ہدایات سے دانستہ انحراف کر رہے ہیں، اور اس نبی کو ماننے سے قصداً انکار کر رہے ہیں جو توراۃ کی رو سے سراسر حق پر ہے۔ یہ نافہمی کے قصوروار نہیں ہیں بلکہ جان بوجھ کر اللہ کی آیات کو جھٹلانے کے مجرم ہیں۔'' (حاشیہ نمبر ۹)

اگلی آیات کی تفصیل میں کہا ''یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے ''اے یہودیو'' نہیں کہا ہے کہ بلکہ

''اے وہ لوگو جو یہودی بن گئے ہو'' یا ''جنہوں نے یہودیت اختیار کر لی ہے۔'' فرمایا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل دین جو موسیٰ علیہ السلام اور ان سے پہلے اور بعد کے انبیاء لائے تھے وہ تو اسلام ہی تھا۔ان انبیاء میں سے کوئی بھی یہودی نہ تھا اور نہ ان کے زمانے میں یہودیت پیدا ہوئی تھی۔ یہ مذہب اس نام کے ساتھ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ یہ اس خاندان کی طرف منسوب ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے چوتھے بیٹے یہوداہ کی نسل سے تھا۔حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد جب سلطنت دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی تو یہ خاندان اس ریاست کا مالک ہوا جو یہودیہ کے نام سے موسوم ہوئی،اور بنی اسرائیل کے دوسرے قبیلوں نے اپنی الگ ریاست قائم کر لی جو سامریہ کے نام سے مشہور ہوئی۔پھر اسیریا نے نہ صرف یہ کہ سامریہ کو برباد کر دیا بلکہ ان اسرائیلی قبیلوں کا بھی نام ونشان مٹا دیا جو اس ریاست کے بانی تھے۔اس کے بعد صرف یہوداہ اور اس کے ساتھ بن یامین کی نسل باقی رہ گئی جس پر یہوداہ کی نسل کے غلبے کی وجہ سے ''یہود'' ہی کے لفظ کا اطلاق ہونے لگا۔اس نسل کے اندر کاہنوں اور ربیوں اور احبار نے اپنے اپنے خیالات ونظریات اور رجحانات کے مطابق عقائد اور رسوم اور مذہبی ضوابط کا جو ڈھانچہ صدہا برس میں تیار کیا اس کا نام یہودیت ہے یہ ڈھانچہ چوتھی صدی قبل مسیح سے بننا شروع ہوا اور پانچویں صدی عیسوی تک بنتا رہا۔اللہ کے رسولوں کی لائی ہوئی ربانی ہدایت کا بہت تھوڑا ہی عنصر اس میں شامل ہے۔اور اس کا حلیہ بھی اچھا خاصا بگڑ چکا ہے۔اسی بنا پر قرآن مجید میں اکثر مقامات پر ان کو الَّذِيْنَ هَادُوْا کہہ کر خطاب کیا گیا ہے،یعنی ''اے وہ لوگو جو یہودی بن کر رہ گئے ہو۔'' ان میں سب کے سب اسرائیلی ہی نہ تھے، بلکہ وہ غیر اسرائیلی لوگ بھی تھے جنہوں نے یہودیت قبول کر لی تھی۔قرآن میں جہاں بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا ہے وہاں ''اے بنی اسرائیل'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور جہاں مذہب یہود کے پیروؤں کو خطاب کیا گیا ہے وہاں اَلَّذِيْنَ هَادُوْا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔'' (سورہ الجمعہ حاشیہ ۱۰)

آیات نمبر ۵ میں یہود کا (حاشیہ ۱۱) تادیر زندگی مانگنا اور ان کے دعوی اللہ رب

العزت کا چہیتا ہونے پر گرفت حاشیہ نمبر ۱۱ میں کی گئی جو درج ذیل ہے۔

''قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ان کے اس دعوے کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں یہودیوں کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا (البقرہ:۱۱۱)۔ ہمیں دوزخ کی آگ ہرگز نہ چھوئے گی، اگر ہم کو سزا ملے گی تو بس چند روز (البقرہ: ۸۰۔ آل عمران: ۲۴)۔ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں (المائدہ:۱۸)۔ ایسے ہی کچھ دعوے خود یہویوں کی اپنی کتابوں میں بھی ملتے ہیں۔ کم از کم یہ بات تو ساری دنیا جانتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا فیصلہ کی برگزیدہ مخلوق (Chosen People) کہتے ہیں اور اس زعم میں مبتلا ہیں کہ خدا کا ان کے ساتھ ایک خاص رشتہ ہے جو کسی دوسرے انسانی گروہ سے نہیں ہے۔''

مزید حاشیہ ۱۲ میں لکھا کہ ''یہ بات قرآن مجید میں دوسری مرتبہ یہودیوں کو خطاب کر کے کہی گئی ہے۔ پہلے سورۂ بقرہ میں تھا ''ان سے کہو، اگر آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لیے اللہ کے ہاں مخصوص ہے تو پھر موت کی تمنا کرو اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو۔ لیکن یہ ہرگز اس کی تمنا نہ کریں گے اپنے اُن کرتوتوں کی وجہ سے جو یہ کر چکے ہیں، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ بلکہ تم تمام انسانوں سے بڑھ کر، حتیٰ کہ مشرکین سے بھی بڑھ کر اُن کو کسی نہ کسی طرح جینے کا حریص پاؤ گے۔ ان میں سے کوئی یہ چاہتا ہے کہ ہزار برس جیے، حالانکہ وہ لمبی عمر پائے تب بھی اسے یہ چیز عذاب سے نہیں بچا سکتی۔ ان کے سارے کرتوت اللہ کی نظر میں ہیں۔'' (آیات: ۹۴۔ ۹۶)۔ اب اسی بات کو پھر یہاں دہرایا گیا ہے۔ لیکن یہ محض تکرار نہیں ہے۔ سورۂ بقرہ والی آیات میں یہ بات اس وقت کہی گئی تھی جب یہودیوں سے مسلمانوں کی کوئی جنگ نہ ہوئی تھی۔ اور اس سورۃ میں اس کا اعادہ اُس وقت کیا گیا ہے جب ان کے ساتھ متعدد معرکے پیش آنے کے بعد عرب میں آخری اور قطعی طور پر ان کا زور توڑ دیا گیا۔ ان معرکوں نے، اور ان کے اس انجام نے وہ بات تجربے اور مشاہدے سے ثابت کر دی جو پہلے سورۂ بقرہ میں کہی گئی تھی۔ مدینے اور خیبر میں یہودی طاقت بلحاظ تعداد مسلمانوں سے کسی طرح کم نہ تھی، اور بلحاظ وسائل

ان سے بہت زیادہ تھی۔ پھر عرب کے مشرکین اور مدینے کے منافقین بھی اُن کی پشت پر تھے اور مسلمانوں کو مٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ لیکن جس چیز نے اس نامساوی مقابلے میں مسلمانوں کو غالب اور یہودیوں کو مغلوب کیا وہ یہ تھی کہ مسلمان راہِ خدا میں مرنے سے خائف تو درکنار، تہ دل سے اس کے مشتاق تھے اور سر ہتھیلی پر لیے ہوئے میدانِ جنگ میں اُترتے تھے۔ کیونکہ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ وہ خدا کی راہ میں لڑ رہے ہیں، اور وہ اس بات پر بھی کامل یقین رکھتے تھے کہ اس میں شہید ہونے والے کے لیے جنت ہے۔ اس کے برعکس یہودیوں کا حال یہ تھا کہ وہ کسی راہ میں بھی جان دینے کے لیے تیار نہ تھے، نہ خدا کی راہ میں، نہ قوم کی راہ میں، نہ خود اپنی جان اور مال اور عزت کی راہ میں۔ انہیں صرف زندگی درکار تھی، خواہ وہ کیسی ہی زندگی ہو۔ اسی چیز نے ان کو بزدل بنا دیا تھا۔'' (حاشیہ نمبر ۱۲)

سورہ النزعت

مکی سورت کی بناء پر عقیدۂ آخرت کے بارے میں تفصیلاً راہ نمائی دی گئی ہے۔ اسی ضمن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کو آیت نمبر ۱۵ تا ۲۶ بیان کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کو اسلام کی دعوت دی تو اس نے جھٹلا دیا اور نہ مانا۔ پھر وہ چالبازیاں کرنے لگا اور کہنے لگا کہ میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں (مفہوم آیات)۔ اس پر سید مودودیؒ نے حاشیہ نمبر ۸ تا ۱۱ میں یوں تشریح کی:

(۱) ''حضرت موسیٰ کو منصبِ نبوت پر مقرر کرتے وقت جو باتیں ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوئی تھیں ان کو قرآنِ مجید میں حسب موقع کہیں مختصر اور کہیں مفصل بیان کیا گیا ہے۔ یہاں موقع اختصار کا طالب تھا، اس لیے ان کا صرف خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ طٰہٰ آیات ۹ تا ۴۸، سورۂ شعراء آیات ۱۰ تا ۱۷، سورۂ نمل، آیات ۷ تا ۱۲، اور سورۂ قصص، آیات ۲۹ تا ۳۵ میں ان کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔''

(۲) ''فرعون کی جس سرکشی کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خالق اور خلق، دونوں کے مقابلے میں سرکشی کرنا ہے۔ خالق کے مقابلے میں

اس کی سرکشی کا ذکر تو آگے آ رہا ہے کہ اس نے اپنی رعیت کو جمع کر کے اعلان کیا کہ ''میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔'' اور خلق کے مقابلے میں اس کی سرکشی یہ تھی کہ اس نے اپنی مملکت کے باشندوں کو مختلف گروہوں اور طبقوں میں بانٹ رکھا تھا، کمزور طبقوں پر دہ سخت ظلم وستم ڈھا رہا تھا، اور اپنی پوری قوم کو بیوقوف بنا کر اس نے غلام بنا رکھا تھا، جیسا کہ سورۂ قصص آیت ۴ اور سورۂ زخرف آیت ۵۴ میں بیان کیا گیا ہے۔''

(۳) ''حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہدایت فرمائی گئی تھی کہ: فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّناً لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ''تم اور ہارون دونوں بھائی اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے اور خدا سے ڈرے''۔ (طٰہٰ، آیت: ۴۴) اس نرم کلام کا ایک نمونہ تو ان آیات میں دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مبلغ کو کسی بگڑے ہوئے آدمی کی ہدایت کے لیے کس حکمت کے ساتھ تبلیغ کرنی چاہیے۔ دوسرے نمونے سورۂ طٰہٰ آیات ۴۹ تا ۵۲، الشعراء، ۲۳ تا ۲۸، اور القصص، آیت ۳۷ میں دیے گئے ہیں۔ یہ منجملہ اُن آیات کے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں حکمت تبلیغ کی تعلیم دی ہے۔'' (حاشیہ نمبر ۸)

(۴) ''حضرت موسیٰ صرف بنی اسرائیل کی رہائی کے لیے ہی فرعون کے پاس نہیں بھیجے گئے تھے، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، بلکہ ان کی بعثت کا پہلا مقصد فرعون اور اس کی قوم کو راہ راست دکھانا تھا، اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ اگر وہ راہِ راست قبول نہ کرے تو بنی اسرائیل کو (جو اصل میں ایک مسلمان قوم تھے) اس کی غلامی سے چھڑا کر مصر سے نکال لائیں۔ یہ بات ان آیات سے بھی ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ ان میں سرے سے بنی اسرائیل کی رہائی کا ذکر ہی نہیں ہے بلکہ حضرت موسیٰ کو فرعون کے سامنے صرف حق کی تبلیغ پیش کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور ان مقامات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے جہاں حضرت موسیٰ نے تبلیغ اسلام بھی کی ہے اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ بھی فرمایا ہے۔ مثلاً (الاعراف، آیات ۱۰۴۔ ۱۰۵۔ طٰہٰ، آیات: ۴۷ تا ۵۲۔ الشعراء: آیات: ۱۶۔ ۱۷، و ۲۳ تا ۲۸۔

مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، یونس، حاشیہ ۷۴)'' (حاشیہ ۸)

(۵) ''یہاں پاکیزگی (تَزَكِّی) اختیار کرنے کا مطلب عقیدے اور اخلاق اور اعمال کی پاکیزگی اختیار کرنا، یا دوسرے الفاظ میں اسلام قبول کر لینا ہے۔ ابن زید کہتے ہیں کہ قرآن میں جہاں بھی تزکی کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں اس سے مراد اسلام قبول کرنا ہی ہے۔ چنانچہ وہ مثال میں قرآنِ مجید کی حسب ذیل تین آیات کو پیش کرتے ہیں۔ وَذٰلِكَ جَزَآءُ مَنْ تَزَكّٰى ''اور یہ جزا ہے اس کی جو پاکیزگی اختیار کرے۔'' یعنی اسلام لے آئے۔ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى اور ''تمہیں کیا خبر شاید کہ وہ پاکیزگی اختیار کرے۔'' یعنی مسلمان ہو جائے۔ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ''اور تم پر کیا ذمہ داری ہے اگر وہ پاکیزگی اختیار نہ کرے، یعنی مسلمان نہ ہو۔ (ابن جریر بحوالہ حاشیہ ۸)۔ مزید اسی حاشیے میں وضاحت کی کہ

(۶) ''یہ ارشاد کہ ''میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو (اس کا خوف) تیرے دل میں پیدا ہو'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تو اپنے رب کو پہچان لے گا اور تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تو اس کا بندہ ہے، مردِ آزاد نہیں ہے، تو لازماً تیرے دل میں اس کا خوف پیدا ہوگا، اور خوفِ خدا ہی وہ چیز ہے جس پر دنیا میں آدمی کے رویے کے صحیح ہونے کا انحصار ہے۔ خدا کی معرفت اور اس کے خوف کے بغیر کسی پاکیزگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔''

اس سورت کے حاشیہ نمبر ۹ میں مزید وضاحت کی کہ ''بڑی نشانی سے مراد عصا کا اژدھا بن جانا ہے جس کا ذکر قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی نشانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک بیجان لاٹھی سب دیکھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے علانیہ اژدھا بن جائے، جادوگر اس کے مقابلے میں لاٹھیوں اور رسیوں کے جو مصنوعی اژدھے بنا کر دکھائیں ان سب کو وہ نگل جائے، اور پھر حضرت موسیٰ جب اس کو پکڑ کر اٹھا لیں تو وہ پھر لاٹھی کی لاٹھی بن کر رہ جائے۔ یہ اس بات کی صریح علامت تھی کہ وہ اللہ رب العالمین ہی ہے جس کی طرف سے حضرت موسیٰ بھیجے گئے ہیں۔''

''اس کی تفصیل دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اس نے تمام مصر سے ماہر جادوگروں کو بلوایا اور ایک مجمع عام میں ان سے لاٹھیوں اور رسیوں کے اژدھے بنوا کر دکھائے تاکہ لوگوں کو یقین آجائے کہ موسیٰ علیہ السلام کوئی نبی نہیں بلکہ ایک جادوگر ہیں، اور لاٹھی کا اژدھا بنانے کا جو کرشمہ انہوں نے دکھایا ہے وہ دوسرے جادوگر بھی دکھا سکتے ہیں۔لیکن اس کی یہ چال اُلٹی پڑی اور جادوگروں نے شکست کھا کر خود تسلیم کرلیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ دکھایا ہے وہ جادو نہیں بلکہ معجزہ ہے۔''(حاشیہ نمبر ۱۰)

حاشیہ نمبر ۱۱ میں وضاحت کی کہ ''فرعون کا یہ دعویٰ کئی مقامات پر قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ایک موقع پر اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ''اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو خدا بنایا تو میں تمہیں قید کردوں گا۔'' (الشعراء، آیت: ۲۹) ایک اور موقع پر اس نے اپنے دربار میں لوگوں کو خطاب کرکے کہا: ''اے سردارانِ قوم، میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا کوئی اور خدا بھی ہے۔'' (القصص، آیت: ۳۸) ان ساری باتوں سے فرعون کا یہ مطلب نہ تھا، اور نہیں ہوسکتا تھا کہ وہی کائنات کا خالق ہے اور اسی نے یہ دنیا پیدا کی ہے۔ یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا منکر اور خود رب العالمین ہونے کا مدعی تھا۔ یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ صرف اپنے آپ ہی کو مذہبی معنوں میں لوگوں کا معبود قرار دیتا تھا۔قرآنِ مجید ہی میں اس بات کی شہادت موجود ہے کہ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے وہ خود دوسرے معبودوں کی پرستش کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے اہل دربار ایک موقع پر اس کو مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ ''کیا آپ موسیٰ اور اس کی قوم کو یہ آزادی دیتے چلے جائیں گے کہ وہ ملک میں فساد پھیلائیں اور آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟'' (الاعراف، آیت: ۱۲۷)۔اور قرآن میں فرعون کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ اگر موسیٰ خدا کا بھیجا ہوا ہوتا تو کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے؟ یا اس کے ساتھ ملائکہ اس کی اردلی میں کیوں نہ آئے؟ (الزخرف، آیت: ۵۳)۔ **پس درحقیقت وہ مذہبی معنی میں نہیں بلکہ سیاسی معنی میں اپنے آپ کو الٰہ اور ربِ اعلیٰ کہتا تھا، یعنی اس کا مطلب یہ تھا**

کہ اقتدارِ اعلیٰ کا مالک میں ہوں، میرے سوا کسی کو میری مملکت میں حکم چلانے کا حق نہیں ہے، اور میرے اوپر کوئی بالاتر طاقت نہیں ہے جس کا فرمان یہاں جاری ہوسکتا ہو۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۸۵۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۲۱۔ الشعراء، حواشی ۲۴، ۲۶۔ القصص، حواشی ۵۲۔ ۵۳۔جلد چہارم، الزخرف، حاشیہ ۴۹)''(حاشیہ نمبر ۱۱)

اب ہم اپنے مطالعہ قرآن کے آخری مرحلے میں پہنچ رہے ہیں تو یکے بعد دیگرے تین سورتوں کا مطالعہ ہمیں فرامین ربی کے ان مندرجات سے آگاہ کرتا ہے جن میں مترفین (جن کی مال و دولت نے انہیں الٰہ واحد کی اطاعت کے انکار میں مبتلا کر دیا تھا) کہ وہ اپنی دولت کے گھمنڈ میں آ کر ایسے ایسے بڑے بول بولتے تھے اور مختلف قسم کے فخر ومباہات کا اظہار کرتے تھے۔ تاہم یہاں پھر ایک طالب علم کو ایک اور دلچسپ لیکن نہایت ہی حیران کن صورت حال سے واسطہ پڑتا ہے کہ وہ آج کے مسلم معاشروں میں اس قسم کے سینکڑوں واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور حیران و ششدر رہ جاتے ہیں۔ ایک جانب تو مختلف ممالک کے شاہزادوں اور دیگر امراء کا یہ حال ہے کہ سونے چاندی اور جواہرات سے مرصع کاریں اور بحری کشتیاں کھربوں ریال/ڈالر کے عوض خریدتے جبکہ انہی ممالک نیز دیگر اسلامی ممالک یا افریقہ/ایتھوپیا میں قحط سالی کی وجہ سے کروڑوں مسلمان/انسان بھوک اور پیاس سے مر جاتے ہیں۔ ایک جانب گلی محلوں میں صبح کے وقت انہی مترفین کے گھروں کے باہر رات کا بچا ہوا گوشت، سالن اور چاول و دیگر اشیائے خوراک نالیوں میں پھینک دی جاتی ہے جبکہ اپنے گھریلو نوکروں کو کھانے کے لیے دینے کی توفیق انہیں نصیب نہیں ہوتی۔ ایسے عالم میں اگر سورۃ البلد کا مطالعہ اس نکتہ نظر سے کریں تو موجودہ معاشرے میں اردگرد اس قسم کے کردار آپ کو بڑی تعداد میں نظر آئیں گے۔

سورہ البلد:

سورہ البلد کی آیت نمبر ۵ تا ۶ میں انسان کی اس حالت پر تنقید کی گئی ہے۔

''کیا کوئی اس پر قابو نہ پا سکے گا؟ وہ کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا۔''

ان آیاتِ کریمہ کی تشریح درج ذیل حاشیہ جات نمبر ٦ تا ٨ میں یوں کی گئی ہے۔

حاشیہ نمبر ٦: ''یعنی کیا یہ انسان جوان حالات میں گھرا ہوا ہے، اس غرے میں مبتلا ہے کہ وہ دنیا میں جو کچھ چاہے کرے۔ کوئی بالاتر اقتدار اس کو پکڑنے اور اس کا سر نیچے کر دینے والا نہیں ہے؟ حالانکہ آخرت سے پہلے خود اس دنیا میں بھی ہر آن وہ دیکھ رہا ہے کہ اس کی تقدیر پر کسی اور کی فرمانروائی قائم ہے جس کے فیصلوں کے آگے اس کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ زلزلے کا ایک جھٹکا، ہوا کا ایک طوفان، دریاؤں اور سمندروں کی ایک طغیانی اُسے یہ بتا دینے کے لیے کافی ہے کہ خدائی طاقتوں کے مقابلے میں وہ کتنا بل بوتا رکھتا ہے۔ ایک اچانک حادثہ اچھے خاصے بھلے چنگے انسان کو اپاہج بنا کر رکھ دیتا ہے۔ تقدیر کا ایک پلٹا بڑے سے بڑے بااقتدار آدمی کو عرش سے فرش پر لا گراتا ہے۔ ◆ عروج کے آسمان پر پہنچی ہوئی قوموں کی قسمتیں جب بدلتی ہیں تو وہ اسی دنیا میں ذلیل وخوار ہو کر رہ جاتی ہیں جہاں کوئی اُن سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ اس انسان کے دماغ میں آخر کہاں سے یہ ہوا بھر گئی کہ کسی کا اس پر بس نہیں چل سکتا؟''

مزید وضاحت کرتے ہوئے حاشیہ نمبر ٧ میں لکھا کہ

☆...... أنفقت مالا لبدا ''میں نے ڈھیر سا مال خرچ کر دیا'' نہیں کہا بلکہ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا کہا جس کے لفظی معنی ہیں ''میں نے ڈھیر سا مال ہلاک کر دیا'' یعنی لٹا دیا، یا اڑا دیا۔ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ کہنے والے کو اپنی مال داری پر کتنا فخر تھا کہ جو ڈھیر سا مال اس نے خرچ کیا وہ اس کی مجموعی دولت کے مقابلے میں اتنا ہیچ تھا کہ اس کے لٹا دینے یا اڑا دینے کی اسے کوئی پروا نہ تھی۔ اور یہ مال اڑا دینا تھا کس مد میں؟ کسی حقیقی نیکی کے کام میں نہیں، جیسا کہ آگے کی آیات سے خود بخود مترشح ہوتا ہے، بلکہ اپنی دولت مندی کی نمائش اور اپنے فخر اور اپنی بڑائی کے اظہار میں۔ **قصیدہ گو شاعروں کو بھاری**

◆ وطن عزیز میں جو واقعات روزمرہ واقع ہو رہے ہیں کیا وہ ان آیاتِ قرآنی کا منہ بولتا ثبوت نہیں؟

انعامات دینا۔ شادی اور غمی کی رسموں میں سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کی دعوت کر ڈالنا۔ جوئے میں ڈھیروں دولت ہار دینا۔ جوا جیت جانے پر اونٹ پر اونٹ کاٹنا اور خوب یار دوستوں کو کھلانا۔ میلوں میں بڑے لاؤلشکر کے ساتھ جانا اور دوسرے سرداروں سے بڑھ کر شان وشوکت کا مظاہرہ کرنا۔ تقریبات میں بے تحاشا کھانے پکوانا اور اذن عام دے دینا کہ جس کا جی چاہے آئے اور کھائے، یا اپنے ڈیرے پر کھلا لنگر جاری رکھنا کہ دور دور تک یہ شہرت ہو جائے کہ فلاں رئیس کا دسترخوان بڑا وسیع ہے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے نمائشی اخراجات تھے جنہیں جاہلیت میں آدمی کی فیاضی اور فراخ دلی کی علامت اور اس کی بڑائی کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ انہی پر ان کی تعریفوں کے ڈنکے بجتے تھے۔ انہی پر ان کی مدح کے قصیدے پڑھے جاتے تھے۔ اور وہ خود بھی ان پر دوسروں کے مقابلے میں اپنا فخر جتاتے تھے۔'' ......انہی آیات کی مزید توضیح یوں کی:

''کیا یہ فخر جتانے والا یہ نہیں سمجھتا کہ اوپر کوئی خدا بھی ہے جو دیکھ رہا ہے کہ کن ذرائع سے اس نے یہ دولت حاصل کی، کن کاموں میں اسے کھپایا، اور کس نیت، کن اغراض اور کن مقاصد کے لیے اس نے یہ سارے کام کیے؟ کیا وہ سمجھتا ہے کہ خدا کے ہاں اس فضول خرچی، اس شہرت طلبی اور اس تفاخر کی کوئی قدر ہوگی؟ کیا اس کا خیال ہے کہ دنیا کی طرح خدا بھی اس سے دھوکا کھائے گا؟'' (حاشیہ نمبر ۸)

جب ہم ان آیاتِ کریمہ کی روشنی میں اپنی موجودہ سوسائٹی کا جائزہ لیتے ہیں تو امر واقعی یہ ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ کے حاضر وناظر ہونے اور ماضی اور حال ہی نہیں بلکہ انسان کے مستقبل کو بھی ان کے سامنے اس طرح عیاں دیکھتے ہیں کہ شاید انسان کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے پر بھی اتنا اعتبار نہ ہو کہ انسانی آنکھ دھوکا کھا سکتی ہے۔ آج سے ۱۴۰۰ سال قبل نازل ہونے والا قرآن نہ صرف اپنے زمانہ نزول کا حال بیان کر رہا ہے بلکہ اس میں آج کے مسلم معاشرے کی تصویر بھی دیکھی جا سکتی ہے ذرا دیکھئے کیا یہ تمام کردار آپ کو اپنے اردگرد معاشرے میں نظر نہیں آ رہے؟

سورہ التکاثر

درج بالا آیات کے تسلسل میں جب ہم سورہ التکاثر کا مطالعہ کرتے ہیں تو آیت نمبر ایک کی تشریح میں جو حاشیہ نمبر ایک سید مودودیؒ نے تحریر کیا ہے وہ موجودہ مسلم معاشرے (بلالحاظ جغرافیائی حد بندی، قوم، نسل، زبان اور فقہی عقیدے کے) بہت ہی اہم راہ نمائی اور قابل عمل امر پر مبنی ہے۔ آج کی مسلم سوسائٹی میں مسلمان بحیثیت مجموعی جن اعمال اور افعال میں اپنے رات دن کا بیشتر وقت خرچ کر رہے ہیں، ضرورت ہے کہ اس کے ایک ایک لمحے پر غور کیا جائے کہ اس کا حساب بروز قیامت کیسے دے سکیں گے؟ منبر ومحراب سے اس قسم کے تمام موضوعات پر جس راہ نمائی کی ضرورت تھی، وہ اب نہیں رہی جس پر دینی رہنماؤں، معلمین اخلاق، اساتذہ، حکومت اور دیگر معاشرتی ادارے ذمہ دار ہیں جن کے سربراہان سے بھی سوال کیا جائے گا کہ:

زندگانی کے لمحے کہاں کہاں گزرے؟

اس حاشیے میں بتایا گیا کہ ''اصل میں اَلْھٰکُمُ التکاثر فرمایا گیا ہے جس کے معنی میں اتنی وسعت ہے کہ ایک پوری عبارت میں بمشکل اس کو ادا کیا جا سکتا ہے۔''

''اَلْھٰکُمُ لہو سے ہے جس کے اصل معنی غفلت کے ہیں، لیکن عربی زبان میں یہ لفظ ہر اس شغل کے لیے بولا جاتا ہے جس سے آدمی کی دلچسپی اتنی بڑھ جائے کہ وہ اس میں منہمک ہو کر دوسری اہم تر چیزوں سے غافل ہو جائے۔ اس مادے سے جب اَلْھَاکُمُ کا لفظ بولا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کس لہو نے تم کو اپنے اندر ایسا مشغول کر لیا ہے کہ تمہیں کسی اور چیز کا، جو اس سے اہم تر ہے، ہوش باقی نہیں رہا ہے۔ اسی کی دھن تم پر سوار ہے۔ اسی کی فکر میں تم لگے ہوئے ہو۔ اور اس انہماک نے تم کو بالکل غافل کر دیا ہے۔''

''تکاثر کثرت سے ہے، اور اس کے تین معنی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی زیادہ سے زیادہ کثرت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ دوسرے یہ کہ لوگ کثرت کے حصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کریں۔ تیسرے یہ کہ لوگ ایک دوسرے کے مقابلے

میں اس بات پر فخر جتائیں کہ انہیں دوسروں سے زیادہ کثرت حاصل ہے۔"

"پس اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ کے معنی ہوئے تکاثر نے تمہیں اپنے اندر ایسا مشغول کرلیا ہے کہ اس کی دھن نے تمہیں اس سے اہم تر چیزوں سے غافل کر دیا ہے۔ اس فقرے میں یہ تصریح نہیں کی گئی ہے کہ تکاثر میں کس چیز کی کثرت اور اَلْهٰكُمُ میں کس چیز سے غافل ہوجانا مراد ہے، اور اَلْهٰكُمُ (تم کو غافل کر دیا ہے) کے مخاطب کون لوگ ہیں۔ اس عدمِ تصریح کی وجہ سے ان الفاظ کا اطلاق اپنے وسیع ترین مفہوم پر ہو جاتا ہے۔ تکاثر کے معنی محدود نہیں رہتے بلکہ دنیا کے تمام فوائد و منافع، سامانِ عیش، اسبابِ لذت، اور وسائلِ قوت واقتدار کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی سعی و جہد کرنا، ان کے حصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا، اور ایک دوسرے کے مقابلے میں ان کی کثرت پر فخر جتانا اس کے مفہوم میں شامل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اَلْهٰكُمُ کے مخاطب بھی محدود نہیں رہتے بلکہ ہر زمانے کے لوگ اپنی انفرادی حیثیت سے بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی اس کے مخاطب ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ دنیا حاصل کرنے اور اس میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے، اور دوسروں کے مقابلے میں اس پر فخر جتانے کی دھن افراد پر بھی سوار ہے اور اقوام پر بھی۔ اسی طرح اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ میں چونکہ اس امر کی صراحت نہیں کی گئی کہ تکاثر نے لوگوں کو اپنے اندر منہمک کر کے کس چیز سے غافل کر دیا ہے، اس لیے اس کے مفہوم میں بھی بڑی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کو اس تکاثر کی دھن نے ہر اس چیز سے غافل کر دیا ہے جو اس کی بہ نسبت اہم تر ہے۔ وہ خدا سے غافل ہو گئے ہیں۔ عاقبت سے غافل ہو گئے ہیں۔ اخلاقی حدود اور اخلاقی ذمہ داریوں سے غافل ہو گئے ہیں۔ حق داروں کے حقوق اور ان کی ادائیگی کے معاملہ میں اپنے فرائض سے غافل ہو گئے ہیں۔ **انہیں معیارِ زندگی بلند کرنے کی فکر ہے، اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ معیارِ آدمیت کس قدر گر رہا ہے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ دولت چاہیے، اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ وہ کس ذریعہ سے حاصل**

ہوتی ہے۔ انہیں عیش و عشرت اور جسمانی لذتوں کے سامان زیادہ سے زیادہ مطلوب ہیں، اس ہوس رانی میں غرق ہو کر وہ اس بات سے بالکل غافل ہو گئے ہیں کہ اس روش کا انجام کیا ہے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ طاقت، زیادہ سے زیادہ فوجیں، زیادہ سے زیادہ ہتھیار فراہم کرنے کی فکر ہے اور اس معاملہ میں ان کے درمیان ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی دوڑ جاری ہے، اس بات کی فکر انہیں نہیں ہے کہ یہ سب کچھ خدا کی زمین کو ظلم سے بھر دینے اور انسانیت کو تباہ و برباد کر دینے کا سر و سامان ہے۔ غرض تکاثر کی بے شمار صورتیں ہیں جنہوں نے اشخاص اور اقوام سب کو اپنے اندر ایسا مشغول کر رکھا ہے کہ انہیں دنیا اور اس کے فائدوں اور لذتوں سے بالاتر کسی چیز کا ہوش نہیں رہا ہے۔'' (حاشیہ نمبر ۱)

پیر محمد اکرم شاہؒ نے اپنی تفسیر میں لفظ ''التکاثر کے دو معنی ذکر کیے ہیں۔ مال جمع کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا۔ دوسرا مال، مال و دولت کی کثرت پر فخر کرنا''......مزید وضاحت کی کہ

''جو لوگ زیادہ سے دیادولت جمع کرنے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں ان کو بڑی اہم اور ضروری چیزیں فراموش ہو جاتی ہیں ـــــ بس ایک ہی خیال میں مگن رہتے ہیں کہ جیسے بھی بن پڑے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر لی جائے۔ **خدا ناراض ہوتا ہے تو ہوتا رہے، قوم سے خیانت، اپنے ملک سے غداری، اپنے فرائض کی ادائیگی میں بد دیانتی کے جرائم سرزد ہوتے ہیں تو ہوتے رہا کریں۔ اپنی ذات، اپنی آبرو، اپنی شہرت سب کچھ داؤ پر لگا دیتے ہیں اور اکثر یہ بازی ہار جاتے ہیں**'' (حاشیہ نمبر ۱)

کیا وہ تمام لوگ/ طبقے جن کا ذکر درج بالا تحریر میں کیا گیا ہے اپنا چہرہ اس آئینے میں دیکھ کر اپنی اصلاح کر سکیں گے؟

سورہ الھمزہ:

اپنے مطالعہ قرآن کی آخری سورتوں میں سورہ الھمزۃ بھی گزشتہ سے پیوستہ مضامین کی

ایک بہترین مثال ہے۔ بقول سید مودودیؒ ''اس میں چند ایسی اخلاقی برائیوں کی مذمت کی گئی ہے جو جاہلیت کے معاشرے میں زر پرست مالداروں کے اندر پائی جاتی تھیں جنہیں ہر عرب جانتا تھا کہ یہ برائیاں فی الواقع اس کے معاشرے میں موجود ہیں، اور جن کو سب ہی برا سمجھتے تھے، کسی کا یہ خیال نہ تھا کہ یہ کوئی خوبیاں ہیں۔ اس گھناؤنے کردار کو پیش کرنے کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ آخرت میں ان لوگوں کا کیا انجام ہوگا جن کا یہ کردار ہے۔ یہ دونوں باتیں (یعنی ایک طرف یہ کردار اور دوسری طرف آخرت میں اس کا یہ انجام) ایسے انداز سے بیان کی گئی ہیں جس سے سامع کا ذہن خود بخود اس نتیجے پر پہنچ جائے کہ اس طرح کے کردار کا یہی انجام ہونا چاہیے۔ اور چونکہ دنیا میں ایسے کردار والوں کو کوئی سزا نہیں ملتی، بلکہ وہ پھلتے پھولتے ہی نظر آتے ہیں اس لیے آخرت کا برپا ہونا قطعی ناگزیر ہے۔ (تعارف سورہ)''

معاشروں (بالخصوص وہ مسلم ممالک جہاں مختلف وجوہات کی بناء پر پیسے کی ریل پیل ہے) اس قسم کے کردار بہت ہی زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں کہ بچہ بچہ ان سے واقف ہے۔ تاہم المیہ یہ ہے کہ عوام الناس تو کیا منبر ومحراب سے تعلق رکھنے والے اکثر اور گدی اور مسند پر براجمان اصحاب کی ایک معتد بہ تعداد بھی نہ صرف ان میں شامل ہے بلکہ ان لوگوں کے خوشہ چیں بنے ہوئے ہیں۔ ایسے عالم میں کہ جب بے ایمان دولت مندوں پر کسی جانب سے بھی کوئی آواز بلند نہیں ہوتی تو پھر وہ اپنا اقتدار مختلف ناجائز طریقوں سے بحال و برقرار رکھنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور اپنے اپنے ملک میں اللہ کے دین کی ترویج واشاعت کے کاموں میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں۔

اس پس منظر میں اس سورت کا مطالعہ کرنے سے ایک حساس انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ آخرت میں ایسے لوگوں کا کیا برا انجام ہوگا۔

باب دوم

بنی اسرائیل کے جرائم

سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں لکھا کہ ''قرآن مجید میں بنی اسرائیل کا ذکر سب سے پہلے سورہ البقرۃ کی آیت ۴۰ میں آیا ہے۔ یہاں سے لے کر چودھویں رکوع تک مسلسل تقریر اس قوم کو خطاب کرتے ہوئے کی گئی ہے۔ ایک خاص قوم کی مثال لے کر بتایا جارہا ہے کہ جو قوم خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت سے منہ موڑتی ہے، اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس توضیح کیلئے تمام قوموں میں سے بنی اسرائیل کو منتخب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں صرف یہی ایک قوم ہے جو مسلسل چار ہزار برس سے تمام اقوامِ عالم کے سامنے ایک زندہ نمونہ عبرت بنی ہوئی ہے۔ ہدایت الٰہی پر چلنے اور نہ چلنے سے جتنے نشیب و فراز کسی قوم کی زندگی میں رونما ہو سکتے ہیں۔ وہ سب اس قوم کی عبرت ناک سرگزشت میں نظر آجاتے ہیں۔'' (حاشیہ ۵۶) تاہم بقول یوسف ظفر (۲۰۱۶) ''یہودی مؤرخین کا بیان ہے کہ مصر میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد اس قدر پھیلی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نکلنے والے بنی اسرائیل کی تعداد چھ لاکھ یا اس سے کچھ زائد تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے دورِ اقتدار کے ساتھ ہی ان کے بھائیوں کا دور عروج ختم ہوا اور ان کی ترقی سے ڈر کر فراعینِ مصر نے انہیں دبا لیا اور انہیں غلام بنا کر محنت پر لگا دیا۔ انجیل کے مطابق مصر میں یہود کا قیام چار سو برس رہا۔۔۔۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ فرعون مصر کے ظلم و ستم نے بنی اسرائیل کو جس قدر کچلا اتنا ہی ان کی اولاد بڑھتی گئی جسے مصری حکمرانوں نے اپنے عظیم الشان اہراموں کی تعمیر پر لگا دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اس قوم کو اس عذاب سے نجات دلائی۔''

''ایک طویل مدت بعد جب بنی اسرائیل کو فرعون کے عذاب سے نجات دلا کر

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اپنی (احکام خداوندی) پیروی کی تلقین فرمائی تو بنی اسرائیل کہنے لگے‘‘

”ہماری مثال تو ایسی ہے جیسے ایک بھیڑیئے نے بکری کو پکڑا اور چرواہے نے اسے بچانے کی کوشش کی اور دونوں کی کشمکش میں بکری کے ٹکڑے اڑ گئے بس اس طرح تمہاری اور فرعون کی کھینچ تانی میں ہمارا کام تمام ہو کر رہے گا۔“

جرائم یہود

درج بالا اقتباس سے اس ذہنی کیفیت کا پتہ چلتا ہے جو بنی اسرائیل کو اپنے نجات دہندہ کے بارے میں تھا۔ تاہم یہ ایک بہت ہی ابتدائی قسم کے خیالات ہیں جن کا اظہار یہود نے کیا۔ ان کی چار ہزار سالہ تاریخ اس سے بہت زیادہ گھناؤنے اور شنیع افعال اور جرائم کی نشان دہی کرتی ہے۔ جو ہمارے اس باب کا موضوعِ سخن ہے!

بنی اسرائیل سے اپنے طویل دور حیات میں جو جرائم سرزد ہوئے ان کا ہم چند ضمنی موضوعات کے تحت مطالعہ کریں گے۔

الف) قتل انبیائے کرام:

مذہبی اور اخلاقی جرائم کے ضمن میں اولین اور اہم ترین جرم عظیم ان کا وہ رویہ ہے جو انہوں نے اپنے انبیاء کے ساتھ روا رکھا۔ جب مختلف انبیائے کرام علیہم السلام نے انہیں توحید و رسالت کی دعوت دی۔

سورہ البقرہ کی آیت ۶۰ کی تفسیر میں سید مودودی نے حاشیہ نمبر ۷۹ میں جو کچھ لکھا اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

☆......’’حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کی سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ یہودیہ (یروشلم کی دولت) اور سامریہ (دولت اسرائیل)۔ ان میں لڑائیاں ہوئیں

تآ نکہ یہودیہ کی ریاست نے اپنے بھائیوں کے خلاف دمشق کی آرامی سلطنت سے مدد مانگی۔ خدا کے نبی حنانی نے یہودیہ کے فرماں روا کو سخت تنبیہ کی مگر اس نے انہیں جیل میں ڈال دیا۔''

☆......''حضرت الیاس (ایلیا ELLIAH) نے بعل کی پرتش پر یہودیوں کو ملامت کی تو سامریہ کا بادشاہ اپنی بیوی کے کہنے پر ان کی جان کے لاگو ہو گیا حتی کہ انہوں نے جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑوں میں جا کر پناہ لی۔''

☆......''جب یہودیہ کی ریاست میں علانیہ بت پرستی اور بدکاری شروع ہوئی تو زکریا نبی کو عین ہیکل سلیمانی میں ''مقدس'' اور ''قربان گاہ'' کے درمیان سنگسار کر دیا گیا۔''

☆......''یرمیاہ نبی کو قید کیا گیا۔ رسی سے باندھ کر کیچڑ بھرے حوض میں لٹکا دیئے گئے تا کہ بھوک پیاس سے وہیں سوکھ سوکھ کر مر جائیں اور ان پر الزام لگایا گیا کہ قوم کے غدار ہیں اور بیرونی دشمنوں سے ملے ہوئے ہیں۔''

☆......''ایک اور نبی حضرت عاموس کو سامریہ کی ریاست کی گمراہیوں /بدکاریوں پر ٹوکنے پر انہیں نوٹس دیا گیا کہ ملک سے باہر نکل جاؤ اور باہر جا کر نبوت کرو۔''

☆......''حضرت یحییٰ (یوحنا) عَلَیْہِ السَّلَام کو یہودیہ کے فرمانروا ہیرودیس نے قید کیا۔ پھر بادشاہ نے اپنی معشوقہ کی فرمائش پر قوم کے اس صالح ترین آدمی کا سر قلم کر کے ایک تھال میں رکھ کر اس کی نذر کیا۔''

☆......''آخر میں حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام پر بنی اسرائیل کے علماء اور سرداران قوم کا غصہ بھڑکا کیونکہ وہ ان کے گناہوں اور ان کی ریاکاریوں پر ٹوکتے تھے اور ایمان وراستی کی تلقین کرتے تھے۔ اس قصور پر ان کے خلاف جھوٹا مقدمہ تیار کیا گیا۔ رومی عدالت سے ان کے قتل کا فیصلہ کیا گیا اور جب رومی حاکم پیلاطس نے یہود سے کہا کہ آج عید کے روز میں تمہاری خاطر یسوع عَلَیْہِ السَّلَام اور برابا ڈاکو، دونوں میں سے کس کو رہا کروں، تو ان کے پورے مجمع نے بالاتفاق پکار کر کہا کہ برابا کو چھوڑ دے اور یسوع عَلَیْہِ السَّلَام کو پھانسی پر چڑھا دو۔''

(متی باب ۲۷ آیت ۲۰ تا ۲۶) —— یہ ہے اس قوم کے جرائم کا ایک نہایت شرمناک باب جن کی طرف قرآن کی اس آیت میں مختصراً اشارہ کیا گیا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جس قوم نے اپنے فسوق وفجار کوسرداری اور سربراہ کاری کیلئے اپنے صلحاء اور ابرار کو جیل اور دار کیلئے پسند کیا ہو، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی لعنت کیلئے پسند نہ کرتا تو آخر کیا کرتا؟

ب) تعلیماتِ انبیاء کا انکار:

بنی اسرائیل کے جرائم کی فہرست میں دوسرے نمبر پر ان کا وہ جرم عظیم ہے جو قتل انبیاء کا ہی دراصل تسلسل ہے۔ چونکہ وہ انبیاء کی تعلیمات (توحید، رسالت اور آخرت) کے منکر تھے اس لئے وہ ان تمام نیک نہاد رسل وانبیاء ہی کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ جو اللہ تعالیٰ ان کی جانب مبعوث فرماتے تھے۔ اس ضمن میں تعلیمات انبیائے کرام کی مخالفت کی چند مثالیں ذیل میں درج ہیں:

ا۔ انکار قیامت:

"بنی اسرائیل کے بگاڑ کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ آخرت کے متعلق ان کے عقیدہ میں خرابی آ گئی تھی۔ وہ اس قسم کے خیالاتِ خام میں ہو گئے تھے کہ ہم جلیل القدر انبیاء کی اولاد ہیں۔ بڑے بڑے صلحاء اور زہاد سے نسبت رکھتے ہیں، ہماری بخشش تو انہیں بزرگوں کے صدقے میں ہو جائیگی، ان کا دامن گرفتہ ہو کر بھلا کوئی سزا کیسے پا سکتا ہے۔"

یہاں قدرے ٹھہر کر موجودہ مسلم سوسائیٹی کا جائزہ لیجئے۔ کیا ٹھیک یہی وہ صورت حال نہیں کہ ہم میں سے بھی ایک کثیر تعداد کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا گیا ہے کہ غوث اعظم یا کسی دوسرے بزرگ کا گرویدہ ہونے سے بروز قیامت چھٹکارہ مل جائیگا چاہے دنیا میں ہم کسی بھی گناہ میں ملوث کیوں نہ ہوں۔

نماز اور زکوٰۃ ہر زمانے میں دین اسلام کے اہم ترین رکن رہے ہیں مگر یہودی ان سے غافل ہو چکے تھے (سورہ البقرۃ: ۴۳)

۲۔سبت کے قانون کوتوڑنا:

یہودیوں کیلئے ہفتے کا دن آرام اور عبادت کیلئے مخصوص کیا گیا تھا کہ اس روز کسی قسم کا دنیوی کام حتیٰ کہ کھانا پکانے کا کام بھی خود نہ کرنے اور نہ اپنے خادموں سے لینے کا حکم تھا۔اس قانون کوتوڑنے کی سزا قتل تھی لیکن اپنے دورانحطاط میں وہ علی الاعلان سبت کی بے حرمتی کرنے لگے حتیٰ کہ ان کے شہروں میں کھلے بندوں سبت کے روز تجارت ہونے لگی (البقرۃ ۶۵)

۳۔کوہ طور پر لئے گئے وعدے کی خلاف ورزی (البقرۃ:۶۳)النساء:۱۵۴

۴۔گائے کی قربانی پر یہودیوں کی بحث وتمحیص اورعمل کرنے سے پہلوتہی۔حتی کہ عین اس گائے کوقربان کرنا پڑا جسے وہ مقدس سمجھتے تھے اوراس کی قربانی سے بچنے کیلئے بحث ومباحثہ کرتے تھے(البقرۃ:۶۷)

۴۔بچھڑے کی پرستش کرنا۔(البقرۃ:۵۱)

۵۔اذان کا مذاق اڑانا(المائدۃ:۵۸)

گائے اور بیل کی پرستش کا مرض بنی اسرائیل کی ہمسایہ اقوام میں ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔مصراور کنعان میں اس کا عام رواج تھا۔حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل جب انحطاط میں مبتلا ہوئے اور رفتہ رفتہ قبطیوں کے غلام بن گئے توانہوں نے من جملہ اورامراض کے ایک یہ مرض بھی اپنے حکمرانوں سے لے لیا تھا۔" (البقرہ:حاشیہ نمبر ۶۸)

☆......یہود کا ہر قسم کے طاغوت کی بندگی کرنا نیز ان پر خدا نے لعنت کی،ان پر خدا کا غضب ٹوٹا اورانہیں بندر سور بنادیا گیا سورہ المائدۃ:۶۱ میں درج بالا جرائم اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے خلاف قرآن میں ازخود لگائے۔

☆......یہودیوں کا کہنا کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں(المائدۃ:۶۴)

☆......یہودیوں کا قول کہ" آتشِ دوزخ تو مَس تک نہ کریگی اوراگر دوزخ کی سزا ہم کو ملے گی بھی تو بس چندروزہ"(آل عمران:۲۴)

☆......اہل کتاب کے ایک گروہ کا حضورؐ اور مسلمانوں کوراہ راست سے ہٹانے کی

کوشش کرنا (آل عمران:۶۹)

☆......دعوتِ اسلامی کے خلاف ان کی چالبازیاں (آل عمران:۷۰)

☆...... یہودیوں کا یہ کہنا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں (آل عمران:۱۸۱)

☆......ایسے کاموں پر تعریف کی خواہش کرنا جو انہوں نے نہیں کئے (آل عمران: ۱۸۸)۔اس آیت کی تشریح میں سید مودودی نے لکھا کہ ''وہ اپنی تعریف میں یہ سننا چاہتے ہیں کہ حضرت بڑے متقی ہیں، دیندار اور پارسا ہیں، خادمِ دین ہیں، حامی شرع متین ہیں، حالانکہ حضرت کچھ بھی نہیں۔ یا اپنے حق میں یہ ڈھنڈورا پٹوانا چاہتے ہیں کہ فلاں صاحب بڑے ایثار پیشہ اور مخلص اور دیانت دار راہنما ہیں اور انہوں نے ملت کی بڑی خدمت کی ہے حالانکہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔'' (حاشیہ نمبر ۱۳۳)

قرآن مجید کی درج بالا آیت جو علمائے بنی اسرائیل کے بارے میں آج سے ۱۴۰۰ سال قبل نازل ہوئی تھی، آج کتنی صحت اور حقیقت کے ساتھ دور حاضر کے پیر صاحبان اور مذہبی لیڈروں نیز سیاستدانوں کے بارے میں ان پر چسپاں ہو رہی ہے، اس کا صرف ایک سرسری سا اندازہ آپ کبھی ان اشتہارات (۴ رنگا جہازی سائز) سے کر سکتے ہیں جس میں ''حضرت صاحب'' کی تصویر بمعہ ''سجادہ نشین'' (مستقبل کے گدی نشین یا سیاسی جانشین) کے مختلف عرسوں اور سالانہ تقریبات (از قسم قوالی) کے موقعوں پر منعقد ہوتی ہیں۔ان میں جن القابات سے ''حضرت صاحب'' کا تعارف کرایا جاتا ہے، وہ اس قدر بھاری بھر کم ہوتا ہے کہ ایک قاری انہیں پڑھتے ہی ان کی مافوق الفطرت اور خوارق عادات کا قائل ہو جاتا ہے! یہ سب کچھ دراصل قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ آج سے ۱۴ سو سال قبل ان کی جو تصویر قرآن نے کھینچی ہے وہ ان تصاویر سے کس قدر مماثلت اور مشابہت رکھتی ہے!

☆......کافروں کو مسلمانوں سے بہتر قرار دینا (النساء:۵۰)

☆......اہل کتاب کا نبی ﷺ سے مطالبہ کہ آسمان سے کوئی تحریر نازل کراؤ (النساء:۱۵۳)

ج)چند اخلاقی تعلیمات:

☆......ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں اور کے ساتھ نیک سلوک نہ کرنا۔
(سورہ البقرۃ:۸۳)

☆......آپس میں ایک دوسرے کا خون بہانا، ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر کرنا، جتھے بندیاں کرنا اور لڑائی میں پکڑے جانے والوں سے رہائی کے لئے فدیہ لینا۔ ان تمام اخلاقی جرائم سے یہود کو منع کیا گیا تھا لیکن وہ باز نہ آئے (البقرۃ:۸۴)

☆...... دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت دی گئی (سورۃ البقرۃ: ۱۲۳) صرف یہودیوں اور نصرانیوں کے جنت میں جانے کا دعویٰ۔(آیت ۱۳۴)

سورۃ البقرۃ کی آیات ۵۷ تا ۶۱ میں یہود پر ان احسانات کا ذکر ہے جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان پر کئے تھے۔ لیکن انہوں نے احسان ناشناسی کی۔

☆......جزیرہ نمائے سینا میں جہاں دھوپ سے بچنے کیلئے کوئی جائے پناہ نہ تھی ابر کے ذریعہ بچانا۔

☆......ایک بستی میں داخلے پر اس کی پیداوار مزے سے کھانے کی اجازت تاہم داخلے کے وقت سجدہ ریز اور شکر گزار ہونے نیز اپنی خطاؤں کی معافی مانگنے اور قتل عام کی بجائے بستی کے باشندوں میں درگزر عام معافی کا اعلان کرنا مگر ان احکامات کی خلاف ورزی۔(آیت ۵۱)

☆......ایک چٹان سے بارہ چشموں کا نکلنا تا کہ ۱۲ قبیلوں کے لئے علیحدہ علیحدہ پانی کا بندوبست(آیت ۶۰)

☆......بنی اسرائیل کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کہ من وسلویٰ جیسے ایک ہی طرح کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ ہمارے لئے زمین کی پیداوار ساگ، ترکاری، کھیرا، ککڑی، گیہوں، لہسن، پیاز، دال وغیرہ پیدا کرائیں۔(آیت ۶۱)

☆......''واضح رہے کہ یہ اس وقت کی صورت حال ہے جبکہ فرعون کے عذاب سے

نکلنے، فرعون اور اس کے اعیان حکومت کے غرق ہونے کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے بعد لاکھوں کی تعداد میں وہ صحرائے سینا میں قیام پذیر ہوئے جہاں دھوپ سے بچنے، لاکھوں انسانوں کیلئے پینے اور دیگر ضروریات کیلئے وافر پانی کی فراہمی اور من وسلویٰ جیسی قدرتی غذاؤں کی ۴۰ سال تک فراہمی کے ذریعہ پوری قوم ان حیات بخش حالات میں زندہ رہی اور انہیں فاقہ کشی کی مصیبت نہ اٹھانی پڑی حالانکہ آج کسی نہایت متمدن ملک میں بھی اگر چند لاکھ مہاجر یکا یک آ پڑیں تو ان کی خوراک کا انتظام ہی مشکل ہوجاتا ہے۔ تاہم ان تمام تر احسانات کے علی الرّغم بنی سارائیل نے ان تمام احسانات کا بدلہ ناشکری، کفرانِ نعمت اور احکاماتِ الٰہی کے برعکس دیا اور یوں بالآخر ذلت اور خواری اور بدحالی ان پر مسلط ہوگئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے...... جو نتیجہ تھا اس کا کہ وہ اللہ کی آیات سے کفر کرنے لگے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرنے لگے (حاشیہ جات ۷۲ تا ۷۸ کے مختصر مفہوم)

د) یہودی علماء کی موشگافیاں:

مذاہب کی تاریخ کا یہ ایک حیرت انگیز پہلو رہا ہے کہ ہر دور میں انبیائے کرام کی تعلیمات کو مسخ کرنے کا شرف بھی انہی لوگوں کو حاصل رہا ہے جو اس دین کا علم رکھنے کے دعویدار تھے اور اس زعم میں مبتلا رہتے تھے کہ ان کی فقہی موشگافیاں بھی اُسی طرح داخل دین ہیں جس طرح کتب الہامی کی آیاتِ مقدسہ۔ آج کے دور میں بھی امت مسلمہ کے "اعاظم رجال" کی ایک اکثریت اس زعمِ باطل میں مبتلا ہے جس کا نتیجہ لاتعداد فرقوں کی شکل میں واضح ہے۔ تاہم یہاں اس امر کی صراحت بھی ضروری ہے کہ موجودہ دور کا بزعم خود جدید تعلیم یافتہ طبقہ (لبرلز LIBERALS) بھی اسی زعم اور خام خیالی میں مبتلا ہیں کہ امت کے مہمات مسائل کے بارے میں (اگرچہ وہ خود ژولیدہ فکری کا شکار ہیں) تاہم ان کی توجیہات اور تصریحات کے مقابلے میں کسی دوسری بات کا تسلیم کیا جانا ایک احمقانہ اقدام ہے۔ اس ضمن میں مذہبی لوگوں کا رویہ سولہویں/ سترہویں عیسوی کے عیسائی پادریوں اور راہبوں سے بہت حد تک مماثلت رکھتا ہے۔ کہ وہ بھی اپنے مزعومہ عقائد وخیالات کے

بارے میں بہت جارحانہ رویہ رکھتے تھے۔ اگرچہ لبرلز کے مقابلہ میں موجودہ چند دہائیوں میں مذہبی اہل علم کے رویے میں کسی قدر "نرمی اور وسعت" دیکھنے میں آئی ہے۔ آج وہ تنگ نظری اور کفر کے فتویٰ جاری کرنے نیز دوسروں کو ضال و مضل ٹھہرانے کی کیفیت عام نہیں ہے جو آج سے قریبا نصف صدی پاکستان میں جاری تھی۔ آیئے ہم دیکھیں کہ نزول قرآن کے وقت یہود و نصاریٰ کے اہل علم کا کیا کردار تھا اور آج امتِ مسلمہ کے اہل علم (مذہبی اور لبرل/جدید) کا کردار ان سے کس قدر مماثلت رکھتا ہے؟

۵۔ تھوڑی قیمت پر اللہ کی آیات کو بیچ دینا: البقرۃ: ۴۱

۶۔ جانتے بوجھتے حق کو چھپانا اور باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ بنانا (البقرۃ: ۴۲)

۷۔ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ اور اللہ کے عہد کو توڑنا (البقرۃ: ۸۳)

۸۔ دوسروں کو نیکی کرنے کی تلقین لیکن اپنے آپ کو بھول جانا۔ آج کل ہم دوسروں کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن اپنے لئے یہ بہانہ کہ "ہم تو گنہگار لوگ ہیں"!

یہود کے اس طرز عمل پر نکیر کرتے ہوئے کہ ان کے پاس اللہ کی ہدایت (توریت) کی صورت میں موجود تھی لیکن وہ اسے پس پشت ڈال دیتے تھے اور پیروی کرنے لگے ان چیزوں کی جو شیاطین سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کا نام لے کر پیش کرتے تھے۔

آیت نمبر ۱۰۲ حاشیہ نمبر ۱۰۴ میں سید مودودیؒ نے وضاحت فرمائی کہ

"شیاطین سے مراد شیاطینِ جن اور شیاطینِ انس دونوں ہوسکتے ہیں اور دونوں ہی یہاں مراد ہیں۔ جب بنی اسرائیل پر اخلاقی اور مادی انحطاط کا دور آیا اور غلامی، جہالت، نکبت اور افلاس اور ذلت و پستی نے ان کے اندر بلند حوصلگی اولوالعزمی باقی نہ چھوڑی تو ان کی توجہات جادو ٹونے اور طلسمات و "عملیات" اور تعویذ گنڈوں کی طرف مبذول ہونے لگیں۔ وہ ایسی تدبیریں ڈھونڈنے لگے جن سے مشقت اور جدوجہد کے بغیر محض پھونکوں اور منتروں کے زور پر سارے کام بن جایا کریں۔ اس وقت شیاطین نے ان کو بہکانا شروع

کیا کہ سلیمان علیہ السلام کی عظیم الشان سلطنت اور ان کی حیرت انگیز طاقتیں تو سب کچھ چند نقوش اور منتروں کا نتیجہ تھیں اور وہ ہم تمہیں بتاتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر ان چیزوں پر ٹوٹ پڑے اور پھر نہ کتاب اللہ سے انہیں کوئی دلچسپی رہی اور نہ کسی داعی حق کی آواز انہوں نے سن کر دی۔"

آیت ۱۰۲ کے حاشیہ نمبر ۱۰۵ میں وضاحت کی کہ:

"اس آیت کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ جس زمانے میں بنی اسرائیل کی پوری قوم بابل میں قیدی اور غلام بنی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو انسانی شکل میں ان کی آزمائش کیلئے بھیجا ہوگا۔ جس طرح قوم لوط کے پاس فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں گئے تھے۔ اسی طرح اسرائیلیوں کے پاس وہ پیروں فقیروں کی شکل میں گئے ہونگے۔ وہاں ایک طرف انہوں نے بازارِ ساحری میں اپنی دکان لگائی ہوگی اور دوسری طرف وہ اتمام حجت کیلئے ہر ایک کو خبردار بھی کر دیتے ہونگے کہ

دیکھو ہم تمہارے لئے آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں، تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ مگر اس کے باوجود لوگ ان پیش کردہ عملیات اور نقش اور تعویذات پر ٹوٹے پڑتے ہونگے۔

ان عملیات اور تعویذ گنڈوں کی ضرورت اس لیے پیش آتی تھی کہ یہودی ان کے ذریعے "شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیں" (آیت ۱۰۱) ـــــ سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر جو تشریحی نوٹ لکھا ہے، وہ آج کل کے مسلم عوام اور ان کے ایسے پیروں/فقیروں کے لیے آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہونا چاہیے جو اس گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہیں۔ آپ نے تحریر کیا کہ "اس منڈی میں سب سے زیادہ چیز کی مانگ تھی، وہ یہ تھی کہ کوئی ایسا عمل یا تعویذ مل جائے جس سے ایک آدمی دوسرے کی بیوی کو اس سے توڑ کر اپنے اوپر عاشق کر لے ـــــ پست اخلاقی کا اس سے زیادہ نیچا مرتبہ اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ ایک قوم کے افراد کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ عورتوں سے آنکھ لڑانا ہوجائے اور کسی منکوحہ عورت کو اس کے شوہر سے توڑ کر اپنا کر لینے کو وہ اپنی سب سے بڑی فتح سمجھنے لگیں" (حاشیہ ۱۰۶)

اسی حاشیے کو مزید بڑھاتے ہوئے سید مودودی ؒ نے لکھا کہ ''ازدواجی تعلق درحقیقت انسانی تمدن کی جڑ ہے۔عورت اور مرد کے تعلق کی درستی پر پورے انسانی تمدن کی درستی کا اور اس کی خرابی پر پورے انسانی تمدن کی خرابی کا دارومدار ہے۔لہٰذا وہ شخص بدترین مفسد ہے جو اس درخت کی جڑ پر تیشہ چلاتا ہو جس کے قیام پر خود اس کا اور پوری سوسائٹی کا قیام منحصر ہے۔حدیث میں آتا ہے کہ ابلیس اپنے مرکز سے زمین کے ہر گوشے میں اپنے ایجنٹ روانہ کرتا ہے۔پھر وہ ایجنٹ واپس آ کر اپنی اپنی کارروائیاں سناتے ہیں۔کوئی کہتا ہے: میں نے فلاں فتنہ برپا کیا۔کوئی کہتا ہے: میں نے فلاں شر کھڑا کیا۔مگر ابلیس ہر ایک سے کہتا جاتا ہے کہ تو نے کچھ نہ کیا۔پھر ایک آتا ہے اور اطلاع دیتا ہے کہ میں ایک عورت اور شوہر میں جدائی ڈال آیا ہوں۔یہ سن کر ابلیس اس کو گلے لگا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو کام کر کے آیا ہے۔اس حدیث پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ آ جاتی ہے کہ بنی اسرائیل کی آزمائش کو جو فرشتے بھیجے گئے تھے، انہیں کیوں حکم دیا گیا کہ عورت اور مرد کے درمیان جدائی ڈالنے کا ''عمل'' ان کے سامنے پیش کریں۔دراصل یہی ایک ایسا پیمانہ تھا جس سے ان کے اخلاقی زوال کو ٹھیک ٹھیک ناپا جا سکتا تھا'' (حاشیہ نمبر ۱۰۶)

یہاں اگر ہم اپنی موجودہ سوسائٹی (بالخصوص لبرل اور کسی حد تک متمول خاندانوں) کا حوالہ دیں تو ہر چند کسی کو ''تلخئ گفتگو'' یا الزام تراشی کا گلہ'' نہیں ہونا چاہیے۔کیا ماضی قریب اور موجودہ دور میں کلبوں/ ہوٹلوں اور نائٹ ہاؤسز میں جو کچھ ثقافت کے نام پر ہو رہا ہے، اسے کسی طور پر بھی بنی اسرائیل کے درج بالا ''شیطانی عمل'' سے بہتر قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیا اس ملک کے وڈیرے زمینداروں نے قیام پاکستان سے پہلے کی ''انگریز کی بخششیں'' اور بعد از قیام پاکستان ''لوٹ کھسوٹ'' کے نتیجے میں پکنک پارٹیوں کے ذریعے راتوں کو جنگل میں شکار کے بہانے طبقۂ امراء کی بہو بیٹیوں کو نہیں ورغلایا (تہمینہ درانی) اور اس ملک پر حکمرانی بھی کرتے رہے؟ (وکیل انجم)۔اور کیا اسی ملک کے بہت بڑے ترقی یافتہ صوبے میں دن دیہاڑے سکول کی بچیوں کی برآمدگی گورنر ہاؤس سے نہیں

ہوئی؟ ضرورت تو اس امر کی تھی کہ ایسے حکمران اوران کے داشتہ پر داشتہ لوگ خودکشی نہیں تو کم از کم اپنے عہدوں سے علیحدگی اختیار کر لیتے، میدانِ سیاست سے مکمل علیحدگی اختیار کر لیتے لیکن آج بھی وہ اوران کے خاندانوں کی خواتین اپنے ہتھکنڈوں سے نہ صرف یہ کہ باز نہیں آتے بلکہ نئے جال لائے پرانے شکاری کی مثل کے تحت آج بھی ملک وملت کو بے راہ روکرنے میں لگے ہوئے ہیں!

سورہ البقرہ کے آیات ۱۳۴ تا ۱۴۱، اختتام پارہ نمبر ا یہود ونصاریٰ کے چند زعم باطلہ کا ذکر ہے مثلاً

☆...... یہود ونصاریٰ کا کہنا کہ یہودی/نصرانی بن جاؤ اگر ہدایت کی تلاش ہے......اس کی تردید یہ کہہ کر کی گئی کہ ''بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کا طریقہ۔ اور ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام مشرکوں میں سے نہ تھا'' (آیت ۱۳۴)

''حاشیہ نمبر ۱۳۵ میں اسی آیت کی تشریح یوں کی گئی کہ ''اس جواب کی لطافت سمجھنے کے لیے دو باتیں نگاہ میں رکھئے: ایک یہ کہ یہودیت اور نصرانیت دونوں بعد کی پیداوار ہیں۔ ''یہودیت'' اپنے اس نام اور اپنی مذہبی خصوصیات اور رسوم وقواعد کے ساتھ تیسری چوتھی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئی۔ اور ''عیسائیت'' جن عقائد اور مخصوص مذہبی تصورات کے مجموعے کا نام ہے وہ تو حضرت مسیح عَلَیْہِ السَّلَام کے بھی ایک مدت بعد وجود میں آئے ہیں۔ اب یہ سوال خودبخود پیدا ہوتا ہے کہ اگر آدمی کے برسر ہدایت ہونے کا مدار یہودیت یا عیسائیت اختیار کرنے پر ہی ہے، تو حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام اور دوسرے انبیاء اور نیک لوگ جو ان مذہبوں کی پیدائش سے پہلے پیدا ہوئے تھے اور جن کو خود یہودی اور عیسائی بھی ہدایت یافتہ مانتے ہیں، وہ آخر کس چیز سے ہدایت پاتے تھے؟ ظاہر ہے کہ وہ ''یہودیت'' اور ''عیسائیت'' نہ تھی۔ لہٰذا یہ بات آپ سے آپ واضح ہوگئی کہ انسان کے ہدایت یافتہ ہونے کا مدار ان مذہبی خصوصیات پر نہیں ہے، جن کی وجہ سے یہ یہودی اور عیسائی وغیرہ مختلف فرقے بنے ہیں، بلکہ دراصل اس کا مدار اس عالمگیر صراطِ مستقیم کے اختیار کرنے پر ہے جس

سے ہر زمانے میں انسان ہدایت پاتے رہے ہیں۔''

''دوسرے یہ کہ خود یہود و نصاریٰ کی اپنی مقدس کتابیں اس بات پر گواہ ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک اللہ کے سوا کسی دوسرے کی پرستش، تقدیس، بندگی اور اطاعت کے قائل نہ تھے۔ اور ان کا مشن ہی یہ تھا کہ خدائی کی صفات وخصوصیات میں اللہ کے سوا کسی اور کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ لہٰذا یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہودیت اور نصرانیت دونوں اس راہِ راست سے منحرف ہوگئی ہیں جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام چلتے تھے، کیونکہ ان دونوں میں شرک کی آمیزش ہوگئی ہے''(حاشیہ ۱۳۵)

اسی سلسلے کو مزید بڑھاتے ہوئے یہود و نصاریٰ سے یہ چند سوال کہ ''یا پھر کیا تمہارا کہنا یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام، اسحٰق علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام، اور اولادِ یعقوب علیہ السلام سب سے سب یہودی تھے یا نصرانی تھے؟ کہو ''تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جس کے ذمہ اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے ـــــ'' (مختصر معنی آیات ۱۴۰ تا ۱۴۲ سورہ البقرہ) ـــــ درج بالا سوالات کی تشریح میں سید مودودی نے حاشیہ نمبر ۱۴۰ میں لکھا کہ

یہود و نصاریٰ کا ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کو یہودی یا نصرانی کہنا (البقرۃ: ۱۴۰) سیدؒ مرحوم نے لکھا کہ ''یہ خطاب یہود و نصاریٰ کے ان جاہل عوام سے ہے جو واقعی اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ یہ جلیل القدر انبیاء سب کے سب یہودی یا عیسائی تھے'' مزید حاشیہ نمبر ۱۴۱ میں لکھا کہ

''ان کے علماء اس حقیقت سے ناواقف نہ تھے کہ یہودیت اور عیسائیت اپنی موجودہ خصوصیات کے ساتھ بہت بعد میں پیدا ہوئیں...... ان علماء سے جب یہ پوچھا جاتا تھا کہ اگر یہی بات ہے تو حضرات ابراہیم علیہ السلام، اسحاق، یعقوب علیہم السلام آخر تمہارے ان فرقوں میں سے کس سے تعلق رکھتے تھے تو وہ اس کا جواب دینے سے گریز کرتے تھے کیونکہ ان کا علم انہیں یہ کہنے کی اجازت تو نہ دیتا تھا کہ ان بزرگوں کا تعلق ہمارے ہی فرقے سے تھا۔

لیکن اگر وہ صاف الفاظ میں یہ مان لیتے کہ یہ انبیاء نہ یہودی تھے نہ عیسائی تو پھر ان کی حجت ہی ختم ہو جاتی تھی۔"

اسی ضمن میں سورہ آل عمران (آیت ۶۵) میں یہود و نصاری کا اللہ کے رسولؐ سے جھگڑا کرنا......اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"تورات اور انجیل تو ابراہیم کے بعد میں نازل ہوئی ہیں۔"

سید مودودی نے حاشیہ نمبر ۵۸ میں واضح کیا

"یعنی تمہاری یہ یہودیت اور نصرانیت بہر حال تورات اور انجیل کے نزول کے بعد پیدا ہوئی ہیں، اور ابراہیم علیہ السلام ان دونوں کے نزول سے بہت پہلے گزر چکے تھے۔ یوں ابراہیم علیہ السلام جس مذہب پر تھے وہ بہر حال یہودیت اور نصرانیت تو نہ تھا۔(مزید حوالہ جات کے لئے اکیلے سورہ البقرہ حاشیہ ۱۳۵، ۱۴۱)

تحویل قبلہ پر واویلا:

سورۃ البقرۃ آیت ۱۴۲ میں تحویل قبلہ پر اعتراض کا جواب دیتے ہوئے قرآن مجید نے ہدایت دی کہ

"ان سے کہو مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک "امت وسط" بنایا ہے تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔"

سورہ البقرہ کی آیت ۱۴۲ کے حاشیہ ۱۴۲ میں سید مودودی نے تشریح کی۔ ''نبی ﷺ ہجرت کے بعد مدینۂ طیبہ میں سولہ یا سترہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ پھر کعبے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم آیا، جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔''

حاشیہ ۱۴۳۔ ''یہ ان نادانوں کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ ان کے دماغ تنگ تھے، نظر محدود تھی، سمت اور مقام کے بندے بنے ہوئے تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ خدا کسی

خاص سمت میں مقید ہے۔اس لئے سب سے پہلے ان کے جاہلانہ اعتراض کی تردید میں یہی فرمایا گیا کہ مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔کسی سمت کو قبلہ بنانے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اللہ اسی طرف ہے۔جن لوگوں کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے وہ اس قسم کی تنگ نظریوں سے بالاتر ہوتے ہیں اور ان کے لئے عالمگیر حقیقتوں کے ادراک کی راہ کھل جاتی ہے۔(مزید ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۱۱۵،۱۱۶)''

سورہ البقرہ کے حاشیہ ۱۴۴ میں وضاحت کی کہ ''یہ امتِ محمد ﷺ کی امامت کا اعلان ہے۔**"اسی طرح"** کا اشارہ دونوں طرف ہے: اللہ کی اس رہنمائی کی طرف بھی، جس سے محمد ﷺ کی پیروی کرنے والوں کو سیدھی راہ معلوم ہوئی اور وہ ترقی کرتے کرتے اس مرتبے پر پہنچے کہ "امتِ وسط" قرار دیئے گئے اور تحویل قبلہ کی طرف بھی۔محض ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف پھرنا سمجھ رہے ہیں، حالانکہ دراصل بیت المقدس سے کعبے کی طرف سمتِ قبلہ کا پھرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو دنیا کی پیشوائی کے منصب سے باضابطہ معزول کیا اور امتِ محمدیہ کو اس پر فائز کر دیا۔''"امتِ وسط" کا لفظ اس قدر وسیع معنویت اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی دوسرے لفظ سے اس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔اس سے مراد ایک ایسا اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے، جو عدل و انصاف اور توسط کی روش پر قائم ہو، جو دنیا کی قوموں کے درمیان صدر کی حیثیت رکھتا ہو، جس کا تعلق سب کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلق ہو اور ناحق، ناروا تعلق کسی سے نہ ہو۔''

''پھر یہ جو فرمایا کہ تمہیں "امتِ وسط" اس لئے بنایا گیا ہے کہ "تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو" تو اس سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں جب پوری نوعِ انسانی کا اکٹھا حساب لیا جائے گا اس وقت رسول ہمارے ذمہ دار نمائندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دے گا کہ فکرِ صحیح اور علمِ صالح اور نظامِ عدل کی جو تعلیم ہم نے اسے دی تھی وہ اس نے تم کو بے کم و کاست پوری کی پوری پہنچا دی اور عملاً اس کے مطابق کام کر کے دکھا دیا۔اس کے بعد رسول کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے اٹھنا

ہوگا اور یہ شہادت دینی ہوگی کہ انہوں نے جو کچھ تمہیں پہنچایا تھا وہ تم نے انہیں پہنچانے میں اور جو کچھ رسول نے تمہیں دکھایا تھا وہ تم نے انہیں دکھانے میں اپنی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی۔'' (حاشیہ ۱۴۴)

حاشیہ ۱۴۴ کے تسلسل میں مزید کہا ''اس طرح کسی شخص یا گروہ کا اس دنیا میں خدا کی طرف سے گواہی کے منصب پر مامور ہونا ہی درحقیقت اس کا امامت اور پیشوائی کے مقام پر سرفراز کیا جانا ہے۔ اس میں جہاں فضیلت اور سرفرازی ہے وہیں ذمہ داری کا بہت بڑا بار بھی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ اس امت کے لئے خدا ترسی، راست روی، عدالت اور حق پرستی کی زندہ شہادت بنے، اسی طرح اس امت کو بھی تمام دنیا کے لئے زندہ شہادت بننا چاہئے، حتیٰ کہ اس کے قول اور عمل اور برتاؤ، ہر چیز کو دیکھ کر دنیا کو معلوم ہو کہ خدا ترسی اس کا نام ہے، راست روی یہ ہے، عدالت اس کو کہتے ہیں اور حق پرستی ایسی ہوتی ہے۔ پھر اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ جس طرح خدا کی ہدایت ہم تک پہنچانے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری بڑی سخت تھی، حتیٰ کہ اگر وہ اس میں ذرا سی کوتاہی بھی کرتے تو خدا کے ہاں ماخوذ ہوتے، اسی طرح دنیا کے عام انسانوں تک اس ہدایت کو پہنچانے کی نہایت سخت ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ اگر ہم خدا کی عدالت میں واقعی اس بات کی شہادت نہ دے سکے کہ ہم نے تیری ہدایت، جو تیرے رسول کے ذریعے سے ہمیں پہنچی تھی تیرے بندوں تک پہنچا دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی، تو ہم بہت بری طرح پکڑے جائیں گے اور یہی امامت کا فخر ہمیں وہاں لے ڈوبے گا۔ ہماری امامت کے دور میں ہماری واقعی کوتاہیوں کے سبب سے خیال اور عمل کی جتنی گمراہیاں دنیا میں پھیلی ہیں اور جتنے فساد اور فتنے خدا کی زمین میں برپا ہوئے ہیں، ان سب کے لئے ائمہ شر اور شیاطینِ انس و جن کے ساتھ ساتھ ہم بھی ماخوذ ہوں گے۔ ہم سے پوچھا جائے گا کہ جب دنیا میں معصیت، ظلم وار گمراہی کا یہ طوفان برپا تھا، تو تم کہاں مر گئے تھے۔''

تحویل قبلہ کے ضمن میں حاشیہ ۱۴۵ میں واضح کیا ''اس سے مقصود یہ دیکھنا تھا کہ کون

لوگ ہیں جو جاہلیت کے تعصّبات اور خاک وخون کی غلامی میں مبتلا ہیں اور کون ہیں جو ان بندشوں سے آزاد ہو کر حقائق کا صحیح ادراک کرتے ہیں۔ایک طرف اہلِ عرب اپنے وطنی و نسلی فخر میں مبتلا تھے اور عرب کے کعبے کو چھوڑ کر باہر کے بیت المقدس کو قبلہ بنانا ان کی اس قوم پرستی کے بت پر ناقابلِ برداشت ضرب تھا۔دوسری طرف بنی اسرائیل اپنی نسل پرستی کے غرور میں پھنسے ہوئے تھے اور اپنے آبائی قبلے کے سوا کسی دوسرے قبلے کو برداشت کرنا ان کے لئے محال تھا۔ظاہر ہے کہ یہ بت جن لوگوں کے دلوں میں بسے ہوئے ہوں وہ اس راستے پر کیسے چل سکتے تھے،جس کی طرف اللہ کا رسول انہیں بلا رہا تھا۔اس لئے اللہ نے ان بت پرستوں کو سچے حق پرستوں سے الگ چھانٹ دینے کے لئے پہلے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کیا تاکہ جو لوگ عربیت کے بت کی پرستش کرتے ہیں،وہ الگ ہو جائیں۔پھر اس قبلے کو چھوڑ کر کعبے کو قبلہ بنایا تاکہ جو اسرائیلیت کے پرستار ہیں،وہ بھی الگ ہو جائیں اس طرح صرف وہ لوگ رسول کے ساتھ رہ گئے،جو کسی بت کے پرستار نہ تھے محض خدا کے پرستار تھے۔''

سورہ البقرہ کی آیات ۱۴۳ کی تفسیر میں مفتی محمد شفیعؒ نے وضاحت کی کہ ''امت معتدل'' کی تشریح وتوضیح میں بہت تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے۔(ص ۳۶۵ تا ۳۹۰ تفسیر ہذا)۔اس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

☆......لفظ وسط بمعنی اوسط ہے اور خیر الامور اور افضل اشیاء کو وسط کہا جاتا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے لفظ وسط کی تفسیر عدل سے کی ہے۔

☆......اعتدالِ امت کے ضمن میں مفتی صاحب نے اپنی گفتگو میں اعتدال کے معنی اور حقیقت،وصف اعتدال کی اہمیت اور امت محمدیہ کے معتدل ہونے کے ثبوت کے ضمن میں تحریر فرمایا ہے۔اسی سلسلے میں سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۱۰ کا حوالہ دیا۔

اس تسلسل میں مفتی صاحب نے اعتقادی اعتدال،عمل اور عبادات میں اعتدالی،معاشرتی اور تمدنی اعتدال کے علاوہ اقتصادی اور مالی اعتدال کے ضمنی موضوعات کے تحت امت مسلمہ کی حالت وسط واعتدال کی تشریح فرمائی۔

اس ضمن میں آیات ۱۴۳ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی اس خواہش کو پورا فرما دیا کہ

''اب پھیر منہ اپنا طرف مسجد الحرام کے اور جس جگہ تم ہوا کرو پھیرو منہ اسی کی طرف'' (آیت ۱۴۳) مزید تفصیلات کے لیے اصل تفسیر کا مطالعہ مفید رہے گا۔

حاشیہ ۱۴۶ میں واضح کیا کہ ''یہ ہے وہ اصل حکم، جو تحویل قبلہ کے بارے میں دیا گیا تھا۔ یہ حکم شعبان ۲ ھ میں نازل ہوا۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ نبی ﷺ بشر بن براء بن معرور کے ہاں دعوت پر گئے ہوئے تھے۔ وہاں ظہر کا وقت آ گیا اور آپ لوگوں کو نماز پڑھانے کھڑے ہوئے۔ دو رکعتیں پڑھا چکے تھے کہ تیسری رکعت میں یکا یک وحی کے ذریعہ سے یہ آیت نازل ہوئی اور اسی وقت آپ ﷺ اور آپ کی اقتدا میں جماعت کے تمام لوگ بیت المقدس سے کعبے کے رخ پھر گئے اس کے بعد مدینہ اور اطرافِ مدینہ میں اس کی عام منادی کی گئی۔ براء بن عازب کہتے ہیں کہ ایک جگہ منادی کی آواز اس حالت میں پہنچی کہ لوگ رکوع میں تھے۔ حکم سنتے ہی سب کے سب اسی حالت میں کعبے کی طرف مڑ گئے۔ انس بن مالک کہتے ہیں کہ بنی سلمہ میں یہ اطلاع دوسرے روز صبح کی نماز کے وقت پہنچی۔ لوگ ایک رکعت پڑھ چکے تھے کہ ان کے کانوں میں آواز پڑی: "خبردار رہو، قبلہ بدل کر کعبے کی طرف کر دیا گیا ہے۔" سنتے ہی پوری جماعت نے اپنا رخ بدل دیا۔''

حاشیہ ۱۴۶ میں ہے ''خیال رہے کہ بیت المقدس مدینے سے عین شمال میں ہے اور کعبہ بالکل جنوب میں۔ نماز باجماعت پڑھتے ہوئے قبلہ تبدیل کرنے میں لامحالہ امام کو چل کر مقتدیوں کے پیچھے آنا پڑا ہوگا اور مقتدیوں کو صرف رخ ہی نہ بدلنا پڑا ہوگا بلکہ کچھ نہ کچھ انہیں بھی چل کر اپنی صفیں درست کرنی پڑی ہوں گی۔ چنانچہ بعض روایات میں یہی تفصیل مذکور بھی ہے۔''

اور یہ جو فرمایا کہ

"ہم تمہارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں" اور یہ کہ "ہم اسی قبلے کی

طرف تمہیں پھیرے دیتے ہیں جسے تم پسند کرتے ہو"اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تحویلِ قبلہ کا حکم آنے سے پہلے نبی ﷺ اس کے منتظر تھے۔ آپ خود یہ محسوس فرمارہے تھے کہ بنی اسرائیل کی امامت کا دور ختم ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ بیت المقدس کی مرکزیت بھی رخصت ہوئی۔ اب اس مرکزِ ابراہیمی کی طرف رخ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔''

مفتی محمد شفیع (۲۰۱۱) نے اپنی تفسیر میں بھی تحویل قبلہ کے بارے میں بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ من جملہ دیگر معلومات انہوں نے وضاحت کی کہ ''اسی طرح ایک اہم چیز سمت قبلہ کی وحدت بھی ہے۔ اگرچہ اللہ جل شانہٗ کی ذات پاک ہر سمت و جہت سے بالاتر ہے، اس کے لیے شش جہات یکساں ہیں لیکن نماز میں اجتماعی صورت اور وحدت پیدا کرنے کے لیے تمام دنیا کے انسانوں کا رخ کسی ایک ہی جہت و سمت کی طرف ہونا ایک بہترین اور آسان اور بے قیمت وحدت کا ذریعہ ہے، جس پر سارے مشرق و مغرب اور جنوب و شمال کے انسان آسانی سے جمع ہو سکتے ہیں''......مزید فرمایا کہ اس جہت کا فیصلہ انسانوں پر چھوڑنا ازحد خطرناک تھا، اس لیے ''اس کا تعین خود حضرت جل شانہٗ کی طرف سے ہوتا''______ اسی طرح جب حضرت آدم کو زمین میں بھیجا گیا تو فرشتوں کے ذریعے بیت اللہ کعبہ کی بنیاد پہلے ہی رکھ دی گئی تھی (۳:۹۶۔ ص ۳۶۱ تفسیر معارف القرآن جلد اوّل) بعد ازاں حضرت نوح علیہ السلام کا قبلہ یہی بیت اللہ تھا______ طوفانِ نوح کے بعد حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے دوبارہ اس کی تعمیر کی______ ''اس کے بعد انبیاء بنی اسرائیل کے لیے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا گیا اور بقول ابوالعالیہ انبیاء سابقین جو بیت المقدس میں نماز پڑھتے تھے وہ بھی عمل ایسا کرتے تھے کہ صخرہ بیت المقدس بھی سامنے رہے اور بیت اللہ بھی'' (ص ۳۶۲)۔ اس ضمن میں مزید تفصیلات بھی مفتی مرحوم نے درج کی ہیں جو دیکھنے کے لائق ہیں (خلاصہ صفحات ۳۵۹ تا ۳۶۴) مزید آیات ۱۴۵ تک۔

سورہ آل عمران آیات ۷۵ تا ۷۶ میں یہود کے مالی معاملات میں بے ایمانی کی ذہنیت پر تنقید کی گئی ہے۔ یہ محض یہودی عوام ہی کا جاہلانہ خیال نہ تھا، بلکہ ان کے ہاں مذہبی

تعلیم ہی یہی کچھ تھی اور ان کے بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں کے فقہی احکام ایسے ہی تھے۔'' مودودیؒ نے لکھا: بائبل قرض اور سود کے احکام میں اسرائیل اور غیر اسرائیلی کے درمیان صاف تفریق کرتی ہے (استثناء ۱:۱۵، ۳-۲ : ۲۳) تلمود میں کہا گیا ہے کہ اگر اسرائیل کا بیل کسی غیر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کر دے تو اس پر کوئی تاوان نہیں، مگر غیر اسرائیلی کا بیل اگر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کر دے تو اس پر تاوان ہے۔"—— "ربی شماعیل کہتا ہے کہ اگر اُمّی اور اسرائیلی کا مقدمہ قاضی کے پاس آئے تو قاضی اگر اسرائیلی قانون کے مطابق اپنے مذہبی بھائی کو جتوا سکتا ہو تو اس کے مطابق جتوائے اور کہے کہ یہ ہمارا قانون ہے اور اگر امیوں کے قانون کے تحت جتوا سکتا ہے تو اس کے تحت جتوائے اور کہے یہ تمہارا قانون ہے۔ اور اگر دونوں قانون ساتھ نہ دیتے ہوں تو پھر جس حیلے سے بھی وہ اسرائیلی کو کامیاب کر سکتا ہو کرے۔'' ربی شموائیل مزید کہتا ہے کہ غیر اسرائیلی کی ہر غلطی سے فائدہ اٹھانا چاہیئے" (بحوالہ سورہ آل عمران: آیت ۷۵ حاشیہ ۶۴۔ سید مودودی کی تفسیر)

اس ضمن میں یہودیوں کی اس چال کا ذکر بھی سورہ آل عمران کی آیت ۷۸ ''کہ وہ کتاب پڑھتے ہوئے زبان کا الٹ پھیر کر دیتے ہیں'' کے ضمن میں سید مودودیؒ نے لکھا

"اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کتاب الٰہی کے معانی میں تحریف کرتے ہیں" یا الفاظ کا الٹ پھیر کر کے کچھ سے کچھ مطلب نکال لیتے ہیں، لیکن اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ وہ کتاب کو پڑھتے ہوئے کسی خاص لفظ یا فقرے کو، جو ان کے مفاد یا ان کے خود ساختہ عقائد و نظریات کے خلاف پڑتا ہو، زبان کی گردش سے کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ اس کی نظیریں قرآن کو ماننے **والے اہل کتاب** میں بھی مفقود نہیں ہیں۔ مثلاً جو بعض لوگ جو نبی کی بشریت کے منکر ہیں آیت ''قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ'' میں اِنَّمَآ کو اِنَّ مَا پڑھتے ہیں اور اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ **اے نبی! کہہ دو کہ تحقیق نہیں ہوں میں بشر تم جیسا**۔ (حاشیہ ۶۶)

اسی سورت کی آیت ۹۲ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز سمجھتے ہو"

اس آیت کی تشریح میں سید مودودی کا نوٹ ذیل میں درج ہے (حاشیہ نمبر ۷۵)

"اس سے مقصود ان کی اس غلط فہمی کو دور کرنا ہے جو وہ "نیکی" کے بارے میں رکھتے تھے۔ ان کے دماغوں میں نیکی کا بلند سے بلند تصور بس یہ تھا کہ صدیوں کے توارث سے "تشرع" کی جو ایک خاص ظاہری شکل ان کے ہاں بن گئی تھی اس کا پورا چربہ آدمی اپنی زندگی میں اتار لے اور ان کے علماء کی قانونی موشگافیوں سے جو ایک لمبا چوڑا فقہی نظام بن گیا تھا اس کے مطابق رات دن زندگی کے چھوٹے چھوٹے ضمنی وفروعی معاملات کی ناپ تول کرتا رہے۔ اس تشرع کی اوپری سطح کے نیچے بالعموم یہودیوں کے بڑے بڑے "دیندار" لوگ تنگ دلی، حرص، بخل، حق پوشی اور حق فروشی کے عیوب چھپائے ہوئے تھے اور رائے عام ان کو نیک سمجھتی تھی۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے انہیں بتایا جارہا ہے کہ "نیک انسان" ہونے کا مقام ان چیزوں سے بالاتر ہے جن کو تم نے مدارِ خیر وصلاح سمجھ رکھا ہے۔ نیکی کی اصل روح خدا کی محبت ہے، ایسی محبت کہ رضائے الٰہی کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی چیز عزیز تر نہ ہو۔ جس چیز کی محبت بھی آدمی کے دل پر اتنی غالب آجائے کہ وہ اسے خدائی محبت پر قربان نہ کرسکتا ہو، بس وہی بت ہے اور جب تک اس بت کو آدمی توڑ نہ دے، نیکی کے دروازے اس پر بند ہیں۔ اس روح سے خالی ہونے کے بعد ظاہری تشرع کی حیثیت محض چمکدار روغن کی سی ہے جو گھن کھائی ہوئی لکڑی پر پھیر دیا گیا ہو۔ انسان ایسے روغنوں سے دھوکا کھا سکتے ہیں، مگر خدا نہیں کھا سکتا۔"

سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۹۳ کی تشریح یوں کی "قرآن اور محمدؐ کی تعلیمات پر جب علماء یہود کوئی اصولی اعتراض نہ کرسکے، کیونکہ اساسِ دین جن امور پر ہے ان میں انبیاء سابقین کی تعلیمات اور نبیؐ عربی کی تعلیم میں یک سرمو فرق نہ تھا تو انہوں نے فقہی اعتراضات شروع کردیئے۔ اس سلسلہ میں ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ آپ نے کھانے پینے کی بعض ایسی چیزوں کو حلال قرار دیا ہے جو پچھلے انبیاء کے زمانہ سے حرام چلی آرہی ہیں۔ اس اعتراض کا جواب (ان آیات میں) دیا جارہا ہے۔" (حاشیہ ۷۶)

سورۃ النساء کی آیت نمبر ۲۷ کی تشریح حاشیہ نمبر ۴۹ میں یوں کی گئی ہے:

''یہ اشارہ ہے منافقین اور قدامت پرست جہلاء اور نواحی جہلاء اور نواحی مدینہ کے یہودیوں کی طرف۔ منافقین اور قدامت پرستوں کو تو وہ اصلاحات سخت ناگوار تھیں جو تمدن و معاشرت میں صدیوں کے جمے اور رچے ہوئے تعصّبات اور رسم و رواج کے خلاف کی جا رہی تھیں۔ میراث میں لڑکیوں کا حصہ۔ بیوہ عورت کا سسرال کی بندشوں سے رہائی پانا اور عدت کے بعد اس کا ہر شخص سے نکاح کے لئے آزاد ہو جانا۔ سوتیلی ماں سے نکاح حرام ہونا۔ دو بہنوں کے ایک ساتھ نکاح میں جمع کئے جانے کو ناجائز قرار دینا۔ متبنیٰ کو وراثت سے محروم کرنا اور منہ بولے باپ کیلئے متبنیٰ کی بیوہ اور مطلقہ کا حلال ہونا۔ یہ امور اور اسی طرح کی دوسری اصلاحات میں سے ایک ایک چیز ایسی تھی جس پر بڑے بوڑھے اور آبائی رسوم کے پرستار چیخ چیخ اٹھتے تھے۔ مدتوں ان احکام پر چہ میگوئیاں ہوتی رہتی تھیں۔ شرارت پسند لوگ ان باتوں کو لے کر نبی ﷺ آپ کی دعوتِ اصلاح کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتے پھرتے تھے۔ مثلاً جو شخص کسی ایسے نکاح سے پیدا ہوا تھا جسے اب اسلامی شریعت حرام قرار دے رہی تھی اس کو یہ کہہ کہہ کر اشتعال دلایا جاتا تھا کہ لیجئے، آج جو نئے احکام وہاں آئے ہیں ان کی رو سے آپ کی ماں اور آپ کے باپ کا تعلق ناجائز ٹھہرا دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ نادان لوگ اس اصلاح کے کام میں رکاوٹیں ڈال رہے تھے جو اس وقت احکامِ الٰہی کے تحت انجام دیا جا رہا تھا۔ اس تسلسل میں مزید لکھا کہ

''دوسری طرف یہودی تھے جنہوں نے صدیوں کی موشگافیوں سے اصلی خدائی شریعت پر اپنے خود ساختہ احکام و قوانین کا ایک بھاری خول چڑھا رکھا تھا۔ بے شمار پابندیاں اور باریکیاں اور سختیاں تھیں جو انہوں نے شریعت میں بڑھا لی تھیں۔ بکثرت حلال چیزیں ایسی تھیں جنہیں وہ حرام کر بیٹھے تھے۔ بہت سے اوہام تھے جن کو انہوں نے قانون خداوندی میں داخل کر لیا تھا۔ اب یہ بات ان کے علماء اور عوام دونوں کی ذہنیت اور مذاق کے بالکل خلاف تھی کہ وہ اس سیدھی سادھی شریعت کی قدر پہچان سکتے جو قرآن پیش

کر رہا تھا۔ وہ قرآن کے احکام کو سن کر بے تاب ہو جاتے تھے۔ ایک ایک چیز پر سوسو اعتراضات کرتے تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ یا تو قرآن ان کے فقہاء کے تمام اجتہادات اور ان کے اسلاف کے سارے اوہام وخرافات کو شریعتِ الٰہی قرار دے، ورنہ یہ ہرگز کتابِ الٰہی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر یہودیوں کے ہاں دستور تھا کہ ایامِ ماہواری میں عورت کو بالکل پلید سمجھا جاتا تھا۔ نہ اس کا پکایا ہوا کھانا کھاتے۔ نہ اس کے ہاتھ کا پانی پیتے۔ نہ اس کے ساتھ فرش پر بیٹھتے۔ بلکہ اس کے ہاتھ سے ہاتھ چھو جانے کو بھی مکروہ سمجھتے تھے۔ ان چند دنوں میں عورت خود اپنے گھر میں اچھوت بن کر رہ جاتی تھی۔ یہی رواج یہودیوں کے اثر سے مدینہ کے انصار میں بھی چل پڑا تھا۔ جب نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے تو آپ سے اس کے متعلق سوال کیا گیا۔ جواب میں وہ آیت آئی جو سورہ بقرہ (آیت ۲۲۲) کے آغاز میں درج ہے۔ نبی ﷺ نے اس آیت کی رو سے حکم دیا کہ ایامِ ماہواری میں صرف مباشرت ناجائز ہے۔ باقی تمام تعلقات عورتوں کے ساتھ اسی طرح رکھے جائیں جس طرح دوسرے دنوں میں ہوتے ہیں۔ اس پر یہودیوں میں شور مچ گیا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ شخص تو قسم کھا کر بیٹھا ہے کہ جو جو کچھ ہمارے ہاں حرام ہے اسے حلال کر کے رہے گا اور جس جس چیز کو ہم ناپاک کہتے ہیں اسے پاک قرار دے گا۔"

یہودی علماء کی اسی قسم کی حرکتوں کا ذکر سورہ النساء (آیت ۴۶) میں یوں کیا گیا "جو لوگ یہودی بن گئے ہیں ان میں کچھ لوگ ہیں جو الفاظ کو ان کے محل سے پھیر دیتے ہیں۔ اور دینِ حق کے خلاف نیش زنی کرنے کے لیے اپنی زبان کو توڑ موڑ کر کہتے ہیں"......

سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا اور اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ اور رَاعِنَا حالانکہ اگر وہ کہتے سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا اور اِسْمَعْ اور اُنْظُرْنَا تو یہ ان ہی کے لیے بہتر تھا اور زیادہ راست بازی کا طریقہ تھا۔ مگر ان پر تو ان کی باطل پرستی کی بدولت اللہ کی پھٹکار پڑی ہوئی ہے اس لیے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔"

ان آیات کی تشریح میں حاشیہ نمبر ۷۳ تا ۷۵ میں سید مودودی نے وضاحت کی کہ اس

کے تین مطلب ہیں۔ایک یہ کہ کتاب اللہ کے الفاظ میں ردوبدل کرتے ہیں۔دوسرے یہ کہ اپنی تاویلات سے آیات کتاب کے معنی کچھ سے کچھ بتادیتے ہیں۔تیسرے یہ کہ یہ لوگ محمد ﷺ اور آپ ﷺ کے پیروؤں کی صحبت میں آکر ان کی باتیں سنتے ہیں اور واپس جاکر لوگوں کے سامنے غلط طریقے سے روایت کرتے ہیں۔"(حاشیہ ۷۳)

جہاں تک زبان کو توڑ موڑ کر بات کرنے کا تعلق ہے تو سید مودودی نے وضاحت کی کہ "جب انہیں خدا کے احکام سنائے جاتے ہیں تو زور سے کہتے ہیں "**سمعنا**" (ہم نے سن لیا) اور آہستہ سے کہتے ہیں "عَصَيْنَا" (ہم نے قبول نہیں کیا) یا اَطَعْنَا (ہم نے قبول کیا) کا تلفظ اس انداز سے زبان کو لچکا دے کر کرتے ہیں کہ عَصَيْنَا بن جاتا ہے۔"(حاشیہ نمبر ۷۴)

اللہ تبارک تعالیٰ نے یہود کی اس شرارت کا توڑ کرنے کیلئے یہ ہدایت فرمائی کہ "اگر وہ کہتے **سمعنا و اطعنا** اور **اسمع** اور **انظرنا** تو یہ انہی کیلئے بہتر تھا"۔سید مودودی نے اس کی تشریح یوں کی کہ "دوران گفتگو میں جب وہ کوئی بات محمد ﷺ سے کہنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں **اسمع** (سنئے) اور پھر ساتھ ہی **غیر مسمع** بھی کہتے ہیں جو ذومعنی ہے۔اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ ایسے محترم ہیں کہ آپ کو کوئی بات خلاف مرضی نہیں سنائی جاسکتی۔دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں کوئی کچھ سنائے۔ایک اور مطلب یہ ہے کہ خدا کرے تم بہرے ہوجاؤ۔"(حاشیہ نمبر ۷۵)

☆......علماء اور مشائخ بنی اسرائیل کا ایک یہ بھی بہت بڑا جرم تھا کہ وہ یہود کی اکثریت کو گناہ، ظلم وار زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے دیکھتے تھے، حرام مال کھاتے اور بری حرکات کا ارتکاب کرتے دیکھتے تھے لیکن انہیں ان افعالِ شنیعہ سے روکتے نہیں تھے۔(المائدۃ:۶۲)

درج بالا متعدد جرائم کے بارے میں جو بنی اسرائیل کے اہل علم اور مذہبی لیڈروں میں پائے جاتے تھے، کا اگر ہم تقابلی مطالعہ موجودہ مسلم امت کے مذہبی راہ نماؤں سے کریں تو شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان میں سے اکثریت (الا ماشاء اللہ) ان تمام ورنہ بیشتر

جرائم کے مرتکب ہیں۔ امتِ مسلمہ کے عوام الناس میں جو اکثر شرک، منافقت اور ہندووانہ رسم ورواج فی زمانہ پائے جاتے ہیں اس کی واحد وجہ علمائے اسلام اور مذہبی لیڈروں کا دین کی صحیح تعلیم (قرآن، حدیث اور سیرت پاک) سے وہ اغماض ہے جسے انہوں نے اپنی ذاتی اغراض، فقہی دلچسپیوں اور دھڑے بندیوں کی بناء پر عوام الناس کی نظروں سے اوجھل رکھا ہوا ہے۔ صدیوں کے تعامل سے امت مسلمہ، بنی اسرائیل میں پائے جانے والے بیشتر اعمال وافعال کی پیروی کر رہی ہے لیکن منبر ومحراب سے ان کی اصلاح کرنے والا کوئی نہیں۔ ہر کوئی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے جمعہ، عیدین اور دیگر مواقع پر اپنی اپنی بھیڑوں کو اکٹھا رکھنے کیلئے اپنا اپنا راگ الاپنے میں مصروف ہیں لیکن جہاں تک الحادی قوتوں کا تعلق ہے وہ مسلسل نہایت یک جہتی اور تسلسل کے ساتھ امت کی نوجوان نسل کو گمراہ کرنے کیلئے ایک یا دو نکاتی ایجنڈے پر قدم بقدم گامزن ہیں اور انہیں روز بروز کامیابی نصیب ہو رہی ہے جن کی نشان دہی مختلف ابواب میں کر دی گئی ہے!

بنی اسرائیل کے جرائم کے ضمن میں اور بہت کچھ بھی لکھا جا سکتا ہے۔ اگر آج ہم امت مسلمہ کی حالت زار کا بے لاگ مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ کون سا جرم ہے جس سے آج ہمارا چہرہ داغ دار نہیں؟

تن ہمہ داغ دار شد، پنبہ کجا کجا نہم!

یہود کے چند مزید جرائم

☆......قرآنی سورتوں میں سورۃ الانفال ۲ ہجری میں مدینہ میں نازل ہوئی۔ اس سورت میں آیت نمبر ۵۵ میں یہود کی ان شرارتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو وہ معاہدۂ امن وصلح کی خلاف ورزی کے ضمن میں مسلمانوں سے روا رکھتے تھے۔ اس ضمن میں اس آیت کی تشریح یوں کی گئی ہے (حاشیہ نمبر ۴۱)

یہاں خاص طور پر اشارہ ہے یہود کی طرف۔ نبی ﷺ نے مدینہ طیبہ میں تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے انہی کے ساتھ حسنِ جوار اور باہمی تعاون ومددگاری کا معاہدہ

کیا تھا اور اپنی حد تک پوری کوشش کی تھی کہ ان سے خوشگوار تعلقات قائم رہیں۔ نیز دینی حیثیت سے بھی آپ یہود کو مشرکین کی بہ نسبت اپنے سے قریب تر سمجھتے تھے اور ہر معاملہ میں مشرکین کے بالمقابل اہل کتاب ہی کے طریقہ کو ترجیح دیتے تھے۔لیکن ان کے علماء اور مشائخ کو توحیدِ خالص اور اخلاقِ صالحہ کی وہ تبلیغ اور اعتقادی و عملی گمراہیوں پر وہ تنقید اور اقامت دین حق کی وہ سعی، جو نبی ﷺ کر رہے تھے، ایک آن نہ بھاتی تھی اور ان کی پیہم کوشش یہ تھی کہ یہ نئی تحریک کسی طرح کامیاب نہ ہونے پائے۔اسی مقصد کیلئے وہ مدینہ کے منافق مسلمانوں سے ساز باز کرتے تھے۔اسی کے لئے وہ اوس اور خزرج کے لوگوں میں ان پرانی عداوتوں کو بھڑکاتے تھے جو اسلام سے پہلے ان کے درمیان کشت وخون کی موجب ہوا کرتی تھیں۔ اسی کے لئے قریش اور دوسرے مخالفِ اسلام قبیلوں سے ان کی خفیہ سازشیں چل رہی تھیں اور یہ سب حرکات اس معاہدۂ دوستی کے باوجود ہو رہی تھیں جو نبی ﷺ اور ان کے درمیان لکھا جا چکا تھا۔ جب جنگ بدر واقع ہوئی تو ابتداء میں ان کو توقع تھی کہ قریش کی پہلی ہی چوٹ اس تحریک کا خاتمہ کر دے گی۔لیکن جب نتیجہ ان کی توقعات کے خلاف نکلا تو ان کے سینوں کی آتشِ حسد اور زیادہ بھڑک اٹھی۔انہوں نے اس اندیشہ سے کہ بدر کی فتح کہیں اسلام کی طاقت کو ایک مستقل "خطرہ" نہ بنا دے اپنی مخالفانہ کوششوں کو تیز تر کر دیا۔حتی کہ ان کا ایک لیڈر کعب بن اشرف (جو قریش کی شکست سنتے ہی چیخ اٹھا تھا کہ آج زمین کا پیٹ ہمارے لئے اس کی پیٹھ سے بہتر ہے) وہ خود مکہ گیا اور وہاں اس نے ہیجان انگیز مرثیے کہہ کہہ کر قریش کو انتقام کا جوش دلایا۔ اس پر بھی ان لوگوں نے بس نہ کی۔ یہودیوں کے قبیلۂ بنی قینقاع نے معاہدۂ حسنِ جوار کے خلاف اُن مسلمان عوتوں کو چھیڑنا شروع کیا جو ان کی بستی میں کسی کام سے جاتی تھیں۔ اور جب نبی ﷺ نے ان کو اس حرکت پر ملامت کی تو انہوں نے جواب میں دھمکی دی کہ "یہ قریش نباشد، ہم لڑنے مرنے والے لوگ ہیں اور لڑنا جانتے ہیں۔ ہمارے مقابلہ میں آؤ گے تب تمہیں پتہ چلے گا کہ مرد کیسے ہوتے ہیں۔"

باب سوئم

مکالماتِ قیامت: عوام وقائدین کے درمیان

قرآن کریم میں ان مکالمات کا ذکر آیا ہے جو روز قیامت اللہ تعالیٰ کے دربار میں دو گروہوں کے درمیان ہونگے۔اس میں پہلا گروہ جو دنیا میں زیردست/کمزور طبقے/رعایا/عام مذہبی پیروکاروں اور دوسرا طبقہ جو مترفین، (خوشحال طبقہ ELITE CLASS)، سیاسی قیادت پر قابض حکمران، مصلحین اخلاق وتعلیم، مذہبی راہ نماؤں اوراس قسم کے دیگر اصحاب پر مشتمل ہوگا جو دنیا میں انسانوں کی آراء بنانے میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مثلاً ذرائع ابلاغ کے متعلقہ اصحاب (اخبار نویس، ایڈیٹرز، کالم نگار، ٹی وی کے اینکر پرسن اور مالکان وغیرہ)۔قرآن مجید کا یہ ایک اعجاز ہے کہ مختلف سورتوں اور آیات میں ان تمام کرداروں کی تصویر اس عمدگی سے کھینچی گئی ہے کہ صرف اس ایک بات پر غور کرنے سے ہی ایک انسان اللہ تعالیٰ کی صفت غیب کا قائل ہوجاتا ہے کہ اس علیم وخبیر ذات باری تعالیٰ کے سامنے ماضی، حال اور مستقبل اور کائنات کی وسعتیں (زمان ومکان) کوئی حقیقت نہیں رکھتیں نیز اس نے اپنے کلام میں کمال ابلاغ کے ذریعے ماضی کے اُن تمام کرداروں کو اس طرح نمایاں کردیا ہے کہ سوچنے سمجھنے والوں کیلئے اُن کرداروں کو زمانہ حال میں پہچاننے میں قطعاً کوئی دقت بھی محسوس نہیں ہوتی!

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں!

قرآن مجید میں شرک کی تردید اور توحید کی تبلیغ کے ضمن میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے کلام کا ایک بہت ہی خصوصی پہلو ہے۔اس ضمن میں اگر یہ کہا جائے کہ قرآن نے

تصورتوحیداوراس کے مضمرات پرجس قدر بھرپور انداز میں انسانوں کوتوجہ دلائی ہے وہ اتباعِ رسول ﷺ کی شکل میں توحید کے انطباق (IMPLICATIVE ASPECT) سے تعلق رکھتی ہے اورتصور آخرت بھی دراصل اللہ تعالیٰ کے مالک الملک اور واحد قہار ہونے کی حیثیتوں کا ایک ایسا پہلو ہے جب وہ ذات اقدس تمام معاملات دنیا کا فیصلہ عدل وانصاف کی بنیاد پرفرمائے گی!

اگرچہ تصورتوحیداوررد شرک کے بارے میں قرآن مجید کی تمام تر آیات کا احاطہ کسی ایک کتاب میں ممکن نہیں (باب پنجم) تاہم سورۃ العنکبوت کی آیت:۲۵ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے کہے گئے یہ الفاظ بہت اہم ہیں کہ "اس نے کہا" تم نے دنیا کی زندگی میں تو اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو اپنے درمیان محبت کا ذریعہ بنالیا ہے مگر قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار اور ایک دوسرے پر لعنت کرو گے" اس آیت کی تشریح میں سید مودودی (حاشیہ نمبر ۴۲ اور ۴۳ میں) یوں رقمطراز ہیں:

"تم نے خدا پرستی کی بجائے الحاد، بت پرستی اور منافقت کی بنا پر اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر کر لی ہے جو دنیاوی زندگی کی حد تک تمہارا قومی شیرازہ باندھ سکتی ہے"—— تاہم "عقیدۂ باطلہ پر تمہاری یہ ہیئت اجتماعی آخرت میں نہیں رہ سکتی۔ وہاں آپس کی محبت، دوستی، تعاون، رشتہ داری، اورعقیدت وارادت کے صرف وہی تعلقات برقرار رہ سکتے ہیں جو دنیا میں خدائے واحد کی بندگی اور نیکی وتقویٰ پر قائم ہوئے ہوں۔ کفروشرک اور گمراہی و بدراہی پر جُڑے ہوئے سارے رشتے وہاں کٹ جائیں گے، ساری محبتیں دشمنی میں تبدیل ہو جائیں گی، ساری عقیدتیں نفرت میں بدل جائیں گی، بیٹے اور باپ، شوہر اور بیوی، پیر اور مرید تک ایک دوسرے پرلعنت بھیجیں گے اور ہر ایک اپنی گمراہی کی ذمہ داری دوسرے پر ڈال کر پکارے گا کہ اِس ظالم نے مجھے خراب کیا اس لیے اسے دوہرا عذاب دیا جائے۔''

یہ بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر فرمائی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ الزخرف میں فرمایا:

﴿اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَىِٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ﴾ (آیت نمبر ٦٧)

"دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے، سوائے متقین کے۔" اسی طرح سورۃ الاعراف میں فرمایا: ﴿كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ﴾ (آیت نمبر:۳۸) "ہر گروہ جب جہنم میں داخل ہوگا تو اپنے پاس والے گروہ پر لعنت کرتا ہوا داخل ہوگا حتیٰ کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے حق میں کہے گا کہ اے ہمارے رب، یہ لوگ تھے جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا، لہٰذا انہیں آگ کا دوہرا عذاب دے۔" اور سورۃ احزاب میں فرمایا: ﴿وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا۞ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَ الْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا۞﴾ (آیت:۶۷-۶۸) ''اور وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہم کو راہ سے بے راہ کر دیا، اے ہمارے رب تو انہیں دوہری سزا دے اور ان پر سخت لعنت فرما۔"

اپنے مطالعے کے لیے ہم نے قرآن کریم کی ۲۰ سورتوں کا انتخاب کیا ہے جن میں ان گروہوں/طبقات کے درمیان روزِ قیامت مکالمے ہوں گے جبکہ اس موضوع پر متعدد آیات میں بہت زیادہ تکرار پائی جاتی ہے! آیئے اب ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔

سورۃ الاعراف (۷:۳) میں اس پہلو کو یوں ادا کیا گیا ہے:

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۞

ترجمہ: "لوگو، جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو تم نصیحت کم ہی مانتے ہو۔"

اس کی تشریح حاشیہ ۴ میں ہے۔''یہاں "اولیاء" (سرپرستوں) کا لفظ اس معنی

میں استعمال ہوا ہے کہ انسان جس کی راہ نمائی پر چلتا ہے اسے درحقیقت اپنا ولی وسرپرست بناتا ہے۔خواہ زبان سے اس کی حمد وثناء کے گیت گاتا ہو یا اس پر لعنت کی بوچھاڑ کرتا ہو، خواہ اس کی سرپرستی کا معترف ہو یا بہ شدت اس سے انکار کرے۔'' (حاشیہ نمبر ۴)

اس بات کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ الشوریٰ (۶:۴۲) میں یوں واضح فرمایا: ﴿وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ۖ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ۝۶﴾ "جن لوگوں نے اس کو چھوڑ کر اپنے کچھ دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں اللہ ہی ان پر نگران ہے، تم ان کے حوالہ دار نہیں ہو" اس کی تفصیل میں سید مودودی نے لفظ اولیاء کی تشریح یوں کی ہے:

"اصل لفظ 'اولیاء' استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم عربی زبان میں بہت وسیع ہے۔ معبودان باطل کے متعلق گمراہ انسانوں کے مختلف عقائد اور بہت سے مختلف طرزِ عمل ہیں جن کو قرآن مجید میں 'اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا ولی بنانے' سے تعبیر کیا گیا ہے۔قرآن پاک کا تتبع کرنے سے لفظ 'ولی' کے حسب ذیل مفہومات معلوم ہوتے ہیں:

۱۔ جس کے کہنے پر آدمی چلے، جس کی ہدایت پر عمل کرے، اور جس کے مقرر کیے ہوئے طریقوں، رسموں اور قوانین وضوابط کی پیروی کرے۔ (النساء آیت ۱۱۸ تا ۱۲۰۔ الاعراف: ۲۷ تا ۳۰)"

۲۔ جن کی رہنمائی (Guidance) پر آدمی اعتماد کرے اور یہ سمجھے کہ وہ اُسے صحیح راستہ بتانے والا اور غلطی سے بچانے والا ہے۔ (البقرہ: ۲۵۷، بنی اسرائیل: ۹۷، الکھف: ۵۰، الجاثیہ: ۱۹)۔

۳۔ جس کے متعلق آدمی یہ خیال رکھتا ہے کہ میں دنیا میں خواہ کچھ کرتا رہوں، وہ مجھے اُس کے بُرے نتائج سے اگر خدا ہے اور آخرت بھی ہونے والی ہے تو اس کے عذاب سے بچا لے گا۔ (النساء: ۱۲۳-۱۷۳، الانعام: ۵۱، الرعد: ۳۷، العنکبوت: ۲۲، الاحزاب: ۶۵، الزمر: ۳)

۴۔ جس کے متعلق آدمی یہ سمجھے کہ وہ دنیا میں فوق الفطری طریقے سے اس کی مدد کرتا ہے، آفات و مصائب سے اس کی حفاظت کرتا ہے، اسے روزگار دلواتا ہے، اولاد دیتا ہے، مرادیں برلاتا ہے، اور دوسری ہر طرح کی حاجتیں پوری کرتا ہے۔ (ہود:۳، الرعد:۱۶، العنکبوت:۴۱)

> ''بعض مقامات پر قرآن میں ولی کا لفظ ان میں سے کسی ایک معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور بعض مقامات پر جامعیت کے ساتھ اس کے سارے ہی مفہومات مراد ہیں۔ آیت زیرِ تشریح بھی انہی میں سے ایک ہے۔ یہاں اللہ کے سوا دوسروں کو ولی بنانے سے مراد مذکورہ بالا چاروں معنوں میں ان کو اپنا سرپرست بنانا اور حامی و مددگار سمجھنا ہے۔'' (حاشیہ ۶)

حاشیہ نمبر ۷ میں لکھا ''جاہلیت کے معاشروں میں بالعموم یہ خیال پایا جاتا ہے کہ "حضرت" قسم کے لوگ ہر اُس شخص کی قسمت بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں جو ان کی شان میں کوئی گستاخی کرے۔ بلکہ مرجانے کے بعد اُن کی قبر کی بھی اگر کوئی توہین کر گزرے یا اور کچھ نہیں تو ان کے متعلق کوئی بُرا خیال ہی دل میں لے آئے تو وہ اس کا تختہ اُلٹ دیتے ہیں۔ یہ خیال زیادہ تر "حضرتوں" کا اپنا پھیلایا ہوا ہوتا ہے، اور نیک لوگ جو خود ایسی باتیں نہیں کرتے۔ اُن کے نام اور ان کی ہڈیوں کو اپنے کاروبار کا سرمایہ بنانے کے لیے کچھ دوسرے ہوشیار لوگ اُن کے متعلق اس خیال کو پھیلاتے ہیں۔ بہر حال عوام میں اِسے روحانیت و خدارسیدگی کا لازمہ سمجھا جاتا ہے کہ آدمی کو قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کے اختیارات حاصل ہوں۔ اسی فریب کا طلسم توڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ کفار کو سناتے ہوئے اپنے رسول پاک سے فرما رہا ہے کہ بلا شُبہ تم ہمارے پیغمبر ہو اور ہم نے اپنی وحی سے تمہیں سرفراز کیا ہے، مگر تمہارا کام صرف لوگوں کو سیدھا راستہ دکھانا ہے۔ اُن کی قسمتیں تمہارے حوالہ نہیں کر دی گئی ہیں۔ وہ ہم نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہیں۔ بندے کے اعمال کو دیکھنا اور اُن کو عذاب دینا یا نہ دینا ہمارا اپنا کام ہے۔''

''ولی اور ولایت کے برعکس ایک دوسری اصلاح ہے جسے قرآن مجید نے "طاغوت" کے لفظ سے موسوم کیا ہے۔(سورۃ البقرۃ:۲۵۵)۔اس میں اس لفظ طاغوت کی تشریح کی گئی جو ہم نے گذشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے۔

صالحین اور منکرین کے درمیان مکالمات:

اب ہم اُن مکالمات کا جائزہ لیں گے جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔اس کی نہایت ادبی انداز میں نقشہ کشی متعدد سورتوں میں ہوئی ہے۔جو نہ صرف بہت دلچسپ تاہم اپنے اندر عبرت کے بہت پہلو رکھتی ہے!

☆......سورۃ الاعراف: آیات ۳۷ تا ۳۹ میں ایک بہت ہی اچھوتے انداز میں انسان کو اس وقت کے منظر کی ایک جھلکی دکھائی گئی ہے جبکہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہوگا۔فرشتے اس وقت انسان سے پوچھیں گے "بتاؤ اب کہاں ہیں تمہارے وہ معبود جن کو تم خدا کے بجائے پکارتے تھے؟ وہ کہیں گے کہ سب ہم سے گم ہو گئے۔"اسی تسلسل میں آیت ۳۸ میں فرمایا کہ "ہر گروہ جب جہنم میں داخل ہوگا تو اپنے پیش روؤں پر لعنت کرتا ہوا داخل ہوگا، حتیٰ کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے بارے میں کہے گا کہ اے رب، یہ لوگ تھے جنہوں نے ہم کو گمراہ کیا لہٰذا انہیں آگ کا دہرا عذاب دے۔ جواب میں ارشاد ہوگا "ہر ایک کے لیے دوہرا ہی عذاب ہے مگر تم جانتے نہیں ہو——" اس آیت کے ضمن میں جو تفصیلی حاشیہ(۳۰) سید مودودیؒ نے لکھا ہے، وہ بذات خود دیکھنے کے قابل ہے۔تاہم اس کے چیدہ چیدہ نکات درج ذیل ہیں۔

☆ ہر گروہ کسی کا خلف تھا تو کسی کا سلف بھی تھا۔اگر کسی گروہ کے اسلاف نے اس کیلئے فکر و عمل کی گمراہیوں کا ورثہ چھوڑا تھا تو وہ خود بھی اپنے اخلاف کیلئے ویسا ہی ورثہ چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوا۔اگر ایک گروہ کے گمراہ ہونے کی ذمہ داری اس کے اسلاف پر عائد ہوتی ہے تو اس کے اخلاف کی گمراہی کا اچھا خاصا بار خود اس پر بھی عائد ہوگا۔''

☆''درج بالا مثال کی دلیل آدم کے اس بیٹے کی دی گئی ہے جس نے تاریخ انسانیت

میں سب سے پہلے اپنے بھائی کو ناحق قتل کیا تھا کیونکہ قتل انسانی کا راستہ سب سے پہلے اس نے کھولا تھا۔''

☐ ☆ ''اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص یا گروہ کسی غلط خیال یا غلط رویہ کی بنا ڈالتا ہے وہ صرف اپنی ہی غلطی کا ذمہ دار نہیں ہوتا بلکہ دنیا میں جتنے انسان اس سے متاثر ہوتے ہیں ان سب کے گناہ کی ذمہ داری کا بھی ایک حصہ اس کے حساب میں لکھا جاتا رہا ہے۔" اور یہی حال کسی نیکی کا بھی ہے۔''

☆ "عمل اور جزا کے مسئلے کو اس پہلو سے جو شخص بھی دیکھے گا اسے یقین ہو جائے گا کہ جزا کیلئے ایک دوسرا ہی عالم درکار ہے۔ جہاں تمام اگلی اور پچھلی نسلیں جمع ہوں، تمام انسانوں کے کھاتے بند ہو چکے ہوں، حساب کرنے کیلئے ایک علیم و خبیر خدا انصاف کی کرسی پر متمکن ہو اور اعمال کا پورا بدلا پانے کیلئے انسان کے پاس غیر محدود زندگی اور اس کے گردوپیش جزاوسزا کے غیر محدود امکانات موجود ہوں۔"◆

جیسا کہ ان آیات میں بتایا گیا کہ جہنم میں داخلے کے وقت ہر گروہ ایک دوسرے پر لعنت کرتا ہوا اور ایک دوسرے کیلئے دوہرے عذاب کی درخواست کرے گا۔ اس صورت حال پر جو تشریحی نوٹ تفہیم القرآن سورۃ الاعراف حاشیہ ۳۱ میں لکھا ہے وہ بہت اہم ہے:

"اہل دوزخ کی اس باہمی تکرار کو قرآن مجید میں کئی جگہ بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ سبا آیت: ۳۱ تا ۳۳ میں ارشاد ہوتا ہے کہ 'کاش تم دیکھ سکو اس موقع کو جب یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے اور ایک دوسرے پر باتیں بنا رہے ہوں گے۔ **جو لوگ دنیا میں کمزور بنا کر رکھے گئے تھے وہ ان لوگوں سے جو بڑے بن کر رہے تھے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔** وہ بڑے بننے والے ان

◆ یہی وہ تصور آخرت ہے جس کا صحیح ادراک نہ ہونے کی بناء پر انسان دنیا میں اللہ کے احکامات سے روگردانی کرتا ہے اور جس تصور کے انسانی ذہن میں جاگزیں ہونے سے ایک انسان کی زندگی بدل جاتی ہے۔

کمزور بنائے ہوئے لوگوں کو جواب دیں گے کیا ہم نے تم کو ہدایت سے روک دیا تھا جبکہ وہ تمہارے پاس آئی تھی؟ نہیں، بلکہ تم خود مجرم تھے۔" مطلب یہ ہے کہ تم خود کب ہدایت کے طالب تھے؟ اگر ہم نے تمہیں دنیا کے لالچ دے کر اپنا بندہ بنایا تو تم لالچی تھے جب ہی ہمارے دام میں گرفتار ہوئے۔ اگر ہم نے تمہیں خریدا تھا تو تم خود بکنے کیلئے تیار تھے جب ہی تو ہم خرید سکے۔ اگر ہم نے تمہیں مادہ پرستی اور دنیا پرستی اور قوم پرستی (نیز فرقہ پرستی وغیرہ) اور ایسی ہی دوسری گمراہیوں اور بداعمالیوں میں مبتلا کیا تو تم خود خدا سے بے زار اور دنیا کے پرستار تھے۔ جب ہی تو تم نے خدا پرستی کی طرف بلانے والوں کو چھوڑ کر ہمارے پکارنے پر لبیک کہا۔ اگر ہم نے تمہیں مذہبی قسم کے فریب دیئے تو ان چیزوں کی مانگ تو تمہارے ہی اندر موجود تھی، جنہیں ہم پیش کرتے تھے اور تم لپک لپک کر لیتے تھے۔ تم خدا کے بجائے ایسے حاجت روا مانگتے تھے جو تم سے کسی اخلاقی قانون کی پابندی کا مطالبہ نہ کریں اور بس تمہارے کام بناتے رہیں ہم نے وہ حاجت روا تمہیں گھڑ کر دے دیئے۔ تم کو ایسے سفارشیوں کی تلاش تھی کہ تم خدا سے بے نیاز ہو کر دنیا کے کتے بنے رہو اور بخشوانے کا ذمہ وہ لے لیں۔ ہم نے وہ سفارشی تصنیف کر کے تمہیں فراہم کر دیئے۔ **تم چاہتے تھے کہ خشک و بے مزہ دینداری اور پرہیزگاری اور قربانی اور سعی و عمل کے بجائے نجات کا کوئی اور راستہ بتایا جائے جن میں نفس کیلئے لذتیں ہی لذتیں ہوں اور خواہشات پر پابندی کوئی نہ ہو۔ ہم نے ایسے خوش نما مذہب تمہارے لیے ایجاد کر دیئے۔** غرض یہ کہ ذمہ داری تنہا ہمارے ہی اوپر نہیں ہے، تم بھی برابر کے ذمہ دار ہو۔ ہم اگر گمراہی فراہم والے تھے تو تم اس کے خریدار تھے۔ (حاشیہ ۳۱)''

آیاتِ قرآنی کی تشریح میں جن مختلف گروہوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کا ایک واضح شعور درج ذیل تفصیل سے لگایا جا سکتا ہے۔

☆......سب سے پہلا گروہ ان "بڑے لوگوں" کا ہے جو تاریخِ انسانی میں کبھی فرعون، کبھی نمرود اور کبھی مختلف بادشاہوں کے نام سے سیاسی سیادت وقیادت کے حامل رہے ہیں۔ ان

میں موجودہ دور کے دنیا کے مختلف ممالک/خطوں کے جمہوری، صدارتی اور ڈکٹیٹروں کے نام بھی آتے ہیں۔ مختلف ممالک میں سیاسی پارٹیوں کے صدور، وزرائے آعظم سے لے کر بیوروکریٹس، فوجی حکمران ہیں جو کسی نہ کسی طور پر حکومتوں پر قبضہ کر لیتے ہیں اور پھر من مانی کرتے ہیں۔ عوام الناس کو بے وقوف بنانے کے نت نئے سلوگن اور ہتھکنڈے اختیار کرتے ہیں اور ان کی ایک بہت بڑی تعداد ان کے اس چُنگل میں پھنس جانے ہی میں اپنی عافیت سمجھتی ہے۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے کوئی محکوم اگر
پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمران کی ساحری!
(علامہ اقبال)

گمراہوں کے اس گروہ میں دوسرا نمایاں ترین طبقہ وہ ہوتا ہے جو بظاہر دینی تعلیمات کا حامل ہوتا ہے۔ اہل کتاب کے حوالے سے قرآن کریم نے انہیں ربی کے نام سے پکارا ہے جبکہ موجودہ زمانے میں مختلف مذاہب کے مذہبی لوگوں کو پوپ، پادری، پروہت، بھکشو، مولوی، پیر، فقیر اور اسی قسم کے مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ تاریخ میں طبقۂ امراو سیاست کو گمراہ کرنے اور انہیں بلاشرکت غیرے حکمرانی کرنے کا جواز فراہم کرنے میں اس طبقے کے لوگوں کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ انہوں نے انہیں محافظ دین، حامیٔ دین۔ (Protector of Faith) "ظلِ الٰہی، حاجت روا، اور نمعلوم کن کن خطابات سے نوازا صرف اس مقصد کی خاطر کہ دنیا میں ان سے مناصب اور دولت کا حصول کیا جائے۔

''مذاہب عالم کی تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس طبقے نے دنیاوی فوائد کے لیے ازخود ایک ایسا نظام بھی تشکیل دیا اور عوام الناس کو اپنے جال میں پھنسانے کیلئے آخرت میں بخشوانے کا ایک ایسا ڈھونگ رچایا کہ بڑے بڑے بادشاہ، دانشور، اہل ثروت، افواج کے سپہ سالار ان کے اسی فریب میں آنے سے نہ بچ سکے۔ روم و یونان، مصر و ایران اور

ہندوستان کے کلیسا، عبادت گاہیں، مندر اور دیوتاؤں کا ایک ایسا جال ہے جس کے دام میں آنے سے کوئی بھی اپنا دامن نہ بچا سکا اور بقول میر ؎

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے!

قرآن کریم کا اس نکتۂ نظر سے مطالعہ کرنے پر یہود و نصاریٰ کے ان مذہبی پروہتوں کا ایک بہت ہی گھناؤنا چہرہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں بھی خلافتِ راشدہ کے بعد، اموی اور عباسی دور سے لے کر مغل بادشاہ اکبر کے دور تک اس طبقے نے جس جس انداز میں دینِ مبین کی راہ میں کانٹے بچھائے ہیں اور ظلم و ستم کا ایک بازار گرم کئے رکھا، وہ ہماری تاریخ کا ایک بہت ہی افسوس ناک اور تاریک پہلو ہے۔ تاہم اس سے ہرگز ہرگز یہ مطلب نہ اخذ کیا جائے کہ اسلامی تاریخ صحیح الفکر اہل علم سے تہی دست رہی ہے۔ اموی اور عباسی ادوار میں بھی آئمہ کرام، مفسرین، محدثین اور دیگر اہل علم نے جو گرانقدر خدمات سر انجام دیں، وہ ہماری تاریخ کا نہ صرف روشن ترین باب ہے بلکہ آج کی امت مسلمہ بھی ان کی گرانقدر خدمات اور دین مبین کی ترویج و اشاعت میں کی گئی قربانیوں کی مرہونِ منت ہے۔ ہماری قریب کی تاریخ میں وہ سلسلۃ الذہب جس کے سرخیل امام سرہند مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جنہوں نے اکبر اور جہانگیر کے دین الٰہی کے خلاف آواز بلند کی اور جن کی مساعی کو مزید بڑھانے میں شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے ماننے والوں کی علمی، عملی اور جہادی کوششوں سے لے کر موجودہ زمانے کے اہل اللہ اس کی روشن مثال ہیں۔ ◆ تاہم موجودہ دور میں امتِ مسلمہ کی زبوں حالی اور تنزلی کے ذمہ دار وہ تمام علمائے سوء ہیں جنہوں نے فرقہ پرستی، فقہی اختلافات اور ذاتی مفاداتی گروہ بندی کی بناء پر امت مسلمہ کو اتنے فرقوں میں تقسیم کر دیا ہے جس کے نتیجے میں عالمی اتحادی طاقتوں نے بے شمار مسائل امت

◆ اگرچہ اس موضوع پر متعدد اہل قلم نے عمدہ کوششیں سرانجام دی ہیں تاہم مسلم بادشاہوں کے زوال سے لے کر آج تک اس سنہری باب کو فی زمانہ زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے کی ضرورت ہے!

مسلمہ کیلئے پیدا کر دیئے ہیں کہ ان کا مؤثر جواب دینے کی سکت اب امتِ مسلمہ میں نہیں رہی۔ بالآخر علامہ اقبال نے کہا:

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے تیرا فیض ہو عام اے ساقی!

اور مزید

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایراں، وہی تبریز ہے ساقی!

مفتی محمد شفیعؒ نے اپنی تفسیر (۲۰۱۱ء) میں سورہ الاعراف آیت ۳۷ تا ۳۹ کے ضمن میں تحریر کیا کہ ''بعض آیات میں ایسے ہی سوال و جواب کا وقوع قیامت میں بھی مذکور ہے......اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جو فرقے (کفار کے) تم سے پہلے گذر چکے ہیں جنات میں سے بھی اور آدمیوں میں سے بھی ان کے ساتھ تم بھی جہنم میں جاؤ (چنانچہ آگے پیچھے سب کفار اسی میں داخل ہوں گے ◆ اور یہ کیفیت واقع ہوگی کہ جس وقت بھی کوئی جماعت (کفار کی) داخل (دوزخ) ہوگی اپنی جیسی دوسری جماعت کو بھی (جو انہی جیسے کافر ہوں گے اور ان سے پہلے دوزخ میں جا چکے ہوں گے) لعنت کرے گی (یعنی باہم ہمدردی نہ ہوگی، بلکہ بوجہ انکشافِ حقائق کے ہر شخص دوسرے کو بری نظر سے دیکھے گا اور برا کہے گا)۔ یہاں تک کہ جب اس (دوزخ) میں سب جمع ہو جائیں گے تو اس وقت پچھلے لوگ (جو بعد میں داخل ہوئے ہوں گے اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو کفر میں دوسروں کے تابع تھے) پہلے (داخل ہونے والے) لوگوں کی نسبت (یعنی ان لوگوں کی نسبت جو بوجہ رئیس و پیشوائے کفر ہونے کے دوزخ میں پہلے داخل ہوں گے یہ) کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ان لوگوں نے گمراہ کیا تھا ان کو دوزخ کا عذاب (ہم سے) دوگنا دیجئے (اللہ تعالیٰ) ارشاد فرمائیں گے کہ (ان کو دوگنا ہونے سے تم کو کون سی تسلی و راحت ہو جائے گی، بلکہ

◆ اللہ تعالیٰ ہر مومن/مسلم کو اس منظر کے دیکھنے اور اس میں مبتلا ہونے سے بچائے۔

چونکہ تمہارا عذاب بھی ہمیشہ آناً فاناً بڑھتا ہی جائے گا، اس لیے تمہارا عذاب بھی ان کے دو گنے عذاب ہی جیسا ہوگا، پس اس حساب سے) سب ہی کا (عذاب) دو گنا ہے، لیکن (ابھی) تم کو (پوری) خبر نہیں (کیونکہ ابھی تو عذاب کی ابتدا ہی ہے، اس کے اضافے کو دیکھا نہیں اس لیے ایسی باتیں بنا رہے ہو......(ص ۵۵۵)

گزشتہ صفحات میں آیات نمبر ۳۸ و دیگر کی تفصیلات کے بعد اسی معنوں کے ایک دوسرے پہلو کی جانب آیات ۴۴ تا ۵۱ میں ایک مکالمے کی صورت میں کیا گیا جو جنت اور جہنم کے مکینوں کے درمیان ہوگا۔ نیز ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک اوٹ حائل ہوگی جس کی بلندیوں (اعراف) پر کچھ لوگ ہوں گے۔" پھر یہ اعراف کے لوگ دوزخ کی چند بڑی بڑی شخصیتوں کو ان کی علامتوں سے پہچان کر کہیں گے کہ **"دیکھ لیا تم نے، آج نہ تمہارے جتھے تمہارے کسی کام آئے اور نہ ساز و سامان جن کو تم بڑی چیز سمجھتے تھے۔ اور وہ اہل جنت وہی لوگ ہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ان کو تو خدا اپنی رحمت میں سے کچھ بھی نہ دے گا؟ آج انہی سے کہا جائے گا کہ داخل ہو جاؤ جنت میں، تمہارے لیے نہ خوف ہے نہ رنج۔"(سورہ الاعراف:۴۹)**

سورۃ الاعراف آیت ۵۹ سے لے کر ۹۴ تک مختلف اقوام (قومِ نوح، عاد، ثمود، لوط، شعیب) کے نام لے کر ایک ایک پیغمبر کی دعوت کو پیش کرنے کے بعد ان کے بڑے لوگوں کی دھمکیوں کو برسرِ عمل لانے کا جو دعویٰ انہوں نے اپنے پیغمبروں سے کیا، قرآن نے بطور نمونہ ان قوموں کے سرداروں اور دولت مند طبقے کے جوابات کا یوں ذکر کیا ہے۔

☆ نوح علیہ السلام کو جواب دیا گیا کہ "ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔" (آیت:۵۹)

☆ عاد کی قوم نے ہود علیہ السلام کو جواب دیا کہ "کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ ہی کی عبادت کریں اور انہیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔" (آیت: ۶۴ تا ۷۰)

☆ ثمود کی قوم نے اپنے نبی صالح علیہ السلام کو کہا "سرداروں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے، کمزور طبقہ کے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے تھے، کہا کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح علیہ السلام اپنے رب کا پیغمبر ہے؟" اُن بڑائی کے مدعیوں نے کہا جس چیز کو تم نے مانا ہے ہم اس کے منکر ہیں۔" (آیت ۷۳ تا ۷۸)

☆ لوط علیہ السلام کی قوم نے جواب دیا **"نکالو ان لوگوں کو اپنی بستیوں سے بڑے پاکباز بنتے ہیں؟"** (سورۃ الاعراف: ۸۰ تا ۸۴)

☆ سورہ الاعراف کی آیات ۸۵ تا ۹۳ میں حضرت شعیب علیہ السلام کو "اس قوم کے سرداروں نے جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے، کہا کہ **"اے شعیب ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے ورنہ تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔"** (آیت ۸۸)......اسی تسلسل میں اس کی قوم کے سرداروں نے جو اس کی بات ماننے سے انکار کر چکے تھے آپس میں کہا کہ اگر تم نے شعیب علیہ السلام کی پیروی قبول کر لی تو برباد ہو جاؤ گے۔" (آیت ۹۰)

درج بالا چند واقعات بطور نمونہ کے بیان کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان تمام اقوام کے ساتھ جو کیا وہ بیان کرتے ہوئے شعیب علیہ السلام کی قوم کو ہلاک کر دیا۔ تاہم اس ایک واقعہ کے ضمن میں سید مودودیؒ نے جو تشریحی نوٹ لکھا ہے وہ درج ذیل ہے: "قرآن کریم میں مختلف اقوام کے جوابات، اللہ تعالیٰ کے فیصلوں اور بالخصوص قوم شعیب کے جوابات پر یہ نوٹ نہ صرف ان اقوام پر ہی ایک بہترین تبصرہ ہے بلکہ اُمت مسلمہ کے عوام بالخصوص خوشحال اور مترفین کی حالتِ زار کے بارے میں ایک ایسا جامع نقشہ ہے جو لفظاً اور معناً اس امر کا غماز ہے کہ آج اس طبقے کی صورت بھی درج بالا جوابات سے مختلف نہیں۔ سید مودودیؒ نے سورہ الاعراف: ۸۹ میں درج ذیل خط کشیدہ الفاظ کے ترجمے کے بارے میں لکھا:

"اس چھوٹے سے فقرے سے سرسری طور پر نہ گذر جایئے۔ یہ ٹھہر کر بہت سوچنے کا مقام ہے۔ **مدین کے سردار اور لیڈر دراصل یہ کہہ رہے تھے اور اس بات کا اپنی قوم**

کو بھی یقین دلا رہے تھے کہ شعیب جس ایمان داری اور راست بازی کی دعوت دے رہا ہے اور اخلاق و دیانت کے جن مستقل اصولوں کی پابندی کرانا چاہتا ہے اگر ان کو مان لیا جائے تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ ہماری تجارت کیسے چل سکتی ہے اگر ہم بالکل ہی سچائی کے پابند ہو جائیں اور کھرے کھرے سودے کرنے لگیں۔ اور ہم جو دنیا کی دو سب سے بڑی تجارتی شاہراہوں کے چوراہے پر بستے ہیں اور مصر و عراق کی عظیم الشان متمدن سلطنتوں کی سرحد پر آباد ہیں، اگر ہم قافلوں کو چھیڑنا بند کر دیں اور بے ضرر اور پر امن لوگ ہی بن کر رہ جائیں تو جو معاشی اور سیاسی فوائد ہمیں اپنی موجودہ جغرافیائی پوزیشن سے حاصل ہو رہے ہیں وہ سب ختم ہو جائیں گے اور آس پاس کی قوموں پر ہماری جو دھونس قائم ہے وہ باقی نہ رہے گی۔ یہ بات صرف قومِ شعیب کے سرداروں ہی تک محدود نہیں ہے۔ ہر زمانے میں بگڑے ہوئے لوگوں نے حق اور راستی اور دیانت کی روش میں ایسے ہی خطرات محسوس کیے ہیں۔ ہر دور کے مفسدین کا یہی خیال رہا ہے کہ تجارت اور سیاست اور دوسرے دنیوی معاملات میں جھوٹ اور بے ایمانی اور بد اخلاقی کے بغیر نہیں چل سکتے۔ ہر جگہ دعوت حق کے مقابلے میں جو زبردست عذرات پیش کئے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی رہا ہے کہ اگر دنیا کی چلتی ہوئی راہوں سے ہٹ کر اس دعوت کی پیروی کی جائے تو قوم تباہ ہو جائے گی۔" (حاشیہ نمبر ۷۴)

حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت سے جس انداز سے ان کی قوم کے سرداروں اور لیڈروں نے اِنکار کیا تو بقول قرآن "شعیب کے جھٹلانے والے ہی آخر کار برباد ہوئے۔" اور شعیب یہ کہہ کر ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ "اے برادرانِ قوم، میں نے اپنے رب کے پیغامات تمہیں پہنچا دیئے اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ اب میں اس قوم پر کیسے افسوس کروں جو قبولِ حق سے اِنکار کرتی ہو۔" (آیت: ۹۳)

آیت کے آخری حصے "قبول حق سے انکار" پر یہ تشریحی نوٹ نمبر ۷۶ سید مودودیؒ نے لکھا "یہ جتنے قصے یہاں بیان کئے گئے ہیں ان سب میں "سرِ دلبراں در حدیثِ دیگراں" کا

سا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ہر قصہ اُس معاملے پر پورا پورا چسپاں ہوتا ہے جو اس وقت محمد ﷺ اور آپ کی قوم کے درمیان پیش آ رہا تھا۔ ہر قصہ میں ایک فریق نبی ہے جس کی تعلیم، جس کی دعوت، جس کی نصیحت و خیر خواہی اور جس کی ساری باتیں بعینہ وہی ہیں جو محمد ﷺ کی تھیں اور دوسرا فریق حق سے منہ موڑنے والی قوم ہے جس کی اعتقادی گمراہیاں، جس کی اخلاقی خرابیاں، جس کی جاہلانہ ہٹ دھرمیاں، جس کے سرداروں کا استکبار، جس کے منکروں کا اپنی ضلالت پر اصرار، اور دینی راہ نماؤں کا عمل غرض سب کچھ وہی ہے جو قریش میں پایا جاتا تھا۔ پھر ہر قصے میں منکر قوم کا جو انجام پیش کیا گیا ہے اس سے دراصل قریش کو عبرت دلائی گئی ہے کہ اگر تم نے خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر کی بات نہ مانی اور اصلاح احوال کا جو موقع تمہیں دیا جا رہا ہے اسے اندھی ضد میں مبتلا ہو کر کھو دیا تو آخر کار تمہیں بھی اس تباہی و بربادی سے دو چار ہونا پڑے گا جو ہمیشہ سے گمراہی و فساد پر اصرار کرنے والی قوموں کے حصہ میں آتی رہی ہیں۔" (حاشیہ ۷۶)

درج بالا تمام تر تفصیل کی روشنی میں اگر آج ہم اپنے لیڈروں (سیاسی اور مذہبی) کے، امت کو درپیش مسائل کے حل کیلئے دلائل و تجاویز کا بدقتِ نظر جائزہ لیں تو نہ صرف قرآن کی ابدی تعلیمات پر ایمان لانا پڑتا ہے بلکہ حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر گہری مماثلت ہزاروں سال قبل گزری قوموں کے لیڈروں اور سرداروں (بشمول مذہبی لیڈروں بھی) اور آج کے لیڈروں میں پائی جاتی ہے۔ کس قدر حیرت انگیز امر ہے؟ کیا آج کے دور میں امتِ مسلمہ سے اس دورنگی اور منافقانہ روش کا ارتکاب نہیں ہو رہا؟ کیا امت کے وہ تمام "بڑے" جن کے ہاتھوں میں سیاسی، معاشی اور مذہبی اقتدار کی باگ دوڑ ہے، وہ اپنے محدود دائروں میں اس قسم کے دلائل کا سہارا لے کر، امت کو عرب و عجم کی تقسیم میں مبتلا نہیں کر رہے؟ کیا ارضِ پاکستان میں نام نہاد اہل علم طبقہ (دینی و دنیوی) اپنے اپنے طور پر امت مسلمہ کو صوبائی، لسانی، گروہی، سیاسی، نظریاتی اور فقہی اختلافات میں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر رہا ہے؟ کیا اس ملک کا دولت مند طبقہ معاشی طور پر امت مسلمہ کو یہود کی طرح

ڈالراوراشیائے خوردنوش کی ذخیرہ اندوزی کے ذریعے، ایک بحران میں مبتلانہیں کررہا؟ اور کیا ان کا طرزِعمل قوم لوط اور قومِ شعیب کے سرداروں اور دولت مندوں سے بہت زیادہ مختلف ہے؟ جو کہا کرتے تھے کہ **"نکالوان پاکبازوں کو اپنی بستی سے یہ بہت زیادہ پاکباز بنتے ہیں؟"** یہ ہیں وہ چندسوالات جن کی جانب قرآن کریم کی اِن اور دیگر آیات (سورۃ یونس آیت ۲۸، النحل آیت ۱۱۲، المومنون ۲۲، اور الدخان ۹ سے ۱۶) **میں امتِ محمدیہؐ بالخصوص اہل پاکستان میں رہنے والی امت کے مذہبی، سیاسی، اور اہل دانش وبینش کے علاوہ، عوام الناس کوتوجہ دلائی گئی ہے کہ اس روش اور جاہلانہ طرزعمل کا مظاہرہ نہ کریں جومختلف اقوام بالخصوص اہل مکہ (نیز بنی اسرائیل کی مذہبی قیادت اورقبائل کےسرداروں/ وڈیروں نے کئے تھے۔**

سید مودودیؒ نے سورۃ الاعراف کی آیت ۹۴ کے حاشیہ ۷۷ میں واضح کیا کہ "ایک ایک نبی اور ایک ایک قوم کا معاملہ الگ الگ بیان کرنے کے بعد **اب وہ جامع ضابطہ بیان کیا جارہا ہے جو ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے موقع پر اختیار فرمایا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب کسی قوم میں کوئی نبی بھیجا گیا تو پہلے اس قوم کے خارجی ماحول کو قبول دعوت کے لئے نہایت سازگار بنایا گیا۔ یعنی اس کو مصائب اور آفات میں مبتلا کیا گیا۔ قحط، وبا، تجارتی خسارے، جنگی شکست یا اور اسی طرح کی تکلیفیں اس پر ڈالی گئیں۔ تاکہ اس کا دل نرم پڑے،** اس کی شیخی اور تکبر سے اکڑی ہوئی گردن ڈھیلی ہو، اس کا غرورِ طاقت اور نشۂ دولت ٹوٹ جائے، اپنے ذرائع و وسائل اور اپنی قوتوں اور قابلیتوں پر اس کا اعتماد شکست ہو جائے، اسے محسوس ہو کہ اوپر کوئی اور طاقت بھی ہے جس کے ہاتھ میں اس کی قسمت کی باگیں ہیں، اور اس طرح اس کے کان نصیحت کے لئے کھل جائیں اور وہ اپنے خدا کے سامنے عاجزی کے ساتھ جھک جانے پر آمادہ ہو جائے۔ **پھر جب اس سازگار ماحول میں بھی اس کا دل قبولِ حق کی طرف مائل نہیں ہوتا تو اس کو خوش حالی کے فتنہ میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور یہاں**

سے اس کی بربادی کی تمہید شروع ہوجاتی ہے۔ جب وہ نعمتوں سے مالا مال ہونے لگتی ہے تو اپنے برے دن بھول جاتی ہے اور اس کے کج فہم رہنما اس کے ذہن میں تاریخ کا یہ احمقانہ تصور بٹھاتے ہیں کہ حالات کا اتار چڑھاؤ اور قسمت کا بناؤ اور بگاڑ کسی حکیم کے انتظام میں اخلاقی بنیادوں پر نہیں ہو رہا ہے بلکہ ایک اندھی طبیعت بالکل غیر اخلاقی اسباب سے کبھی اچھے اور کبھی برے دن لاتی ہی رہتی ہے، لہٰذا مصائب اور آفات کے نزول سے کوئی اخلاقی سبق لینا اور کسی ناصح کی نصیحت قبول کر کے خدا کے آگے زاری و تضرع کرنے لگنا بجز ایک طرح کی نفسی کمزوری کے اور کچھ نہیں ہے۔ یہی وہ احمقانہ ذہنیت ہے جس کا نقشہ نبی ﷺ نے اس حدیث میں کھینچا ہے۔''

لَا یَزَالُ البَلاءُ بِالمؤمِن حَتّٰی یَخْرُجَ نَقِیًّا من ذُنُوْبِہٖ، و المنافق مَثَلُہٗ کَمَثَلِ الحِمَارِ لَا یَدْرِیْ فِیْمَ رَبَطَہٗ اَھْلُہٗ وَلَا فِیْمَ اَرْسَلُوْہٗ ''یعنی مصیبت مومن کی تو اصلاح کرتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ جب وہ اس بھٹی سے نکلتا ہے تو ساری کھوٹ سے صاف ہو کر نکلتا ہے، لیکن منافق کی حالت بالکل گدھے کی سی ہوتی ہے جو کچھ نہیں سمجھتا کہ اس کے مالک نے کیوں اسے باندھا تھا اور کیوں اسے چھوڑ دیا''—— پس جب کسی قوم کا حال یہ ہوتا ہے کہ نہ مصائب سے اس کا دل خدا کے آگے جھکتا ہے، نہ نعمتوں پر وہ شکر گزار ہوتی ہے، اور نہ کسی حال میں اصلاح قبول کرتی ہے تو پھر اس کی بربادی اس طرح اس کے سر پر منڈلانے لگتی ہے جیسے پورے دن کی حاملہ عورت کہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کب اس کا وضع حمل ہوجائے۔'' (حاشیہ ۷۷)

''اس ضمن میں مزید وضاحت کی کہ یہاں یہ بات اور جان لینی چاہئے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے جس ضابطہ کا ذکر فرمایا ہے ٹھیک یہی ضابطہ نبی ﷺ کی بعثت کے موقع پر بھی برتا گیا اور شامت زدہ قوموں کے جس طرزِ عمل کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے ٹھیک وہی طرزِ عمل سورۂ اعراف کے نزول کے زمانہ میں قریش والوں سے ظاہر ہو رہا تھا۔ حدیث میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ دونوں کی متفقہ روایت ہے نبی

ﷺ کی بعثت کے بعد جب قریش کے لوگوں نے آپ کی دعوت کے خلاف سخت رویہ اختیار کرنا شروع کیا تو حضور ﷺ نے دعا کی کہ خدایا، یوسف کے زمانہ میں جیسا ہفت سالہ قحط پڑا تھا ویسے ہی قحط سے ان لوگوں کے مقابلہ میں میری مدد کر۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سخت قحط میں مبتلا کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگ مردار کھانے لگے، چمڑے اور ہڈیاں اور اون تک کھا گئے، آخر کار مکہ کے لوگوں نے، جن میں ابوسفیان پیش پیش تھا، حضور ﷺ سے درخواست کی کہ ہمارے لئے خدا سے دعا کیجئے، مگر جب آپ کی دعا سے اللہ نے وہ براوقت ٹال دیا اور بھلے دن آئے تو ان لوگوں کی گردنیں پہلے سے زیادہ اکڑ گئیں، اور جن کے دل تھوڑے بہت پسیج گئے تھے ان کو بھی اشرارِ قوم نے یہ کہہ کہہ کر ایمان سے روکنا شروع کر دیا کہ میاں، یہ تو زمانے کا اتار چڑھاؤ ہے۔ پہلے بھی آخر قحط آتے ہی رہے ہیں، کوئی نئی بات تو نہیں ہے کہ اس مرتبہ ایک لمبا قحط پڑ گیا، لہٰذا ان چیزوں سے دھوکا کھا کر محمد ﷺ کے پھندے میں نہ پھنس جانا۔ یہ تقریریں اس زمانے میں ہو رہی تھیں جب یہ سورۂ اعراف نازل ہوئی ہے۔ اس لئے قرآن مجید کی یہ آیات ٹھیک اپنے موقع پر چسپاں ہوتی ہیں اور اسی پس منظر کو نگاہ میں رکھنے سے ان کی معنویت پوری طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔ (تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو یونس آیت ۲۸، النحل ۱۱۲، المؤمنون ۷۶، الدخان ۱۵ تا ۱۶)۔'' (حاشیہ ۷۷)

گزشتہ صفحات میں جن قوموں پر ان کے عذاب کا ذکر کیا گیا ہے، اب قوم موسیٰ کے جرائم کی ایک طویل فہرست بیان کی جا رہی ہے (باب دوئم)۔ ان جرائم میں فرعون اور اس کے دیگر سرداروں کی چالیں، موسیٰ علیہ السلام کے معجزات، جادوگروں سے مقابلہ، فرعون کا قومِ موسیٰ (بنی اسرائیل) کے بیٹوں کا قتل کر کے عورتوں کو باقی رکھنا، بنی اسرائیل کا ملک سے نکلنا اور فرعون کا اپنی فوجوں سمیت غرق سمندر ہونا، قومِ موسیٰ علیہ السلام کا مصر کے بت خانوں کو دیکھ کر اپنے دیرینہ مرض (بتوں کی پرستش) کا عود کر آنا، بچھڑے کی پرستش، موسیٰ علیہ السلام کا قوم کے سرداروں کیساتھ کوہِ طور پر جانا اور سخت زلزلے کی کیفیت طاری کرنا اور موسیٰ علیہ السلام

کا اللہ کی سرکار میں توبہ اور رحمت کی دعا کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں بچھڑے کی پرستش کو حضرت ہارون علیہ السلام کی جانب منسوب کرنے کے بائبل کے واقعے کی تردید میں، سید مودودیؒ نے حاشیہ نمبر ۱۰۸ میں لکھا۔ "یہاں قرآن مجید نے ایک بڑے الزام سے حضرت ہارون علیہ السلام کی برأت ثابت کی ہے جو یہودیوں نے زبردستی ان پر چسپاں کر رکھا تھا..... بظاہر یہ بات بڑی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل جن لوگوں کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں ان میں سے کسی کی سیرت کو بھی انہوں نے داغدار کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔ اور داغ بھی ایسے سخت لگائے ہیں جو اخلاق و شریعت کی نگاہ میں بدترین جرائم شمار ہوتے ہیں۔ لیکن بنی اسرائیل کی اخلاقی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ فی الحقیقت اس قوم کے معاملہ میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ قوم جب اخلاقی و مذہبی انحطاط میں مبتلا ہوئی اور عوام سے گزر کر ان کے خواص تک حتی کہ علماء و مشائخ اور دینی منصب داروں کو بھی گمراہیوں اور بداخلاقیوں کا سیلاب بہالے گیا تو ان کے مجرم ضمیر نے اپنی اس حالت کیلئے عذرات تراشنے شروع کئے اور اس سلسلہ میں انہوں نے وہ تمام جرائم جو یہ خود کرتے تھے انبیاء علیہ السلام کی طرف منسوب کر ڈالے تاکہ یہ کہا جاسکے کہ جب نبی تک ان چیزوں سے نہ بچ سکے تو بھلا اور کون بچ سکتا ہے۔ اس معاملے میں یہودیوں کا حال ہندوؤں سے ملتا جلتا ہے۔ ہندوؤں میں بھی جب اخلاقی انحطاط انتہا کو پہنچ گیا تو وہ لٹریچر تیار ہوا جس میں دیوتاؤں کی، رشیوں اور اوتاروں کی غرض جو بلند ترین آئیڈیل قوم کے سامنے ہو سکتے تھے ان سب کی زندگیاں بداخلاقی کے تارکول سے سیاہ کر ڈالی گئیں تاکہ یہ کہا جاسکے کہ جب ایسی عظیم الشان ہستیاں ان قبائح میں مبتلا ہو سکتی ہیں تو بھلا معمولی فانی انسان ان میں مبتلا ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں اور پھر جب یہ افعال اتنے اونچے مرتبے والوں کیلئے بھی شرمناک نہیں ہوتے تو ہمارے لئے کیوں ہوں؟ (حاشیہ نمبر ۱۰۸)''

درج بالا نوٹ کی روشنی میں آج اپنے مذہبی طبقے کے بڑے بڑے لوگوں کا حال دیکھ لیجئے۔ ان میں سے کس کس نے علامہ اقبالؒ سے لے کر سید مودودیؒ تک اور حسن البناؒ

سے لے کر سید قطبؒ اور حالیہ دور میں مُرسی (صدر مصر) تک کون کون سے الزامات نہیں لگائے (ہم نے دانستاً ماضی بعید میں امت کی تاریخ کے دیگر زعماء کا نام نہیں لیا کہ موجودہ نسل کو ان سے آگاہ نہیں کیا گیا۔فقہی اختلافات اور تاریخی واقعات کی بناء پر ضال اور مضل کہنا تو گویا کوئی بڑی بات ہی نہیں سمجھی جاتی کہ یہ تو ان کا تکیہ کلام ہے۔کافر سے کم فتویٰ جاری کرنا تو دراصل ان مفتیانِ کرام کے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور وہ بھی کسی کی تحریر وتقریر کو خود پڑھے اور سنے بغیر کسی سائل کے بتانے پر لکھا لکھا یا فتویٰ جاری کرنا تو آج سے تین چار دہائیاں قبل ایک خاص مشغلہ تھا جن کا مشاہدہ ہم جیسے طالبانِ علم نے اپنی آنکھوں سے پڑھا اور دیکھا ہے۔یہی صورت حال سیاسی جغادری لیڈروں کی ہے جو ازخود اپنی کرپشن، بے ایمانیوں اور نہایت غیر شرعی حرکات کو جاننے کے باوجود، اسقدر اخلاقی جرأت بھی نہیں رکھتے کہ سیدھے سادھے قوم اور اپنے رب سے معافی مانگ لیں بلکہ نہایت دھڑلے کے ساتھ اس کی توجیہہ اور مدافعت میں بیان ہی نہیں دیتے۔ بلکہ روزانہ نہایت ڈھٹائی کے ساتھ ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات میں اس پر اصرار اور دوسروں پر الزامات عائد کرنے سے باز نہیں آتے۔اس سب پر مستزاد یہ کہ اس قسم کے" کارِخیر" میں انہیں نام نہاد مذہبی جماعتوں کے افراد کا تعاون اشتراک ہی نہیں اپنے اپنے متبعین کو بھی شاملِ حال کرنے کا شرف حاصل ہے۔ رہے عوام تو وہ بیچارے ان دو بڑے دھڑوں کے درمیان، اپنی کم علمی اور دینی معلومات کے نہ ہونے کی وجہ سے اپنے اپنے پیر،فقیر اور مولوی،مفتی نیز لیڈر،سردار،وڈیرے،چوہدری پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں کہ انہیں تو قرآن وحدیث اور سیرتِ طیبہ کے چشمہ صافی سے استفادہ کرنے سے نہ صرف روک دیا گیا ہے بلکہ ان ذرائع پر اپنی بالادستی قائم رکھنے کیلئے ان تعلیمات سے انہیں آگاہ تک نہیں کیا گیا۔کیا یہ صورتِ حال بنی اسرائیل کے ربیوں اور ہندوؤں کے برہمنوں سے بہت زیادہ مختلف ہے؟ ہمارے اہل علم نے اپنے آپ کو بنی اسرائیل کے فقہیوں کی طرح اپنی قانونی موشگافیوں، اپنے تورع کے مبالغوں اور توہمات وخود ساختہ حدود وضوابط میں

اس حد تک جکڑ رکھا ہے کہ انہیں اس امر کا علم بھی نہیں ہو رہا کہ عالمی الحادی قوتیں/ طاقتیں ہر گزرتے لمحہ، امت کی نوجوان نسل کو جنسی بے راہ روی، خاندانی نظام کے تلپٹ کرنے، ایڈز جیسے امراض میں مبتلا کرنے کا کس قدر خوفناک ایجنڈا رکھتے ہیں اور یہ ہیں کہ رفع یدین اور آمین بالجہر کے جھگڑوں سے ہی فراغت نہیں پا رہے!

اے گرفتار ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش!

دوسری جانب سیاسی لیڈران ہیں کہ اپنی سیاہ کرتوتوں (کرپشن، منی لانڈرنگ اور دیگر اخلاقی جرائم سے بچنے کیلئے جمہوریت خطرے میں ہے کا راگ الاپنے میں مصروف ہیں۔ بقول سید مودودی، "اللہ تعالیٰ بندوں کی آزمائش کیلئے جو طریقے اختیار فرماتا ہے ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جب کسی شخص یا گروہ کے اندر فرمانبرداری سے انحراف اور نافرمانی کی جانب میلان بڑھنے لگتا ہے تو اس کے سامنے نافرمانی کے مواقع کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے تاکہ اس کے وہ میلانات جو اندر چھپے ہوئے ہیں کھل کر پوری طرح نمایاں ہو جائیں اور جن جرائم سے وہ اپنے دامن کو خود داغ دار کرنا چاہتا ہے ان سے وہ صرف اس لئے باز نہ رہ جائے کہ ان کے ارتکاب کے مواقع اسے نہ مل رہے ہوں۔" (حاشیہ ۱۲۴)

اس قماش کے تمام لوگوں کا بنی اسرائیل کی طرح یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ گناہوں پر گناہ کرنے کا مسلسل ارتکاب کرتے ہیں کیونکہ انہیں ان کے پیروں، فقیروں و دیگر لیڈروں نے یہ یقین دلا دیا ہوتا ہے کہ ان کی بخشش ہماری وجہ سے ہو جائے گی۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

قرآن کریم کا مطالعہ کرتے ہوئے، ایک نہایت ہی حیران کن پہلو ان مکالموں کی شکل میں سامنے آتا ہے جو دنیاوی لیڈروں (جن میں تمام دینی اور دنیوی طبقات کے لیڈران شامل ہیں) اور دنیا میں ان کے پیچھے چلنے والوں کے درمیان ہوگا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ قرآن، قیامت کے وقوع پر جس قدر زور دیتا ہے وہ اس امر سے واضح ہے کہ توحید اور رسالت کے بعد اسلامی تعلیمات کا تیسرا اہم ترین رکن آخرت کا تصور ہے جو من

جملہ درج بالا اہم ترین ارکان کے ایک انسان کو اس دنیا میں اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات پر عمل کرنے میں نہایت کارگر حیثیت کا حامل ہے۔

دوسری بات جو اس مکالماتی گفتگو سے سامنے آتی ہے وہ ایک ایسی تصویر کا جیتا جاگتا پہلو ہے جو ایک انسان اپنے تصور کی آنکھوں سے اس دنیا میں دیکھ سکتا ہے اور شنیدہ کہ بود مانند دیدہ'' کے مصداق اس دنیا میں ہی غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کیلئے کافی ہے۔

سورۃ الشعراء کی آیات ۹۲ تا ۱۰۱ میں آخرت میں جنت اور جہنم کا نظارہ ہونے پر ان بہکے ہوئے لوگوں سے پوچھا جائیگا کہ

"اب کہاں ہیں وہ جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے"—— "پھر وہ معبود (مترفین، سیاسی، مالدار اور مذہبی لیڈران) اور یہ بہکے ہوئے لوگ اور ابلیس کے لشکر سب کے سب اوپر تلے دھکیل دیئے جائیں گے وہاں یہ سب آپس میں جھگڑیں گے۔"...... یہ اُسی قسم کا جھگڑا ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں متعدد جگہوں پر کیا گیا ہے۔

یہ آیات مزید بتاتی ہیں کہ" یہ بہکے ہوئے لوگ اپنے معبودوں سے کہیں گے کہ" خدا کی قسم، ہم تو صریح گمراہی میں مبتلا تھے جبکہ تم کو رب العالمین کی برابری کا درجہ دے رہے تھے۔"——اس کی مزید تفصیل حاشیہ نمبر ۶۹ میں یوں کی گئی ہے:" یہ پیرووں اور معتقدوں کی طرف سے ان لوگوں کی تواضع ہو رہی ہوگی جنہیں یہی لوگ دنیا میں بزرگ، پیشوا اور راہ نما مانتے رہے تھے۔ یا جن کے ہاتھ پاؤں چومے جاتے تھے، جن کے قول و عمل کو سند مانا جاتا تھا، جن کے حضور نذریں گزاری جاتی تھیں۔ آخرت میں جا کر جب حقیقت کھلے گی اور پیچھے چلنے والوں کو معلوم ہو جائے گا کہ آگے چلنے والے خود کہاں آئے ہیں اور ہمیں کہاں لے آئے ہیں تو یہی معتقدین ان کو مجرم ٹھہرائیں گے۔ اور ان پر لعنت بھیجیں گے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ عالمِ آخرت کا یہ عبرت ناک نقشہ کھینچا گیا ہے۔ تاکہ اندھی تقلید کرنے والے دنیا میں آنکھیں کھولیں اور کسی کے پیچھے چلنے سے پہلے دیکھ لیں کہ وہ ٹھیک بھی جا رہا ہے یا نہیں۔ سورہ اعراف میں فرمایا:

كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾

''ہر گروہ جب جہنم میں داخل ہوگا تو اپنے ساتھ کے گروہ پر لعنت کرتا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے والے گروہ کے متعلق کہے گا کہ اے ہمارے رب یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا اب انہیں آگ کا دوہرا عذاب دے۔ رب فرمائے گا سب ہی کے لئے دوہرا عذاب ہے مگر تم جانتے نہیں۔''

سورۂ حٰم السجدہ میں ارشاد فرمایا ہے:

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۲۹﴾

''اور کافر اس وقت کہیں گے کہ اے پروردگار ان جنوں اور انسانوں کو ہمارے سامنے لا جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا تا کہ ہم انہیں پاؤں تلے روند ڈالیں اور وہ پست و ذلیل رہیں۔''(۲۹)

یہی مضمون سورۂ احزاب میں ارشاد ہوا ہے:

وَ قَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿۶۷﴾ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَ الْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴿۶۸﴾

''اور وہ کہیں گے اے رب ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہم سیدھے راستے سے بھٹکا دیا۔ اے رب، ان کو دوگنا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر۔''

سورہ الشعراء آیت ۱۴۱ تا ۱۵۷ میں حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کا ذکر ہے جب انہوں نے اپنی قوم کو اللہ سے ڈرنے اور اپنی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ نیز یہ کہا کہ "ان بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔" (آیت ۱۵۱۔۱۵۲)

اس کی تشریح کرتے ہوئے سید مودودی نے لکھا:

"یعنی اپنے ان امراء ورؤساء اوران رہنماؤں اور حاکموں کی اطاعت چھوڑ دو جن کی قیادت میں تمہارا یہ فاسد نظامِ زندگی چل رہا ہے۔ یہ مسرف لوگ ہیں، اخلاق کی ساری حدیں پھاندکر شتر بے مہار بن چکے ہیں۔ ان کے ہاتھوں سے کوئی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ یہ جس نظام کو چلائیں گے اس میں بگاڑ ہی پھیلے گا۔ تمہارے لئے فلاح کی کوئی صورت اگر ہے تو صرف یہ کہ اپنے اندر خدا ترسی پیدا کرو اور مفسدوں کی اطاعت چھوڑ کر میری اطاعت کرو، کیونکہ میں خدا کا رسول ہوں، میری امانت و دیانت کو تم پہلے سے جانتے ہو اور میں ایک بے غرض آدمی ہوں، اپنے کسی ذاتی فائدے کے لئے اصلاح کا یہ کام کرنے نہیں اٹھا ہوں —— یہ تھا وہ مختصر منشور جو حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس میں صرف مذہبی تبلیغ ہی نہ تھی، تمدنی واخلاقی اصلاح اور سیاسی انقلاب کی دعوت بھی ساتھ ساتھ موجود تھی۔" (حاشیہ نمبر ۱۰۰)

سورہ یونس

سورۃ الاعراف کے مطالعہ کے بعد اب ہم سورہ یونس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ سورہ ترتیب کے لحاظ سے دسویں سورت ہے جو مکہ میں نازل ہوئی۔ اس میں نوح علیہ السلام کا قصہ مختصراً اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل آیات کا مطالعہ ہمارے موضوع کے لحاظ سے اہم ہے۔

وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَ شُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَ قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا

تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۸﴾ فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۲۹﴾ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۳۰﴾

''جس روز ہم ان سب کو ایک ساتھ (اپنی عدالت) میں اکٹھا کریں گے پھر ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا ہے، کہیں گے کہ ہٹ جاؤ تم بھی اور تمہارے بنائے ہوئے شریک بھی، پھر ہم ان کے درمیان سے اجنبیت کا پردہ ہٹا دیں گے اور ان کے لیے شریک کہیں گے کہ تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے، ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے کہ (اگر تم ہماری عبادت کرتے بھی تھے) تو ہم تمہاری عبادت سے بالکل بے خبر تھے۔ اس وقت ہر شخص اپنے کئے کا مزہ چکھ لے گا سب اپنے حقیقی مالک کی طرف پھیر دیتے جائیں گے اور وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے گم ہو جائیں گے——''

ان آیات میں اس روزِ عدالت کی ایک جھلکی دکھائی گئی ہے جن میں مدعی اور مدعا علیہ دونوں ایک جگہ کھڑے ہونگے اور ایک دوسرے پر الزام تراشی کر رہے ہونگے۔ اس بارے میں سید مودودی کا تشریحی نوٹ (نمبر ۳۷) ذیل میں درج کیا جا رہا ہے جس سے ہر دو فریقین کے دعویٰ اور جوابِ دعویٰ کی قلعی کھل جاتی ہے۔

"یعنی وہ تمام فرشتے جن کو دنیا میں دیوی اور دیوتا قرار دے کر پوجا گیا اور وہ تمام جن، ارواح، اسلاف، اجداد، انبیاء، اولیاء، شہداء وغیرہ جن کو خدائی صفات میں شریک ٹھہرا کر وہ حقوق انہیں ادا کئے گئے جو دراصل خدا کے حقوق تھے وہاں اپنے پرستاروں سے صاف کہہ دیں گے کہ ہمیں تو خبر تک نہ تھی کہ تم ہماری عبادت بجالا رہے ہو۔ تمہاری کوئی دعا، کوئی التجا، کوئی پکار اور فریاد، کوئی نذر و نیاز، کوئی چڑھاوے کی چیز، کوئی تعریف و مدح اور ہمارے نام کی جاپ اور کوئی سجدہ ریزی، آستانہ بوسی و درگاہ گردی ہم تک نہیں پہنچی۔"

آیات ۷۵ تا ۹۳ میں تمام تر خطاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم (بنی اسرائیل) اور فرعون کے درمیان مختلف واقعات پر مبنی ہے جس کیلئے درج ذیل حواشی (۷۳ تا ۸۰) کا خلاصہ نہایت غور کے قابل ہیں۔

☆......حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کا فرعون کو دعوتِ توحید و رسالت دینا اور اس کا گھمنڈ وانکار کرنا اور اسے جادو کا کرشمہ قرار دینا (آیات ۷۵ تا ۷۷)

☆......فرعون نے کہا کہ تم ہمیں اپنے "باپ دادا کے طریقے" سے پھیرنا چاہتے ہو اور زمین میں "اپنی بڑائی" قائم کرنا چاہتے ہو؟

☆......جادوگروں سے مقابلہ اور ناکامی۔

☆......موسیٰ علیہ السلام کی قوم (بنی اسرائیل) میں سے چند نوجوانوں کا ایمان لانا، فرعون کے ڈر اور اپنی قوم کے "بڑوں" (سربرآوردہ لوگوں) کے خوف کہ فرعون انہیں عذاب میں مبتلا کرے گا۔

اس مقام پر سید مودودیؒ نے تشریحی نوٹ نمبر ۷۸ تا ۷۹ میں لکھا

"اس پرخطر زمانے میں حق کا ساتھ دینے اور علمبردارِ حق کو اپنا راہ نما تسلیم کرنے کی جرأت چند لڑکوں اور لڑکیوں نے تو کی مگر ماؤں اور باپوں اور قوم کے سن رسیدہ لوگوں کو اس کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ ان پر مصلحت پرستی اور دنیاوی اغراض کی بندگی اور عافیت کوشی کچھ اس طرح چھائی رہی کہ وہ ایسے حق کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوئے جن کا راستہ ان کو خطرات سے پرنظر آرہا تھا بلکہ وہ الٹے نوجوانوں ہی کو روکتے رہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے قریب نہ جاؤ ورنہ تم خود بھی فرعون کے غضب میں مبتلا ہوگے اور ہم پر بھی آفت لاؤ گے۔"

(نوجوان نسل کے کردار کے بارے میں مزید گفتگو باب ششم میں ہے)

یہاں سید مودودی نے قرآن کی یہ بات خاص طور پر اس لئے نمایاں کی ہے کہ مکہ کی آبادی میں سے بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دینے کیلئے جو لوگ آگے بڑھے تھے وہ قوم کے بڑے بوڑھے اور سن رسیدہ لوگ نہ تھے بلکہ چند باہمت نوجوان ہی تھے۔ وہ ابتدائی مسلمان

جوان آیات کے نزول کے وقت ساری قوم کے شدید مخالفت کے مقابلہ میں صداقتِ اسلامی کی حمایت کر رہے تھے اور ظلم وستم کے اس طوفان میں جن کے سینے اسلام کیلئے سپر بنے ہوئے تھے، ان میں مصلحت بوش بوڑھا کوئی نہ تھا، سب کے سب جوان لوگ ہی تھے۔"

تاریخ کے مطالعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں انقلابات اور نا مساعد حالات کے خلاف نبرد آزما ہونے کی توفیق، اللہ کی جانب سے نوجوانوں ہی کو ملتی ہے اور یہ ہے وہ اصل خطرہ جس کا تدارک کرنے کیلئے الحادی طاقتوں نے جو منصوبہ بنایا ہے، ضرورت ہے کہ امتِ مسلمہ کا پڑھا لکھا طبقہ بالخصوص اسلامی مدارس میں پڑھانے اور دینی راہ نمائی کرنے والوں کیلئے قابلِ توجہ ہونی چاہئے۔ گزشتہ ادوار (برطانوی عہد سے لے کر آج تک) جس قسم کا نظام تعلیم اس قوم کے سیاست دانوں، لبرل طبقے اور اس کے مقابلہ میں دینی علوم کے شناسا لوگوں نے چلایا ہے، وہ مخالفانہ اور محاربانہ نوعیت کا ہے، اس کے ذریعہ امت مسلمہ کا وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا جو قرآن کا مطمحِ نظر ہے اور جسے غالب کرنے کی ذمہ داری، بنی اسرائیل کی کے بعد بطور امت وسط، امت محمدیہ کا نصب العین قرار دیا گیا تھا اور جن کو پورا نہ کرنے میں دنیادار لوگوں کو تو چھوڑ یئے، دینداروں کو بھی اس کا شعور نہیں ہے، یہاں تو المیہ یہ ہے کہ علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اور مفسرینِ قرآن وشیوخ حدیث تک کو یہ احساس نہیں کہ قرآن کا مطلوب کیا ہے؟◆

درج بالا سطور میں وطن عزیز میں رائج ہر دو طرح کے نظامہائے تعلیم کے ضمن میں "مخالفانہ اور محاربانہ" الفاظ سے موسوم کیا ہے۔ ہماری اس رائے کی تائید اس دور کے ایک بہت بڑے صاحب علم پروفیسر ڈاکٹر محمود غازی مرحوم نے یوں کی

"دینی اور دنیوی تعلیم کے دو طرح کے اداروں کا وجود سیکولرازم کو فروغ دے رہا ہے۔" (۲۰۰۹)

◆ کم از کم ہم جیسے گنہگار طالب علموں نے ایسا خطبہ، اس قسم کے اہل علم کی زبان سے نہیں سنا!

موجودہ زمانے میں حرم اور اہل حرم کو جن مسائل کا سامنا ہے، اگر دینی مدارس میں پڑھانے والے اساتذہ نیز طلباء، ان مسائل کو حل کرنے کیلئے ممد و معاون ثابت نہیں ہو رہے تو پھر بقول اقبالؒ

یہ حکمت ملکوتی، یہ عالمِ لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور
تیری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہاں کوئی صاحب یہ سوال کر سکتے ہیں کہ آپ کی گفتگو کا تمام تر "حملہ" اہل دین پر ہے۔ ہرگز ہرگز ایسا نہیں۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس گئے گزرے دور میں بھی امت مسلمہ کی نظریں اس طبقے کی جانب ہی اٹھتی ہیں جن کے پاس دینِ الٰہی (قرآن وسنت) کا خالص علم ہے۔ چونکہ ہماری اس تحریر کا مقصدِ تالیف بھی یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کے جن خیالات و اعمال کی بناء پر اللہ تبارک وتعالیٰ کو چار ہزار سالہ امت مسلمہ (جس میں ہزاروں برگزیدہ ترین انبیاء کا نزول ہوا) کو معزول کر کے اس منصبِ جلیلہ پر امتِ محمدیہ ﷺ کو فائز کرنا پڑا۔ لیکن امت محمدیہ ﷺ اس مقصد کو بھول گئی اور ہمیں اس فروگذاشت کی یاددہانی کرانے کی ضرورت پیش آئی تاکہ وہ اس آئینے میں اپنی اس حالت زار کا جائزہ لے سکیں۔ دیکھئے علامہ اقبال نے "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں شیطان کے ایجنڈے کو کس خوبی سے واضح کیا۔

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں!

پھر شیطان نے اپنے مریدوں کو یوں مستقبل کا لائحہ عمل اور ایجنڈا دیا ہے

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

اورمزید ہدایت کی

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

یہاں ہم ایک آخری بات کی جانب اپنے قارئین کی توجہ دلا کر اس گفتگو کو ختم کرتے ہیں کہ سترہویں اٹھارویں صدی عیسوی میں یورپ میں بھی قریباً اس قسم کے مسائل تھے۔ وہ (سائنسی و صنعتی انقلاب) شہروں کی جانب آبادی کا بہاؤ *(URBANIZATION)* اور انقلابِ فرانس، تحریک احیائے علوم وغیرہ) جیسے مسائل کو حل کرنے میں عیسائی مذہبی راہ نما ناکام رہے۔ انہوں نے اقرارِ عصیاں *(CONFESSION)* کے نام سے جاسوسی اور انتقام کا ایک ایسا نظام وضع کیا جس کے تحت ہزاروں افراد اور بڑے بڑے سائینس دانوں کو نہ صرف مار ڈالا بلکہ اکثر کی ہڈیاں تک قبروں سے نکال کر انہیں پھانسی پر چڑھایا گیا۔ نتیجہ اس ہلاکت خیز دور الحاد کی شکل میں نمودار ہوا جس کے پس منظر میں *NO GOD, NO CHURCH, NO KING* کا فلسفہ کام کر رہا تھا اور جسے علامہ اقبالؒ نے ''لا کلیسا، لا سلاطین، لا الہٰ'' سے واضح کیا جس کی وجہ سے عیسائیت کے سب سے بڑے پوپ کو ویٹی کن سٹی (روم) کی چار دیواری میں محصور ہونا پڑا بلکہ جس کے نتیجے میں آج کی دنیا بالعموم اور عالم اسلام کو بالخصوص پاکستان میں رہنے والی امتِ مسلمہ کیلئے مسائل (تعلیمی، معاشرتی، معاشی اور نظریاتی و جغرافیائی) کا ایک بہت بڑا طوفان کھڑا کر دیا گیا ہے ـــــــ موجودہ زمانے میں ٹی وی، انٹرنیٹ، موبائل اور میڈیا کی یلغار اور بے پناہ ادھم نے جنسی انارکی کا ایک طوفان عالمی پیمانے پر برپا کر دیا ہے۔ یہ طوفان امت مسلمہ کے گھروں میں داخل ہو چکا ہے۔ مسلم خاندان کا ادارہ اس وقت بے پناہ خطرات میں گھرا ہوا ہے۔ فی زمانہ ابلاغ عامہ اور درسی کتب کے ذریعہ نوجوانوں کو جو تعلیم دی جارہی ہے نیز مختلف وجوہات کی بناء پر شادی بیاہ

میں تاخیر اور معاشرے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا رجحان، غربت کا عفریت اور صحتِ عامہ کا گرتا ہوا معیار نیز ایڈز جیسی مہلک بیماریوں کا حملہ، چند ایسے عوامل ہیں جن کی وجہ سے مسلم معاشرے میں خاندانی نظام کے قیام میں نہ صرف تاخیر ہو رہی ہے بلکہ طلاقوں کی بڑھتی ہوئی شرح سے خاندان کا ادارہ سخت خطرات کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ (محمد اکبر خان ۲۰۱۱، محمد آفتاب خان وریاض اختر ۲۰۱۲، انصار عباسی ۲۰۱۲، عبدالقیوم (ریٹائیرڈ جنرل) ۲۰۱۲)۔ ظاہر ہے کہ ان گھمبیر مسائل کے حل کے لئے جس طبقے کو اولیت حاصل ہونی چاہیئے وہ منبر و محراب سے تعلق رکھنے والے اصحاب ہی ہیں!

سورہ ھود:

قیامت کے روز جن مکالموں کی بات ہو رہی ہے، اس کی مزید تفصیل سورہ ھود کے مطالعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ سورہ ہود، مکہ میں نازل ہوئی اس کا زمانۂ نزول بھی اہل علم کے نزدیک سورہ یونس سے متصل ہے۔ اس میں جہاں سورہ یونس کے موضوعات دعوت، فہمائش اور تنبیہہ پر مشتمل ہیں وہاں اس میں خطاب قوم نوح، عاد، ثمود، قوم لوط، اصحاب مدین اور قوم فرعون کے حقائق بیان کرنے کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ خدا جب فیصلہ چکانے پر آتا ہے تو پھر بالکل بے لاگ طریقے سے چکاتا ہے۔ اس میں کسی کے ساتھ ذرہ برابر رعایت نہیں ہوتی۔ جب معاملہ ایمان و کفر کا درپیش ہو تو دین کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ خود مومن بھی باپ بیٹے اور شوہر اور بیوی کے رشتوں کو بھول جائے۔ ایسے موقع پر خون اور نسب کی رشتہ داریوں کا ذرہ برابر لحاظ کرنا اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ اسلام کا تقاضا ہے

بندۂ عشق شوی ترکِ نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست!

اس دین کا مزاج ہے کہ یہاں ابولہب اور ابوجہل (سرداران مکہ اور پیغمبرؑ کے چچا) راندۂ درگاہ ٹھہرتے ہیں اور افریقہ کا رہنے والا غلام سیدنا بلال رضی اللہ عنہ بن جاتا ہے۔ اور کعبہ کی چھت پر کھڑا ہو کر اذان دیتا ہے!

اس پس منظر میں جب ہم سورہ ہود کا مطالعہ کرتے ہیں تو آیات ۲۵ تا ۴۹، حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت اور اس کے جواب میں ان تمام کٹ حجیتوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تاہم اس واقعہ کا خاتمہ، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو صبر کی تلقین سے کیا کہ انجامِ کار متقی لوگوں کے حق مین ہی ہوتا ہے (آیت ۴۹)

سورہ ہود کی کلائمیکس آیات ۹۷ تا ۹۹ پر مشتمل ہیں جن میں فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت کو دعوت دینے کیلئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا۔ قرآن نے نہایت ہی بلیغ، مؤثر لیکن نہایت مختصر الفاظ میں جو تصویر کھینچی وہ اس قدر دلکش اور من موہنی ہے کہ

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جاں اینجاست!

کا مصداق ہے تاہم دوسری جانب اسقدر دل ہلا دینے والی بھی ہے کہ اس کے تصور سے ہی ایک انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"—— موسیٰ کو ہم نے اپنی نشانیوں اور کھلی کھلی سندِ ماموریت کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت کی طرف بھیجا، مگر انہوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی حالانکہ فرعون کا حکم راستی پر نہ تھا۔ قیامت کے روز وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور اپنی پیشوائی میں انہیں دوزخ کی طرف لے جائے گا۔ کیسی بدتر جائے ورود ہے یہ جس پر کوئی پہنچے اور ان لوگوں پر دنیا میں بھی لعنت پڑی اور قیامت کے روز بھی پڑے گی۔ کیسا برا صلہ ہے یہ جو کسی کو ملے گا۔" (آیت ۹۹)

ان آیاتِ قرآنی، نیز ان سے متصل اگلی آیات (۱۰۰ تا ۱۰۴) کی تشریح کرتے ہوئے سید مودودیؒ نے جو نوٹ لکھے ہیں (نمبر ۱۰۴ تا ۱۰۶) وہ اس قابل ہیں کہ امت مسلمہ کا ہر ایک فرد، گروہ، جماعت، فرقہ غرضیکہ جوان، بوڑھا، مرد اور عورت انہیں نہ صرف پڑھے بلکہ حرزِ جان بنالے اور آج ہی فیصلہ کرے کہ وہ کس گروہ میں، کس کی معیت میں، اور کس کے جھنڈے تلے، اللہ کی عدالت میں پیش ہونا چاہتا ہے؟

فیصلہ تیرا، ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟

''اس آیت سے اور قرآن مجید کی بعض دوسری تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ دنیا میں کسی قوم یا جماعت کے رہنما ہوتے ہیں وہی قیامت کے روز بھی اس کے رہنما ہوں گے۔ اگر وہ دنیا میں نیکی اور سچائی اور حق کی طرف رہنمائی کرتے ہیں تو جن لوگوں نے یہاں ان کی پیروی کی ہے وہ قیامت کے روز بھی انہی کے جھنڈے تلے جمع ہوں گے اور ان کی پیشوائی میں جنت کی طرف جائیں گے۔ اور اگر وہ دنیا میں کسی ضلالت، کسی بداخلاقی یا کسی ایسی راہ کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں جو دین حق کی راہ نہیں ہے، تو جو لوگ یہاں ان کے پیچھے چل رہے ہیں وہ وہاں بھی ان کے پیچھے ہوں گے اور انہی کی سرکردگی میں جہنم کا رخ کریں گے۔ اسی مضمون کی ترجمانی نبی ﷺ کے اس ارشاد میں پائی جاتی ہے کہ ''قیامت کے روز جاہلیت کی شاعری کا جھنڈا امرؤالقیس کے ہاتھ میں ہوگا اور عرب جاہلیت کے تمام شعراء اسی کی پیشوائی میں دوزخ کی راہ لیں گے۔'' اب یہ منظر ہر شخص کا اپنا تخیل اس کی آنکھوں کے سامنے کھینچ سکتا ہے کہ یہ دونوں قسم کے جلوس کس شان سے اپنی منزل مقصود کی طرف جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ جن لیڈروں نے دنیا میں لوگوں کو گمراہ کیا اور خلافِ حق راہوں پر چلایا ہے ان کے پیرو جب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے یہ ظالم ہم کو کس خوفناک انجام کی طرف کھینچ لائے ہیں، تو وہ اپنی ساری مصیبتوں کا ذمہ دار انہی کو سمجھیں گے اور ان کا جلوس اس شان سے دوزخ کی راہ پر رواں ہوگا کہ آگے آگے وہ ہوں گے اور پیچھے پیچھے ان کے پیرووٗں کا ہجوم ان کو گالیاں دیتا ہوا اور ان پر لعنتوں کی بوچھاڑ کرتا ہوا جا رہا ہوگا۔ بخلاف اس کے جن لوگوں کی رہنمائی نے لوگوں کو جنت نعیم کا مستحق بنایا ہوگا ان کے پیرو اپنا یہ انجام خیر دیکھ کر اپنے لیڈروں کو دعائیں دیتے ہوئے اور ان پر مدح و تحسین کے پھول برساتے ہوئے چلیں گے۔'' (حاشیہ نمبر ۱۰۴)

اس جگہ عوام الناس اور اُن تمام لوگوں کو جو دنیا میں پیری/مریدی کے قائل ہیں، ان کے اس خیال کی تردید کی جا رہی ہے کہ قیامت میں ان کی سفارش کام دے گی۔ سید مودودی نے تصریح کی۔

''یہ بے وقوف لوگ اپنی جگہ اس بھروسے میں ہیں کہ فلاں حضرت ہماری سفارش کر کے ہمیں بچا لیں گے، فلاں بزرگ اڑ کر بیٹھ جائیں گے اور اپنے ایک ایک متوسل کو بخشوائے بغیر نہ مانیں گے، فلاں صاحب جو اللہ میاں کے چہیتے ہیں جنت کے راستے میں مچل بیٹھیں گے اور اپنے دامن گرفتوں کی بخشش کا پروانہ لے کر ہی ٹلیں گے۔ حالانکہ اڑنا اور مچلنا کیسا اس پر جلال عدالت میں تو کسی بڑے سے بڑے انسان اور کسی معزز سے معزز فرشتے کو بھی مجال دم زدن تک نہ ہوگی اور اگر کوئی کچھ کہہ بھی سکے گا تو اس وقت جبکہ احکم الحاکمین خود اسے کچھ عرض کرنے کی اجازت دیدے۔ پس جو لوگ یہ سمجھتے ہوئے غیر اللہ کے آستانوں پر نذریں اور نیازیں چڑھا رہے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں بڑا اثر و رسوخ رکھتے ہیں اور ان کی سفارش کے بھروسے پر اپنے نامۂ اعمال سیاہ کئے جا رہے ہیں، ان کو وہاں سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ (حاشیہ نمبر ۱۰۶)

اس سے اگلی آیات نمبر ۱۰۹ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی ڈھارس بندھاتے ہوئے فرمایا کہ مشرکین مکہ جن کی عبادت کر رہے ہیں ان کے بارے میں کسی شک میں نہ رہیں۔ یہ لوگ بس لکیر کے فقیر بنے ہوئے اس طرح پوجا پاٹ کر رہے ہیں جس طرح پہلے ان سے باپ دادا کرتے تھے۔ اس ضمن میں حاشیہ نمبر ۱۱۰ بہت معنی خیز ہے۔ سید مودودیؒ نے لکھا:

"دراصل یہ باتیں نبی ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے عامۃ الناس کو سنائی جا رہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کسی مرد معقول کو اس شک میں نہ رہنا چاہئے کہ یہ لوگ جو ان معبودوں کی پرستش کرنے اور ان سے دعائیں مانگنے میں لگے ہوئے ہیں آخر کچھ تو انہوں نے دیکھا ہوگا جس کی وجہ سے یہ ان سے نفع کی امیدیں رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ پرستش اور نذریں اور دعائیں کسی علم، کسی تجربے اور کسی حقیقی مشاہدے کی بناء پر نہیں ہیں بلکہ یہ سب کچھ نری اندھی تقلید کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ آخر یہی آستانے پچھلی قوموں کے ہاں بھی تو موجود تھے۔ اور ایسی ہی ان کی کرامتیں ان سے بھی مشہور تھیں مگر جب خدا کا عذاب آیا تو وہ

تباہ ہو گئیں اور یہ آستانے یونہی دھرے کے دھرے رہ گئے۔''

سورہ ابراہیم:

اپنے مطالعہ قرآن میں اب ہم سورہ ابراہیم تک پہنچ گئے ہیں۔ یہ سورہ مکہ کے آخری دور میں نازل ہونے والی سورت ہے۔ آیات ۲۱ سے ۲۳ میں سہ بارہ اس مکالمے کا ذکر کیا گیا ہے جو آخرت میں دو گروہوں کے درمیان ہوگا۔ روز قیامت، دنیا میں کمزور لوگ، ان لوگوں سے جو بڑے بنے ہوئے تھے کہیں گے کہ دنیا میں تو ہم نے تمہاری اطاعت کی تھی، کیا اب اللہ کے عذاب سے ہمیں بچانے کیلئے کچھ کر سکتے ہو؟ (مفہوم آیات ۲۱)۔ یہاں حاشیہ نمبر ۲۹ میں سید مودودی کا توضیحی حاشیہ پڑھنے کے لائق ہی نہیں بلکہ آج کے دور میں جو لوگ دنیا میں "بڑے" بنے ہوئے ہیں (اہل سیاست اور حکمران، مذہبی راہنما، صاحبان دستار وفضیلت اور عوام الناس) جو ان تمام لوگوں کی اطاعت اور پیروی میں دنیا اور آخرت کی بھلائی کی خام خیالی میں مبتلا ہیں، ان سب کے سوچنے کے لئے ایک موقعہ ہے۔ سید مودودیؒ نے لکھا "یہ تنبیہہ ہے ان سب لوگوں کیلئے جو دنیا میں آنکھیں بند کر کے دوسروں کے پیچھے چلتے ہیں یا اپنی کمزوری کو حجت بنا کر طاقت ور ظالموں کی اطاعت کرتے ہین۔ ان کو بتایا جارہا ہے کہ آج جو تمہارے لیڈر اور پیشوا اور افسر اور حاکم بنے ہوئے ہیں، کل ان میں سے کوئی بھی تمہیں خدا کے عذاب سے ذرہ برابر بھی نہ بچا سکے گا۔ لہذا آج ہی سوچ لو کہ تم جن کے پیچھے چل رہے ہو یا جن کا حکم مان رہے ہیں وہ خود کہاں جارہا ہے اور تمہیں کہاں پہنچا کر چھوڑے گا۔"

اس ضمن میں دلچسپ پہلو یہ ہے کہ آیت نمبر ۲۲ میں شیطان کی وہ گفتگو بھی لائق توجہ ہے جب وہ دنیا میں کئے گئے اپنے وعدوں کو تسلیم کرتے ہوئے کہے گا کہ ان دعووں کو تسلیم کرنا نہ کرنا تو تمہارے اختیار میں تھا۔ تم نے دنیا میں انبیاء کے بتائے ہوئے اللہ کے وعدوں کو تسلیم نہ کیا اور مجھے ہی خدائی میں شریک کئے رکھا تھا، اس کے ذمہ دار تم خود ہو——— اب مجھے ملامت مت کرو!'' (مفہوم حاشیہ ۳۰)

اس کے تسلسل میں سید مودودیؒ نے حاشیہ نمبر ۳۲ میں شرک کی ایک دوسری قسم جس میں نہ صرف ہر زمانے بلکہ موجودہ زمانے کے مسلمان بھی گرفتار ہیں کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے وضاحت کی کہ "شیطان کو اعتقادی حیثیت سے تو کوئی بھی خدائی میں شریک نہیں ٹھہراتا ـــــ البتہ اس کی اطاعت اور غلامی اور اس کے طریقے کی اندھی یا آنکھوں دیکھے پیروی ضرور کی جا رہی ہے۔" ـــــ اس ضمن میں متعدد مثالوں از قسم "یہودیوں اور عیسائیوں کو یہ الزام کہ وہ اپنے احبار اور رہبان کو ارباب من دون اللہ بنائے ہوئے ہیں (التوبۃ آیت ۳۱)، جاہلیت کی رسمیں ایجاد کرنے والوں کے متعلق یہ کہنا کہ ان کے پیروؤں نے انہیں خدا کا شریک بنا رکھا ہے (الانعام آیت ۱۳۷)، نیز اسی طرح سورہ الفرقان آیت ۴۳۔ کیا یہ سب اس شرک کی عملی نظیریں نہیں ہیں جن کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔" ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے جس کا ذکر یہاں ہو رہا ہے بلکہ اس کی ایک دوسری صورت یہ بھی ہے کہ کوئی شخص خدائی سند کے بغیر یا خدائی ہدایت کے علی الرغم ان کی پیروی کرتا چلا جائے (مفہوم)

سورہ بنی اسرائیل

اب ہم اپنے مطالعۂ قرآن کے سفر میں سورہ بنی اسرائیل تک پہنچ گئے ہیں جس کی آیت نمبر ۱۶ میں قرآن کریم نے ایک ایسی بدیہی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے جس سے ہر زمانے میں (قدیم ترین تا آج کی مہذب اور تعلیم یافتہ افراد/اقوام) نے صرفِ نظر کیا ہے تاہم تاریخی حقائق اور فطری قوانین کسی کے ماننے یا نہ ماننے سے تبدیل نہیں ہوتے۔ وہ تاریخی حقیقت جس پر ہزاروں سالہ انسانی تاریخ گواہ ہے، وہ قرآن نے واضح کی۔

وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴿۱۶﴾ وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ
(بنی اسرائیل)

"جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس کے "خوشحال

لوگوں" کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں۔ تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہوجاتا ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ دیکھ لو، کتنی ہی نسلیں ہیں جو نوح علیہ السلام کے بعد ہمارے حکم سے ہلاک ہوئیں ــــــ"

سید مودودیؒ نے حاشیہ نمبر ۱۸ میں لکھا کہ" دراصل جس حقیقت پر اس آیت میں متنبہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک معاشرے کو آخر کار جو چیز تباہ کرتی ہے وہ اس کے کھاتے پیتے خوشحال لوگوں اور اونچے طبقے کا بگاڑ ہے۔ جب کسی قوم کی شامت آنی ہوتی ہے تو اس کے دولتمند اور صاحب اقتدار لوگ فسق و فجور پر اتر آتے ہیں۔ظلم وستم اور بدکاریاں اور شرارتیں کرنے لگتے ہیں، اور آخر یہی فتنہ پوری قوم کو لے ڈوبتا ہے۔لہٰذا جو معاشرہ آپ اپنا دشمن نہ ہو اسے فکر رکھنی چاہیے کہ اس کے ہاں اقتدار کی باگیں اور معاشی دولت کی کنجیاں کم ظرف اور بداخلاق لوگوں کے ہاتھوں میں نہ جانے پائیں۔"

جیسا کہ ہم نے درج بالا قرآنی آیات میں قانونِ فطری وطبعی کا مطالعہ کیا اور سید مودودیؒ نے وضاحت کی کہ قوم کا صاحب ثروت (مترفین) اور خوشحال طبقہ بدی کے مختلف کاموں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔حضرت نوح علیہ السلام کے بعد سے لے کر آج تک دنیا کے خطے پر موجود تمام انسان دراصل، ان لوگوں کی نسل سے ہیں جو طوفان نوح علیہ السلام کے موقعہ پر آں جناب کی کشتی پر سوار تھے۔ اس وقت سے لے کر آج تک اس دنیا میں جتنے بھی فرعون، نمرود، ہامان اور جدید زمانے کی خوشحال قومیں گزری ہیں، ان کی تباہی کے عوامل میں یہی قرآنی حقیقت نظر آتی ہے۔ پھر تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بادشاہوں اور دولتمند طبقے کے ساتھ تعاون کرنے میں مذہبی عناصر بھی برابر کے شامل رہے ہیں۔ ہماری اپنی تاریخ میں امویوں، عباسیوں اور بعدازاں خلافت عثمانیہ نیز برصغیر میں مغلوں کے دور میں اس قسم کے "نام نہاد اہل علم" کا برابر حصہ رہا ہے۔ اس طبقے نے بادشاہوں، اہل ثروت کو دو طریقوں سے گمراہ کیا ہے۔ ایک یہ کہ ان کی غلطیوں پر انہیں ٹوکا نہیں یعنی جو ان کا فرضِ منصبی

تھا بلکہ ایسی ایسی راہوں پر بھی ڈالا جو بہت بڑے بڑے فتنوں کا نکتہ آغاز بنیں۔ یورپ کی تاریخ اس پر گواہ ہے جب بادشاہوں اور بڑے بڑے لوگوں کی پشت پناہی میں چرچ نے ان کا ساتھ دیا۔ بادشاہوں / ڈکٹیٹروں نے عیسائی مذہبی راہ نماؤں کی اشیر باد سے کونسے ظلم ہیں جو غریب عوام پر نہیں ڈھائے۔ پھر اس مذہبی طبقے نے ہر اس اسلامی تحریک، علمی کاوش اور ایجاد و اختراع کی جس اندھے انداز میں مخالفت کی، اس سے بھی تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔

جب ہم ان آیاتِ کریمہ کی روشنی میں اپنے ملکی حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ موجودہ دور میں ملتِ اسلامیہ پاکستان بالخصوص (اور دیگر اسلامی ممالک کی امت مسلمہ بالعموم) جن دگرگوں حالات سے دوچار ہیں، وہ سب کا سب اس مترفین اور خوشحال طبقے کا مرہونِ منت ہے اور جس میں انہیں نام نہاد پیر صاحبان، مولوی، فقیر اور مذہبی راہنماؤں کی مکمل اشیر باد حاصل رہی ہے۔ گزشتہ ۷۰ سالوں میں اس ملک کے عوام کو دینی تعلیمات سے اس قدر بے بہرہ کر دیا گیا ہے کہ سوائے چند رسوم عبادات (نماز، روزہ، حج) کے وہ دین کی روح (قرآن اور اتباعِ رسولؐ) اور فکرِ آخرت سے ناآشنا ہو کر رہ گئے ہیں۔ انہیں یہ باور کرا دیا گیا ہے کہ تمہارا کام بس اس مذہبی طبقے کی خدمت کرنا ہے، آخرت میں تمہاری نجات ہم اللہ سے خود کرا لیں گے۔ یہ وہی زعمِ باطل ہے جو مشرکین دنیا اور بالخصوص بنی اسرائیل کے مذہبی لوگ کا شیوہ تھا۔ جن کی تردید سے قرآن کریم کی آیات بھری پڑی ہیں۔ شرک کی کونسی قسم ہے جس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب، دولتمند، سرکاری افسران، تاجر اور عوام گرفتار نہیں ہیں؟ حکمرانوں اور نام نہاد دیندار طبقے نے عام و خاص کو ایک ایسے سحر میں مبتلا کر دیا ہے کہ اس سے چھٹکارے کی کوئی صورت سمجھ نہیں آ رہی۔ کیا یہ امت بھی، بنی اسرائیل کی طرح اللہ کے عذاب کے کوڑے کی منتظر ہے کہ جس کے حرکت میں آنے کے بعد کسی کے ساتھ کوئی رورعایت نہیں برتی جاتی؟ قرآنی تعلیمات کا یہی خلاصہ اور روح ہے۔

ہم نے درج بالا صفحے میں جو گزارشات کی ہیں، ان کے بارے میں کوئی "صاحبِ

دل" یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو سیاسی باتیں ہیں اور دراصل قرآنی آیات کی تاویل کے ذریعہ "اقتدار کا حصول" مطمحِ نظر ہے۔ ہم اپنی طرف سے اس امر کے بارے میں کچھ کہنے سے بہتر سمجھتے ہیں کہ قرآن کی اس سورت بنی اسرائیل کی آیت کی جانب اس قسم کا ذہن رکھنے والے اپنے تمام مہربانوں کی توجہ مبذول کرائیں جس میں اللہ کریم نے اپنے نبیؐ کو بھی یہ دعا سکھائی کہ

وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ۝۸۰

"اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔"

اس کی تشریح میں حاشیہ نمبر ۱۰۰ میں سید مودودی نے لکھا:

"یعنی یا تو مجھے خود اقتدار عطا کر، یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنا دے تاکہ اس کی طاقت سے میں دنیا کے اس بگاڑ کو درست کر سکوں۔ فواحش اور معاصی کے اس سیلاب کو روک سکوں اور تیرے قانونِ عدل کو جاری کر سکوں۔ یہی تفسیر ہے اس آیت کی جو حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے، اور اس کو ابن جریر اور ابن کثیر جیسے جلیل القدر مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ (حاشیہ نمبر ۱۰۰) اور اس کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث کرتی ہے۔" ''یعنی اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سد باب کر دیتا ہے جن کا سد باب قرآن سے نہیں کرتا۔'' اس سے معلوم ہوا کہ اسلام دنیا میں جو اصلاح چاہتا ہے وہ صرف وعظ و تذکیر سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کو عمل میں لانے کیلئے سیاسی طاقت بھی درکار ہے۔ پھر جب کہ یہ دعا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خود سکھائی ہے تو اس سے بھی یہ ثابت ہوا کہ اقامت دین اور نفاذ شریعت اور اجرائے حدود اللہ کے لئے حکومت چاہنا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا نہ صرف جائز بلکہ مطلوب و مقصود ہے اور وہ لوگ غلطی پر ہیں جو اسے دنیا پرستی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دنیا پرستی اگر ہے تو یہ کہ کوئی شخص اپنے لئے حکومت کا طالب ہو۔ رہا خدا کے دین کیلئے حکومت کا طالب ہونا تو یہ دنیا پرستی نہیں بلکہ خدا پرستی کا عین تقاضا ہے۔ اگر جہاد کیلئے تلوار کا طالب ہونا گناہ نہیں ہے تو اجرائے احکامِ شریعت کیلئے سیاسی اقتدار کا

طالب ہونا آخر کیسے گناہ ہو جائیگا۔" (حاشیہ ۱۰۰)

سورہ النمل:

بروزِ قیامت ہر دو فریقین کا مطالعہ اب ہمیں سورہ النمل تک لے آیا ہے۔ اس کی آیت ۴۵ میں قوم ثمود کی طرف بھیجے گئے رسول (حضرت صالح علیہ السلام) کا ذکر ہے۔ (حاشیہ نمبر ۵۸)۔ دعوت دین دینے پر ان کی قوم میں یکایک دو مخاصم فریق بن گئے۔ اس کی تفصیل میں سید مودودیؒ نے لکھا کہ "جونہی کہ حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت کا آغاز ہوا، ان کی قوم دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ایک گروہ ایمان لانے والوں کا، دوسرا گروہ انکار کرنے والوں کا۔ اور اس تفرقہ کے ساتھ ہی ان کے درمیان کشمکش شروع ہوگئی جیسا کہ قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے۔" (سورہ الاعراف ۷۶۔۷۵)

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝

''اس کی قوم کے سرداروں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے کمزور طبقہ کے ان لوگوں سے جو ایمان لے آئے تھے، کہا ''کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح علیہ السلام اپنے رب کا پیغمبر ہے؟ انہوں نے جواب دیا بے شک جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے اسے ہم مانتے ہیں'' ان بڑائی کے مدعیوں نے کہا جس چیز کو تم نے مانا ہے ہم اس کے منکر ہیں۔''

سورہ النمل میں آیات ۴۸ میں "نو جتھے داروں" کا ذکر ہے جو ملک میں فساد پھیلاتے تھے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے تھے۔'' اس کی تشریح یوں کی کہ ۹ سردارانِ قبائل تھے جن میں سے ہر ایک اپنے ساتھ ایک بڑا جتھا رکھتا تھا۔ (حاشیہ ۶۲)

قرآن کریم کا یہ ایک عجیب اعجاز ہے کہ اس کی آیات میں ہزاروں سال پہلے کی تاریخ کے واقعات پر تبصرہ ہو رہا ہوتا ہے لیکن اس کا عملی انطباق نہ صرف ۱۴ سو سال قبل کفار مکہ

کے حالات پر ہورہا ہوتا ہے بلکہ زمانۂ حال میں بھی ان آیاتِ ربانی سے راہ نمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔کیا یہ ایک امر واقعہ نہیں کہ موجودہ زمانے میں سیاسی پارٹیوں، مذہبی قوتوں، لسانی گروہوں، صوبائیت پرستوں اور نمعلوم کن کن جہالتوں میں مبتلا لوگوں کی جتھہ بندیوں پر بھی یہ قرآنی تبصرہ ایسے ہی منطبق ہورہا ہے جس طرح اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں کفار مکہ اس کے مخاطب تھے؟ کیا وہ تمام لوگ جو فی زمانہ جتھہ بندیوں کے لیڈر اور سرغنہ ہیں، اور وہ بہر حال مسلمان ہونے کے دعویدار بھی ہیں۔کیا ان کیلئے ابھی وہ گھڑی نہیں آئی کہ وہ اپنے طرزِ عمل کا جائزہ ان آیات کریمہ کی روشنی میں لیں اور سوچیں کہ اس آیت کا ایک ایک لفظ ''مجھ سے'' (ذاتی اور انفرادی طور پر) بطور جتھہ بندی کے سردار، کیا کہہ رہا ہے؟

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ (الحدید:۱۶)

''کیا ایمان لانے والوں کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں اور اس کے نازل کردہ حق کے آگے جھکیں اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہوجائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ایک لمبی مدت ان پر گذر گئی تو ان کے دل سخت ہوگئے اور آج ان میں سے اکثر فاسق بنے ہوئے ہیں۔''

سورہ الاحزاب:

قرآن کریم میں اپنے ان مکالماتی آیات کا مطالعہ کرتے ہوئے اب ہم سورۃ الاحزاب تک پہنچ گئے ہیں۔یہ طویل سورت مدینہ میں نازل ہوئی۔اس کے تاریخی پس منظر اور دیگر موضوعات پر اس کا دیباچہ پڑھنے کی ضرورت ہے۔تاہم اس سورت کی آیت ۲۶ تا ۲۹ میں دو اہم ترین امور کی جانب راہنمائی دی گئی ہے:

اولاً ـــــ روز قیامت کفار و منافقین کو جب سزا ملے گی تو وہاں سرداروں (سیاسی) اور دیگر بڑوں (دینی راہ نماؤں) پر لعنت کرنے اور دہرے عذاب کا ذکر ہے۔

ثانیاً ـــــ عام مسلمانوں کو کہا جا رہا ہے کہ وہ ان لوگوں جیسے نہ بنیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو اذیتیں دی تھیں۔ اس ضمن میں حاشیہ جات ۱۱۷ تا ۱۱۹ میں ان آیاتِ ربانی کی تشریح کی گئی ہے جو ذیل میں درج ہے:

حاشیہ نمبر ۱۱۸ میں عام مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کی طرح عمل نہ کریں جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم آنجناب علیہ السلام کو اذیتیں دیا کرتی تھی۔ اس تسلسل میں حاشیہ نمبر ۱۱۹ میں سید مودودیؒ رقمطراز ہیں کہ "اے مسلمانو! تم یہودیوں کی سی حرکتیں نہ کرو۔ تمہاری روش تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہ نہ ہونی چاہئے جو بنی اسرائیل کی روش حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھی۔ بنی اسرائیل خود مانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے سب سے بڑے محسن تھے۔ جو کچھ بھی یہ قوم بنی، انہی کی بدولت بنی۔ ورنہ مصر میں ان کا انجام ہندوستان کے شودروں سے بھی بدتر ہوتا۔ لیکن اپنے اس محسن اعظم کے ساتھ اس قوم کا جو سلوک تھا، اس کا اندازہ کرنے کیلئے بائبل کے حسب ذیل مقامات پر صرف ایک نظر ڈال لینا ہی کافی ہے:

کتاب خروج ۵: ۲۰-۲۱، ۱۴: ۱۱-۱۲ تا ۱۶: ۲-۳، ۱۷: ۳-۴

کتاب گنتی ۱۱: ۱ تا ۱۵، ۱۴: ۱۱ تا ۱۲، ۱۶ مکمل، ۲۰: ۱ تا ۵

''قرآن مجید بنی اسرائیل کی اس محسن کشی کی طرف اشارہ کر کے مسلمانوں کو متنبہ کر رہا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ طرزِ عمل اختیار کرنے سے بچو، ورنہ پھر اس انجام کیلئے تیار ہو جاؤ جو یہودی دیکھ چکے ہیں اور دیکھ رہے ہیں۔''

''یہی بات متعدد مواقع پر نبی نے بھی ارشاد فرمائے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ نبی مسلمانوں میں کچھ مال تقسیم کر رہے تھے۔ اس مجلس سے جب لوگ باہر نکلے تو ایک شخص نے کہا "محمدؐ نے اس تقسیم میں خدا اور آخرت کا کچھ بھی لحاظ نہ رکھا" یہ بات حضرت عبداللہ بن

مسعود رضی اللہ عنہ نے سن لی اور جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آج آپ پر یہ باتیں بنائی گئی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: "اللہ کی رحمت ہو موسی علیہ السلام پر، انہیں اس سے زیادہ اذیتیں دی گئیں اور انہوں نے صبر کیا۔" (مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد)

سورہ سبا

قرآن کریم کا مطالعاتی سفر اب ہمیں سورہ سبا تک لے آیا ہے۔ اس میں من جملہ ردِشرک اس مکالمے کا ذکر ہے جو قیامت میں ہر دو گروہوں کے درمیان ہوگا۔ ردِشرک کے حصے کو نظرانداز کرتے ہوئے ہم اپنے اب باب (مکالماتِ قرآنی) پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھیں گے۔

سورہ سبا کی آیت نمبر ۳۰ میں کفار کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ وہ ہرگز قرآن کو نہ مانیں گے —— نیز قیامت کے منظر کا نقشہ کھینچتے ہوئے ایک دوسرے پر الزام تراشی کا وہ پرانا حربہ استعمال کریں گے جس کی تصویر کشی پہلے متعدد آیات میں کی گئی ہے۔ سورہ سبا کے حاشیہ نمبر ۵۱ میں سید مودودیؒ یوں رقم طراز ہیں: ''یعنی عوام الناس جو آج دنیا میں اپنے لیڈروں، سرداروں، پیروں اور حاکموں کے پیچھے آنکھیں بند کیے چلے جا رہے ہیں، اور ان کے خلاف کسی ناصح کی بات پر کان دھرنے کو تیار نہیں ہیں، یہی عوام جب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ حقیقت کیا تھی اور ان کے یہ پیشوا انہیں کیا باور کرا رہے تھے اور جب انہیں یہ پتہ چل جائے گا کہ ان رہنماؤں کی پیروی انہیں کس انجام سے دوچار کرنے والی ہے تو یہ اپنے ان بزرگوں پر پلٹ پڑیں گے اور چیخ چیخ کر کہیں گے کہ کم بختو، تم نے ہمیں گمراہ کیا تم ہماری ساری مصیبتوں کے ذمہ دار ہو، تم ہمیں نہ بہکاتے تو ہم خدا کے رسولوں کی بات مان لیتے۔''

اسی گفتگو کے تسلسل میں حاشیہ نمبر ۵۲ میں ان لیڈروں کا جواب نقل کیا گیا ہے۔

''یعنی وہ کہیں گے کہ ہمارے پاس ایسی کوئی طاقت نہ تھی جس سے ہم چند انسان تم کروڑوں انسانوں کو زبردستی اپنی پیروی پر مجبور کر دیتے۔ اگر تم ایمان لانا چاہتے ہو تو ہماری سرداریوں اور پیشوائیوں اور حکومتوں کا تختہ الٹ سکتے تھے۔ ہماری فوج تو تم ہی تھے۔

ہماری دولت اور طاقت کا سرچشمہ تو تمہارے ہی ہاتھ میں تھا۔تم نذرانے اور ٹیکس نہ دیتے تو ہم مفلس تھے۔تم ہمارے ہاتھ پر بیعت نہ کرتے تو ہماری پیری ایک دن نہ چلتی۔تم زندہ باد کے نعرے نہ مارتے تو کوئی ہمارا پوچھنے والا نہ ہوتا۔تم ہماری فوج بن کر دنیا بھر سے ہمارے لئے لڑنے پر تیار نہ ہوتے تو ایک انسان پر بھی ہمارا بس نہ چل سکتا تھا۔اب کیوں نہیں مانتے کہ دراصل تم خود اس راستے پر نہ چلنا چاہتے تھے جو رسولوں نے تمہارے سامنے پیش کیا تھا۔تم اپنی اغراض اور خواہشات کے بندے تھے اور تمہارے نفس کی یہ مانگ رسولوں کی بتائی ہوئی راہ تقویٰ کے بجائے ہمارے ہاں پوری ہوتی تھی۔تم حرام وحلال سے بے نیاز ہو کر عیش دنیا کے طالب تھے اور وہ ہمارے پاس ہی تمہیں نظر آتا تھا۔**تم ایسے پیروں کی تلاش میں تھے جو تمہیں ہر طرح کے گناہوں کی کھلی چھوٹ دیں اور کچھ نذرانہ لے کر خدا کے ہاں تمہیں بخشوا دینے کی خود ذمہ داری لے لیں۔تم ایسے پنڈتوں اور مولویوں کے طلب گار تھے جو ہر شرک اور ہر بدعت اور تمہارے نفس کی ہر دل پسند چیز کو عین حق ثابت کر کے تمہارا دل خوش کریں اور اپنا کام بنائیں۔تم کو ایسے جعل سازوں کی ضرورت تھی جو خدا کے دین کو بدل کر تمہاری خواہشات کے مطابق ایک نیا دین گھڑیں۔تم کو ایسے لیڈر درکار تھے جو کسی نہ کسی طرح تمہاری دنیا بنا دیں خواہ عاقبت بگڑے یا درست ہو۔تم کو ایسے حاکم مطلوب تھے جو خود بدکردار اور بددیانت ہوں اور ان کی سرپرستی میں تمہیں ہر قسم کے گناہوں اور بدکرداریوں کی چھوٹ ملی رہے۔اس طرح ہمارے اور تمہارے درمیان برابر کے لین دین کا سودا ہوا تھا۔اب تم کہاں یہ ڈھونگ رچانے چلے ہو کہ گویا تم بڑے معصوم لوگ تھے اور ہم نے زبردستی تمہیں بگاڑ دیا تھا۔''**

اس جواب کے بعد عوام کی جانب سے اب جواب الجواب دیا جا رہا ہے کہ ''تم اس ذمہ داری میں ہم کو برابر کا شریک کہاں ٹھہرائے دے رہے ہو۔کچھ یہ بھی یاد رہے کہ تم نے اپنی چال بازیوں، فریب کاریوں اور جھوٹے پروپیگنڈوں سے کیا طلسم باندھ رکھا تھا،

اور رات دن خلقِ خدا کو پھانسنے کے لئے کیسے کیسے جتن تم کیا کرتے تھے۔ معاملہ صرف اتنا ہی تو نہیں ہے کہ تم نے ہمارے سامنے دنیا پیش کی اور ہم اس پر ریجھ گئے۔ امر واقعہ یہ بھی تو ہے کہ تم شب و روز کی مکاریوں سے ہم کو بے وقوف بناتے تھے اور تم میں سے ہر شکاری روز ایک نیا جال بن کر طرح طرح کی تدبیروں سے اللہ کے بندوں کو اس میں پھانستا تھا۔'' (حاشیہ نمبر ۵۳)

قرآن مجید میں پیشواؤں اور پیروؤں کے اس جھگڑے کا ذکر مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے بار بار آیا ہے۔ تفصیل کے لئے حسبِ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: اعراف آیات ۳۸ و ۳۹، ابراہیم ۲۱، القصص ۶۳، الاحزاب ۶۶ تا ۶۸، المومن ۴۷ و ۴۸، حٰم السجدہ ۲۹''

اس ضمن میں اب اس موضوع کے دوسرے پہلو کی جانب اللہ تعالیٰ نے فرمایا (حاشیہ ۵۴) یہ بات قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر بیان کی گئی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا مقابلہ سب سے پہلے اور سب سے آگے بڑھ کر ان خوشحال طبقوں نے کیا ہے جو دولت و حشمت اور نفوذ و اقتدار کے مالک تھے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: الانعام ۱۲۳، الاعراف ۶۰، ۶۶، ۷۵، ۸۸، ۹۰، ہود: ۲۷، بنی اسرائیل :۱۶، الزخرف ۲۳۔

سورۃ الصافات

قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کی پیروی کرنے والے اور کفار کے درمیان مکالماتی مطالعہ اس قدر اچھوتے اور ادبی انداز کا حامل ہونے کے علاوہ اس قدر مدلل اور پر اثر ہے کہ ایک طالب علم اس کی سحر انگیزی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور پھر یہ بھی اللہ کریم کی حکمت بالغہ ہے کہ اس موضوع میں اس قدر تکرار پائی جاتی ہے، اس میں یہی حکمت ہے کہ اللہ کریم قیامت کے روز، امت مسلمہ کو اس صورتِ حال سے بچانا چاہتے ہیں۔ اب ہم اپنے مطالعۂ قرآن میں سورہ الصافات تک پہنچ چکے ہیں۔ یہ مکی سورت ہونے کے ناطے اس

دور میں نازل ہوئی جب رسولؐ کو دعوت دیتے ایک عرصہ گزر گیا تھا لیکن کفار مکہ پر اس کا کوئی اثر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

ان آیات کی تشریح کیلئے سید مودودی نے حاشیہ جات ۱۴ تا ۱۸ میں جو تفصیل بیان کی ہے اس کے چیدہ چیدہ نکات ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

☆......''ظالم سے مراد صرف وہی لوگ نہیں ہیں جنہوں نے دوسروں پر ظلم کیا ہو بلکہ قرآن کی اصطلاح میں ہر وہ شخص ظالم ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں بغاوت و سرکشی اور نافرمانی کی راہ اختیار کی ہو۔'' (حاشیہ نمبر ۱۴)

☆......''اصل میں لفظ "ازواج" استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد ان کی وہ بیویاں بھی ہو سکتی ہیں جو اس بغاوت میں ان کی رفیق تھیں، اور وہ سب لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو انہی کی طرح باغی و سرکش اور نافرمان تھے۔ علاوہ بریں اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ایک قسم کے مجرم الگ الگ جتھوں کی شکل میں جمع کیے جائیں گے۔'' (حاشیہ نمبر ۱۵)

☆......''اس جگہ معبودوں سے مراد دو قسم کے معبود ہیں۔ ایک وہ انسان اور شیاطین جن کی اپنی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ لوگ خدا کو چھوڑ کر ان کی بندگی کریں۔ دوسرے وہ اصنام اور شجر و حجر وغیرہ جن کی پرستش دنیا میں کی جاتی رہی ہے۔ ان میں سے پہلی قسم کے معبود تو خود مجرمین میں شامل ہوں گے اور انہیں سزا کے طور پر جہنم کا راستہ دکھایا جائے گا اور دوسری قسم کے معبود اپنے پرستاروں کے ساتھ اس لئے جہنم میں ڈالے جائیں گے کہ وہ انہیں دیکھ کر ہر وقت شرمندگی محسوس کریں اور اپنی حماقتوں کا ماتم کرتے رہیں۔ ان کے علاوہ ایک تیسری قسم کے معبود وہ بھی ہیں جنہیں دنیا میں پوجا تو گیا ہے مگر خود ان کا اپنا ایما ہرگز یہ نہ تھا کہ ان کی پرستش کی جائے، بلکہ اس کے برعکس وہ ہمیشہ انسانوں کو غیر اللہ کی پرستش سے منع کرتے رہے، مثلاً فرشتے، انبیاء اور اولیاء۔ اس قسم کے معبود ظاہر ہے کہ ان معبودوں میں شامل نہ ہوں گے جنہیں اپنے پرستاروں کے ساتھ جہنم کی طرف دھکیلا جائے گا۔'' (حاشیہ نمبر ۱۶)

☆......''پہلا فقرہ مجرمین کو خطاب کر کے ارشاد ہوگا۔اور دوسرا فقرہ ان عام حاضرین کی طرف رخ کر کے فرمایا جائے گا جو اس وقت جہنم کی طرف مجرمین کی روانگی کا منظر دیکھ رہے ہوں گے۔ یہ فقرہ خود بتا رہا ہے کہ اس وقت حالت کیا ہوگی۔ بڑے بڑے ہیکڑ مجرمین کے کس بل نکل چکے ہوں گے اور کسی مزاحمت کے بغیر وہ کان دبائے جہنم کی طرف جا رہے ہوں گے۔ کہیں کوئی ہز میجسٹی دھکے کھا رہے ہوں گے اور درباریوں میں سے کوئی "اعلیٰ حضرت" کو بچانے کے لئے آگے نہ بڑھے گا۔ کہیں کوئی فاتح عالم اور کوئی ڈکٹیٹر انتہائی ذلت کے ساتھ چلا جا رہا ہوگا اور اس کا لشکرِ جرار خود اسے سزا کے لئے پیش کر دے گا۔ کہیں کوئی پیر صاحب یا گرو جی یا ہولی فادر واصل بجہنم ہو رہے ہوں گے اور مریدوں میں سے کسی کو یہ فکر نہ ہوگی کہ حضرتِ والا کی توہین نہ ہونے پائے۔ کہیں کوئی لیڈر صاحب کس مپرسی کے عالم میں جہنم کی طرف رواں دواں ہوں گے اور دنیا میں جو لوگ ان کی کبریائی کے جھنڈے اٹھائے پھرتے تھے وہ سب وہاں ان کی طرف سے نگاہیں پھیریں گے۔ حد یہ ہے کہ جو عاشق دنیا میں اپنے معشوق پر جان چھڑکتے تھے انہیں بھی اس کے حالِ بد کی کوئی پروا نہ ہوگی۔ اس حالت کا نقشہ کھینچ کر اللہ تعالیٰ دراصل یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ دنیا میں انسان اور انسان کے جو تعلقات اپنے رب سے بغاوت پر مبنی ہیں وہ کس طرح آخرت میں ٹوٹ کر رہ جائیں گے اور یہاں جو لوگ ہمچو ما دیگرے نیست کے غرور میں مبتلا ہیں وہاں ان کا تکبر کس طرح خاک میں مل جائے گا۔'' (حاشیہ نمبر ۱۷)

''اصل الفاظ ہیں كُنْتُمْ تَأْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ۔ "تم ہمارے پاس یمین کی راہ سے آتے تھے۔" یمین کا لفظ عربی زبان میں متعدد مفہومات کے لئے بولا جاتا ہے۔ اگر اس کو قوت و طاقت کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ہم کمزور تھے اور تم ہم پر غالب تھے۔ اس لئے تم اپنے زور سے ہم کو گمراہی کی طرف کھینچ لے گئے۔ اگر اس کو خیر

اور بھلائی کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ تم نے خیرخواہ بن کر ہمیں دھوکا دیا۔ تم ہمیں یقین دلاتے رہے کہ جس راہ پر تم ہمیں چلا رہے ہو یہی حق اور بھلائی کی راہ ہے۔ اس لئے ہم تمہارے فریب میں آ گئے۔ اور اگر اسے قسم کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے قسمیں کھا کھا کر ہمیں اطمینان دلایا تھا کہ حق وہی ہے جو تم پیش کر رہے ہو۔'' (حاشیہ نمبر ۱۸)

سورہ ص

گذشتہ سورتوں کی طرح سورہ ص میں بھی شرک کی تردید کے ساتھ ساتھ اس مکالماتی انداز کا سلسلہ جاری ہے۔

سورت ص کی آیات نمبر ۵۵ تا ۶۴ میں مذہبی، سیاسی، و دیگر دنیاوی معاملات کے لیڈران اور اہل جہنم (جو ان لوگوں پر مشتمل ہونگے جنہوں نے دنیا میں اپنے لیڈروں / سرداروں / مذہبی راہ نماؤں کی پیروی کی تھی، کے درمیان ایک تلخ اور تند و تیز معاملے کا ذکر ہے جس کے اہم ترین نکات درج ذیل ہیں:

۱۔ سرکشوں کیلئے بدترین ٹھکانہ جہنم ہے، اس میں وہ جھلسے جائیں گے!

۲۔ وہ مزا چکھیں گے کھولتے ہوئے پانی اور پیپ لہو اور اس قسم کی دیگر تلخیوں کا!

۳۔ دنیاوی پیر، سیاسی لیڈر اور دیگر گمراہ گروہ کے لوگ، جب عوام الناس (اپنے پیروؤں) کو جہنم میں گروہ در گروہ آتے دیکھیں گے تو اس پر پریشان ہو کر کہیں گے کہ یہ لشکر تمہارے پاس گھسا چلا آ رہا ہے (گویا انہیں جہنم میں بھی ان کا آنا گوارا نہ ہوگا)۔ ہمیں چاہئے کہ انہیں خوش آمدید نہ کہیں اور انہیں جہنم کی آگ میں جھلسنے کیلئے چھوڑ دیں!

۴۔ دنیا میں ان کے پیرو جب یہ سنیں گے تو جواب دیں گے کہ تم ہی جہنم کی آگ میں جھلسے جا رہے ہو۔ تمہارے لئے بھی کوئی خیر مقدم ہمارے دلوں میں نہیں کیونکہ یہ تم ہی تو ہو جنہوں نے ہمیں اس انجام تک پہنچایا اور وہ اپنے پیروں / فقیروں / سیاسی لیڈروں، دولتمندوں وغیرہ کیلئے عذاب کی دعا کریں گے۔

۵۔ تاہم اس تمام جھگڑے کا کلائمکس اس وقت ہوگا جبکہ وہ آپس میں جھگڑنے کے بعد یہ دیکھیں گے کہ دنیا کی زندگی میں ہم سب (لیڈران اور پیروکار) ان لوگوں کو (جہنم میں) نہیں دیکھ پا رہے جنہیں ہم دنیا میں برا سمجھتے تھے (اہل ایمان)۔ وہ حیران ہوکر ہر طرف دیکھیں گے کہ اس جہنم میں ہم اور ہمارے پیشوا تو موجود ہیں مگر ان لوگوں کا یہاں کہیں پتہ نشان تک نہیں ہے جن کی ہم دنیا میں برائیاں کرتے تھے اور خدا رسول کی باتیں کرنے پر جن کا مذاق ہماری مجلسوں میں اڑایا جاتا تھا (خلاصہ آیات قرآنی سورہ ص اور حاشیہ نمبر ۵۵)—— دوزخ میں ہونے والوں ان جھگڑوں، مکالموں اور تکرار کی مزید تصدیق رب العزت نے یہ کہہ کر فرمادی کہ

اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ﴿٦٤﴾

''یعنی بے شک یہ بات سچی ہے، اہل دوزخ میں یہی کچھ جھگڑے ہونے والے ہیں۔''

سورہ حٰم السجدۃ

سورہ حٰم السجدۃ (۴۱) کی آیت ۲۹ میں گزشتہ آیات/سورتوں میں قیامت کے روز جہنم میں داخلے کے وقت دنیا میں گمراہ کرنے والے لیڈروں، سیاستدانوں، مذہبی راہنماؤں، دانشوروں، ماہرین تعلیم/اساتذہ و دیگر مناصب پر متمکن لوگوں) اور ان کی پیروی کرنے والوں (عوام الناس) کے درمیان جو جھگڑا ہوگا، اس کا اعادہ ان آیات میں یوں کیا گیا:

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿٢٩﴾

''وہاں یہ کافر کہیں گے کہ اے ہمارے رب، ذرا ہمیں دکھادے ان جنوں اور انسانوں کو جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، ہم انہیں پاؤں تلے روند ڈالیں گے تاکہ وہ خوب ذلیل وخوار ہوں۔''

اس سورت کی آیت نمبر ۵۲ کی تشریح حاشیہ نمبر ۷۰ میں یوں کی گئی ہے:

''اس آیت کے دو مفہوم ہیں اور دونوں ہی اکابر مفسرین نے بیان کئے ہیں:

☆......ایک مفہوم یہ ہے کہ عنقریب یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ اس قرآن کی دعوت تمام گرد و پیش کے ممالک پر چھا گئی ہے اور یہ خود اس کے آگے سرنگوں ہیں۔ اس وقت انہیں پتہ چل جائے گا کہ جو کچھ آج ان سے کہا جا رہا ہے اور یہ مان کر نہیں دے رہے ہیں وہ سراسر حق تھا۔ بعض لوگوں نے اس مفہوم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ محض کسی دعوت کا غالب آ جانا اور بڑے بڑے علاقے فتح کر لینا تو اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے، باطل دعوتیں بھی چھا جاتی ہیں اور ان کے پیرو بھی ملک پر ملک فتح کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ایک سطحی اعتراض ہے جو پورے معاملے پر غور کیے بغیر کر دیا گیا ہے۔ نبی ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور میں جو حیرت انگیز فتوحات اسلام کو نصیب ہوئیں وہ محض اس معنی میں اللہ کی نشانیاں نہ تھیں کہ اہلِ ایمان ملک پر ملک فتح کرتے چلے گئے، بلکہ اس معنی میں تھیں کہ یہ فتحِ ممالک دنیا کی دوسری فتوحات کی طرح نہیں تھی جو ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک قوم کو دوسروں کی جان و مال کا مالک بنا دیتی ہیں اور خدا کی زمین ظلم سے بھر جاتی ہے۔ اس کے برعکس یہ فتح اپنے جلو میں ایک عظیم الشان مذہبی، اخلاقی، ذہنی و فکری، تہذیبی و سیاسی اور تمدنی و معاشی انقلاب لے کر آئی تھی جس کے اثرات جہاں جہاں بھی پہنچے، انسان کے بہترین جوہر کھلتے چلے گئے اور بدترین اوصاف دبتے چلے گئے۔ دنیا جن فضائل کو صرف تارک الدنیا درویشوں اور گوشے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے والوں کے اندر ہی دیکھنے کی امید رکھتی تھی اور کبھی یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ کاروبارِ دنیا چلانے والوں میں بھی وہ پائے جا سکتے ہیں، اس انقلاب نے وہ فضائلِ اخلاق فرمانرواؤں کی سیاست میں، انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والوں کی عدالت میں فوجوں کی قیادت کرنے والے سپہ سالاروں کی جنگ اور فتوحات میں، ٹیکس وصول کرنے والوں کی تحصیلداری میں، اور بڑے بڑے کاروبار چلانے والوں کی تجارت میں جلوہ گر کر کے دکھا دیئے۔ اس نے اپنے پیدا کردہ معاشرے

میں عام انسانوں کو اخلاق اور کردار اور طہارت و نظافت کے اعتبار سے اتنا اونچا اٹھایا کہ دوسرے معاشروں کے چیدہ لوگ بھی ان کی سطح سے فروتر نظر آنے لگے۔ اس نے اوہام و خرافات کے چکر سے نکال کر انسان کو علمی تحقیق اور بہتر طرزِ فکر و عمل کی صاف شاہراہ پر ڈال دیا۔ اس نے اجتماعی زندگی کے ان امراض کا علاج کیا جن کے علاج کی فکر تک سے دوسرے نظام خالی تھے، یا اگر انہوں نے اس کی فکر کی بھی تو ان امراض کے علاج میں کامیاب نہ ہو سکے، مثلاً رنگ و نسل اور وطن و زبان کی بنیاد پر انسانوں کی تفریق، ایک ہی معاشرے میں طبقات کی تقسیم اور ان کے درمیان اونچ نیچ کا امتیاز اور چھوت چھات، قانونی حقوق اور عملی معاشرت میں مساوات کا فقدان، عورتوں کی پستی اور بنیادی حقوق تک سے محرومی، جرائم کی کثرت، شراب اور نشہ آور چیزوں کا عام رواج، حکومت کا تنقید و محاسبے سے بالاتر رہنا، عوام کا بنیادی انسانی حقوق تک سے محروم ہونا، بین الاقوامی تعلقات میں معاہدات کی بے احترامی، جنگ میں وحشیانہ حرکات اور ایسے ہی دوسرے امراض۔ سب سے بڑھ کر خود عرب کی سرزمین میں اس انقلاب نے دیکھتے دیکھتے طوائف الملوکی جگہ نظم، خونریزی و بدامنی کی جگہ امن، فسق و فجور کی جگہ تقویٰ و طہارت، ظلم و بے انصافی کی جگہ عدل، گندگی و ناشائستگی کی جگہ پاکیزگی اور تہذیب، جہالت کی جگہ علم اور نسل در نسل چلنے والی عداوتوں کی جگہ اخوت و محبت پیدا کر دی اور جس قوم کے لوگ اپنے قبیلے کی سرداری سے بڑھ کر کسی چیز کا خواب تک نہ دیکھ سکتے تھے انہیں **دنیا کا امام** بنا دیا۔ یہ تھیں وہ نشانیاں جو اسی نسل نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں جسے مخاطب کر کے نبی ﷺ نے پہلی مرتبہ یہ آیت سنائی تھی۔ اور اس کے بعد سے آج تک اللہ تعالیٰ ان نشانیوں کو برابر دکھائے جا رہا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے زوال کے دور میں بھی اخلاق کی جس بلندی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی گرد کو بھی وہ لوگ کبھی نہ پہنچ سکے جو تہذیب و شائستگی کے علمبردار بنے پھرتے ہیں۔ یورپ کی قوموں نے افریقہ، امریکہ، ایشیا اور خود یورپ میں مغلوب قوموں کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا ہے، مسلمانوں کی تاریخ کے کسی دور میں بھی اس کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی۔ یہ

قرآن ہی کی برکت ہے جس نے مسلمانوں میں اتنی انسانیت پیدا کر دی ہے کہ وہ کبھی غلبہ پاکر اتنے ظالم نہ بن سکے جتنے غیر مسلم تاریخ کے ہر دور میں ظالم پائے گئے ہیں اور آج تک پائے جا رہے ہیں۔ کوئی آنکھیں رکھتا ہو تو خود دیکھ لے کہ اسپین میں جب مسلمان صدیوں حکمراں رہے اس وقت عیسائیوں کے ساتھ ان کا کیا سلوک تھا اور جب عیسائی وہاں غالب آئے تو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ◆ ہندوستان میں آٹھ سو برس کے طویل زمانۂ حکومت میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا اور اب ہندو غالب آ جانے کے بعد ان کے ساتھ کیا برتاؤ کر رہے ہیں۔ یہودیوں کے ساتھ پچھلے تیرہ سو برس میں مسلمانوں کا رویہ کیا رہا اور اب فلسطین میں مسلمانوں کے ساتھ ان کا کیا رویہ ہے۔''

☆ ......''اس آیت کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آفاق ارض وسماء میں بھی اور انسانوں کے اپنے وجود میں بھی لوگوں کو وہ نشانیاں دکھائے گا جن سے ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن جو تعلیم دے رہا ہے وہی برحق ہے۔ بعض لوگوں نے اس مفہوم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ آفاقِ ارض وسماء اور خود اپنے وجود کو تو لوگ اس وقت بھی دیکھ رہے تھے۔ پھر زمانۂ مستقبل میں ان چیزوں کے اندر نشانیاں دکھانے کے کیا معنی۔ لیکن یہ اعتراض بھی ویسا ہی سطحی ہے جیسا اوپر کے مفہوم پر اعتراض سطحی تھا۔ آفاقِ ارض وسماء تو بے شک وہی ہیں جنہیں انسان ہمیشہ سے دیکھتا رہا ہے اور انسان کو اپنا وجود بھی اسی طرح کا ہے جیسا ہر زمانے میں دیکھا جاتا رہا ہے مگر ان چیزوں کے اندر خدا کی نشانیاں اس قدر بے شمار ہیں کہ انسان کبھی ان کا احاطہ نہیں کر سکا ہے، نہ کبھی کر سکے گا۔ ہر دور میں انسان کے سامنے نئی نئی نشانیاں آتی چلی گئی ہیں اور قیامت تک آتی چلی جائیں گی۔'' (حاشیہ ۷۰)

سورہ الزخرف

قرآن حکیم کے مطالعاتی سفر میں سورہ الزخرف سے پتہ چلتا ہے کہ من جملہ کفار مکہ

◆ دیکھئے ڈاکٹر محمد احسن کی کتاب (۲۰۱۰)

کے مختلف اعتراضات کے جواب میں واضح کیا گیا کہ

ہر بستی میں بھیجے جانے والے نذیر کو بھی اس بستی کے کھاتے پیتے (مترفین۔ دولت مند، مذہبی معلمین) سے یہ سوال کیا کہ کیا تم اسی ڈگر پر چلے جاؤ گے خواہ اس سے بہتر طریقہ بھی بتایا جائے (مفہوم آیت ۲۳)۔ ان امور کی وضاحت حاشیہ نمبر ۲۳ میں سید مودودیؒ نے یوں کی:

''یہ بات قابلِ غور ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مقابلے میں اٹھ کر باپ دادا کی تقلید کا جھنڈا بلند کرنے والے ہر زمانے میں اپنی قوم کے کھاتے پیتے لوگ ہی کیوں رہے ہیں؟ آخر کیا وجہ ہے کہ وہی حق کی مخالفت میں پیش پیش اور قائم شدہ جاہلیت کو برقرار رکھنے کی کوشش میں سرگرم رہے اور وہی عوام کو بہکا اور بھڑکا کر انبیاء علیہم السلام کے خلاف فتنے اٹھاتے رہے؟ اس کی بنیادی وجوہ دو تھیں۔ ایک یہ کہ کھاتے پیتے اور خوشحال طبقے اپنی دنیا بنانے اور اس سے لطف اندوز ہونے میں اس قدر منہمک ہوتے ہیں کہ حق اور باطل کی بزعم خویش، دوراز کار بحث میں سر کھپانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ان کی تن آسانی اور ذہنی کاہلی انہیں دین کے معاملے میں انتہائی بےفکر اور اس کے ساتھ عملاً قدامت پسند (CONSERVATIVE) بنا دیتی ہے تا کہ جو حالت پہلے سے قائم چلی آ رہی ہے وہی، قطع نظر اس سے کہ وہ حق ہے یا باطل، جوں کی توں قائم رہے اور کسی نئے نظام کے متعلق سوچنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ دوسرے یہ کہ قائم شدہ نظام سے ان کے مفاد پوری طرح وابستہ ہو چکے ہوتے ہیں **اور انبیاء علیہم السلام کے پیش کردہ نظام کو دیکھ کر پہلی ہی نظر میں بھانپ جاتے ہیں کہ یہ آئے گا تو ان کی چودھراہٹ کی بساط بھی لپیٹ کر رکھ دی جائے گی اور ان کے لئے اکل حرام اور فعل حرام کی بھی کوئی آزادی باقی نہ رہے گی** (مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول سورہ انعام حاشیہ ۹۱، جلد دوم الاعراف حاشیہ ۴۶، ۵۳، ۶۰، ۷۴، ۸۸، ۹۲۔ سورہ ہود حواشی ۳۱، ۳۲، ۴۱۔ بنی اسرائیل حاشیہ ۱۸ المؤمنون حواشی ۲۶، ۲۷، ۳۵، ۵۹۔ سورہ سبا آیت ۳۴ حاشیہ ۵۲)''

آیت ۲۶ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعے کے تسلسل میں کفار مکہ کو شرم دلانے کیلئے جو فرمایا گیا اس کی توضیح میں حاشیہ نمبر ۲۷ میں لکھا کہ ان تمام مسلم عوام اور اکابرین کیلئے غور وفکر کی بہت سی راہیں واضح کرتی ہیں کہ ہم بھی اپنے آباء واجداد کی غلط رسم و رواج کی پیروی میں ان لوگوں سے کسی قدم بھی پیچھے نہیں بلکہ صدیوں ہندوؤں کے ساتھ رہنے اور دوصدیوں نیز آج بھی مغربی تعلیم وتہذیب سے متاثر ہونے کی وجہ سے ہر دو قوموں کے نقشِ قدم پر چلنے اور تقلید سنت ابراہیمؑ کے خلاف جانے میں کوئی شرم وحیا محسوس نہیں کرتے۔

آیت نمبر ۳۰ میں کفار مکہ کے اس استدلال کہ نبوت، مکہ اور طائف کے کسی بڑے سردار کو کیوں نہ دی گئی کی وضاحت حاشیہ نمبر ۳۰ اور نمبر ۳۱ میں یوں کی گئی ہے۔

۳۰۔''دونوں شہروں سے مراد مکہ اور طائف ہیں۔ کفار کا یہ کہنا تھا کہ اگر واقعہ خدا کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا اور وہ اس پر اپنی کتاب نازل کرنے کا ارادہ کرتا تو ہمارے ان مرکزی شہروں میں سے کسی بڑے آدمی کو اس غرض کے لئے منتخب کرتا۔ رسول بنانے کے لئے اللہ میاں کو ملا بھی تو وہ شخص جو یتیم پیدا ہوا جس کے حصے میں کوئی میراث نہ آئی، جس نے بکریاں چرا کر جوانی گزار دی، جواب گزر اوقات بھی کرتا ہے تو بیوی کے مال سے تجارت کر کے، اور جو کسی قبیلے کا شیخ یا کسی خانوادے کا سربراہ نہیں ہے۔ کیا مکہ میں ولید بن مغیرہ اور عتبہ بن ربیعہ جیسے نامی گرامی سردار موجود نہ تھے؟ کیا طائف میں عروہ بن مسعود، حبیب بن عمرو، کنانہ بن عبد عمرو اور ابن عبد یالیل جیسے رئیس موجود نہ تھے؟ یہ تھا ان لوگوں کا استدلال، پہلے تو وہ یہی ماننے کے لئے تیار نہ تھے کہ کوئی بشر بھی رسول ہوسکتا ہے۔ مگر جب قرآن مجید میں پے در پے دلائل دے کر ان کے اس خیال کا پوری طرح ابطال کر دیا گیا، اور ان سے کہا گیا کہ اس سے پہلے ہمیشہ بشر ہی رسول ہو کر آتے رہے ہین، اور انسانوں کی ہدایت کے لئے بشر ہی رسول ہوسکتا ہے نہ کہ غیر بشر، اور جو رسول بھی دنیا میں میں آئے ہیں وہ یکا یک آسمان سے نہیں اتر آئے تھے بلکہ انہی انسانی بستیوں میں پیدا ہوئے تھے، بازاروں

میں چلتے پھرتے تھے، بال بچوں والے تھے اور کھانے پینے سے مبرا نہ تھے (ملاحظہ ہو النحل، آیت ۴۳، بنی اسرائیل، ۹۴، ۹۵۔ یوسف ۱۰۹، الفرقان ۷، ۲۰، الانبیاء ۷، ۸، الرعد ۳۸) تو انہوں نے یہ دوسرا پینترا بدلا کہ اچھا، بشر ہی رسول سہی، مگر وہ کوئی بڑا آدمی ہونا چاہئے۔ مالدار ہو، بااثر ہو، بڑے جتھے والا ہو، لوگوں میں اس کی شخصیت کی دھاک بیٹھی ہوئی ہو۔ محمد بن عبداللہ (ﷺ) اس مرتبے کے لئے کیسے موزوں ہو سکتے ہیں؟''

حاشیہ نمبر ۳۱ میں ان کے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے جس کے اندر چند مختصر الفاظ میں بہت سی اہم باتیں ارشاد ہوئی ہیں:

☆......پہلی بات یہ کہ تیرے رب کی رحمت تقسیم کرنا ان کے سپرد کب سے ہو گیا؟ کیا یہ طے کرنا ان کا کام ہے کہ اللہ اپنی رحمت سے کس کو نوازے اور کس کو نہ نوازے؟

☆......دوسری بات یہ کہ نبوت تو خیر بہت بڑی چیز ہے، دنیا میں زندگی بسر کرنے کے جو عام ذرائع ہیں، ان کی تقسیم بھی ہم نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہے، کسی اور کے حوالے نہیں کر دی۔ ہم کسی کو حسین اور کسی کو بدصورت، کسی کو خوش آواز اور کسی کو بدآواز، کسی کو قوی ہیکل اور کسی کو کمزور، کسی کو ذہین اور کسی کو کند ذہن، کسی کو قوی الحافظہ اور کسی کو نسیان میں مبتلا، کسی کو سلیم الاعضاء اور کسی کو اپاہج یا اندھا یا گونگا بہرا، کسی کو امیر زادہ اور کسی کو فقیر زادہ، کسی کو ترقی یافتہ قوم کا فرد اور کسی کو غلام یا پس ماندہ قوم کا فرد پیدا کرتے ہیں۔ اس پیدائشی قسمت میں کوئی ذرہ برابر بھی دخل نہیں دے سکتا۔ جس کو جو کچھ ہم نے بنا دیا ہے وہی کچھ بننے پر وہ مجبور ہے۔ اور ان مختلف پیدائشی حالتوں کا جو اثر بھی کسی کی تقدیر پر پڑتا ہے اسے بدل دینا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ پھر انسانوں کے درمیان رزق، طاقت، عزت، شہرت، دولت، حکومت وغیرہ کی تقسیم بھی ہم ہی کر رہے ہیں۔ جس کو ہماری طرف سے اقبال نصیب ہے اسے کوئی گرا نہیں سکتا اور جس پر ہماری طرف سے ادبار آ جاتا ہے اسے گرنے سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ ہمارے فیصلوں کے مقابلے میں انسانوں کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ اس عالمگیر خدائی انتظام میں یہ لوگ کہاں فیصلہ کرنے چلے ہیں کہ کائنات کا

مالک کسے اپنا نبی بنائے اور کسے نہ بنائے۔''

☆......تیسری بات یہ کہ اس خدائی انتظام میں یہ مستقل قاعدہ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ سب کچھ ایک ہی کو، یا سب کچھ سب کو نہ دے دیا جائے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو۔ ہر طرف تمہیں بندوں کے درمیان ہر پہلو میں تفاوت ہی تفاوت نظر آئے گا۔ کسی کو ہم نے کوئی چیز دی ہے تو دوسری کسی چیز سے اس کو محروم کر دیا ہے، اور وہ کسی اور کو عطا کر دی ہے، یہ اس حکمت کی بنا پر کیا گیا ہے کہ کوئی انسان دوسروں سے بے نیاز نہ ہو، بلکہ ہر ایک کسی نہ کسی معاملہ میں دوسرے کا محتاج رہے۔ اب یہ کیسا احمقانہ خیال تمہارے دماغ میں سمایا ہے کہ جسے ہم نے ریاست اور وجاہت دی ہے اسی کو نبوت بھی دے دی جائے؟ کیا اسی طرح تم یہ بھی کہو گے کہ عقل، علم، دولت، حسن، طاقت، اقتدار اور دوسرے تمام کمالات ایک ہی میں جمع کر دئے جائیں اور جس کو ایک چیز نہیں ملی ہے اسے دوسری بھی کوئی چیز نہ دی جائے؟

اس تسلسل میں مزید وضاحت کی کہ

یہاں رب کی رحمت سے مراد اس کی رحمتِ خاص یعنی نبوت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے جن رئیسوں کو ان کی دولت و وجاہت اور مشیخت کی وجہ سے بڑی چیز سمجھ رہے ہو، وہ اس دولت کے قابل نہیں ہیں جو محمد ابن عبد اللہ (ﷺ) کو دی گئی ہے۔ یہ دولت اس دولت سے بدرجہا زیادہ اعلیٰ درجے کی ہے اور اس کے لئے موزونیت کا معیار کچھ اور ہے۔ تم نے اگر یہ سمجھ رکھا ہے کہ تمہارا ہر چودھری اور سیٹھ نبی بننے کا اہل ہے تو یہ تمہارے اپنے ہی ذہن کی پستی ہے۔ اللہ سے اس نادانی کی توقع کیوں رکھتے ہو؟ (حاشیہ نمبر ۳۲)

سورہ التغابن:

قرآن کے اس علمی سفر کی داستان اب سورۃ التغابن کی آیت نمبر ۹ تک پہنچ گئی ہے۔ اس میں لفظ "التغابن" کی تشریح بہت تفصیل کے ساتھ حاشیہ نمبر ۲۰ میں کی گئی ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

"ایک اور صورت تغابن کی یہ بھی ہے کہ دنیا میں لوگ کفر و فسق اور ظلم و عصیاں پر

بڑے اطمینان سے آپس میں تعاون کرتے رہتے ہیں اور یہ اعتماد رکھتے ہیں کہ ہمارے درمیان بڑی گہری محبت اور دوستی ہے۔ بدکردار خاندانوں کے افراد، ضلالت پھیلانے والے پیشوا اور ان کے پیرو، چوروں اور ڈاکوؤں کے جتھے، رشوت خور اور ظالم افسروں اور ملازمین کے گٹھ جوڑ، بے ایمان تاجر و صنعت کاروں اور زمینداروں کے گروہ، گمراہی اور شرارت وخباثت برپا کرنے والی پارٹیاں اور بڑے پیمانے پر ساری دنیا میں ظلم وفساد کی علمبردار حکومتیں اور قومیں، سب کا باہمی ساز باز اسی اعتماد پر قائم ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ تعلق رکھنے والے افراد اس گمان میں ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے بڑے اچھے رفیق ہیں اور ہمارے درمیان بڑا کامیاب تعاون چل رہا ہے۔ مگر جب یہ لوگ آخرت میں پہنچیں گے تو یکا یک یہ بات کھلے گی کہ ہم سب نے بہت بڑا دھوکا کھایا ہے۔ ہر ایک یہ محسوس کرے گا کہ جسے میں اپنا بہترین بھائی، بیوی، شوہر، اولاد، دوست، رفیق، لیڈر، پیر، مرید، یا حامی و مددگار سمجھ رہا تھا وہ دراصل میرا بدترین دشمن تھا۔ ہر رشتہ داری اور دوستی اور عقیدت ومحبت، عداوت میں تبدیل ہو جائے گی۔ سب ایک دوسرے کو گالیاں دیں گے، ایک دوسرے پر لعنت کریں گے، اور ہر ایک یہ چاہے گا کہ اپنے جرائم کی زیادہ سے زیادہ ذمہ داری دوسرے پر ڈال کر اسے سخت سے سخت سزا دلوائے۔ یہ مضمون بھی قرآن میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے جس کی چند مثالیں حسب ذیل آیات میں دیکھی جاسکتی ہیں: البقرہ ۱۶۷، الاعراف ۳۷ تا ۳۹، ابراہیم ۲۱ تا ۲۲، المؤمنون ۱۰۱، العنکبوت ۱۲، ۱۳، ۲۵، لقمان ۳۳، الاحزاب ۶۷۔ ۶۸، سبا ۳۱ تا ۳۳، فاطر ۱۸، الصفت ۲۷ تا ۳۳، ص ۵۹ تا ۶۱، حٰم السجدہ ۲۹، الزخرف ۶۷، الدخان ۴۱، المعارج ۱۰ تا ۱۴، عبس ۳۴ تا ۳۷)

سورہ القلم:

اپنے مطالعہ کے سفر میں اب ہم سورۃ القلم تک آن پہنچے ہیں۔ آیت نمبر ۱۰ میں درج ذیل چند اخلاقی عیوب کے حامل شخص کی کیفیت بیان کی گئی ہے اور بالآخر انکار قیامت کرنے پر ایسے تمام انسانوں کو بتا دیا گیا ہے کہ

"عنقریب ہم اس کی سونڈ پر داغ لگائیں گے۔"

۱۔ وہ شخص بہت قسمیں کھانے والا ہوتا ہے۔ ۲۔ بے وقعت آدمی ہے۔
۳۔ طعنے دیتا ہے۔ ۴۔ چغلیاں کھاتا پھرتا ہے۔
۵۔ بھلائی سے روکتا ہے۔ ۶۔ ظلم وزیادتی میں حد سے گزرنے والا
۷۔ سخت بداعمال ہے۔ ۸۔ جفار کار ہے۔
۹۔ ان سب عیوب کے ساتھ بداصل ہے اور ۱۰۔ بہت مال واولاد رکھنے والا ہے۔

درج بالا غیر اخلاقی اعمال کی تشریح وتوضیح حاشیہ جات نمبر ۶ تا ۹ میں کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ چند (اور دیگر اسی قسم کی صفات) جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں، وہ قرآن کے اعجاز بیان کا ایک بہت ہی اچھوتا اور نادر نمونہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں امت مسلمہ کو آگاہ فرمادیا اس قسم کی صفات اور رویہ رکھنے سے۔ ایمانداری کے ساتھ اگر آج کوئی انفرادی طور پر اپنا ذاتی محاسبہ کرے یا اجتماعی سطح پر مسلم معاشرے کا جائزہ لے تو کیا یہ امر واقعی نہیں کہ ان صفات کی حامل شخصیات آپ کو زندگی کے ہر شعبے میں اصحابِ علم وفضل میں نظر آتی ہیں اور بدقسمتی سے جو جس قدر پڑھا لکھا (دنیاوی تعلیم اور منصب کے لحاظ سے)، نیز سیاست، حکومت، سول اور فوجی، بیوروکریٹ، وکلاء، پروفیسر صاحبان، مولوی، پیر، فقیہہ اور اہل قلم اور متمول ترین لوگ، ان تمام یا چند "صفاتِ عالیہ" کے حامل نظر آتے ہین۔ سوال یہ ہے کہ چونکہ یہ تمام کردار، بنی اسرائیل میں موجود تھے اور مکہ کی عرب سوسائٹی میں بھی پائے جاتے تھے اور احتمال یہی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے علمِ غیب سے امتِ محمد یہ میں بھی قیامت تک پیش آنے تھے، اس لئے ان کی نشان دہی، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نازل فرمادی لیکن کیا مجال ہے طبقہ علیا اور منبر ومحراب سے تعلق رکھنے والے پیرانِ عظام، واعظانِ خوش بیان اور عالمانِ دین کا جو کبھی انہوں نے معاشرے میں پائے جانے والے ان تمام صفات کے حامل کرداروں کا ذکر کیا ہو؟ ریڈیو، ٹی وی اور دیگر پرنٹ والیکٹرانک میڈیا سے نمعلوم کن کن کرداروں کو نمایاں کر کے اس ملک میں بے حیائی، عریانیت، تشدد

اور جنسی محرمات کو فروغ دینے کی ہمہ وقت کوششوں کے مقابلہ میں اول تو کہیں سے درج بالا صفات اور کرداروں کی نشان دہی نہیں کی جاتی اور اگر کہیں سے کوئی بندۂ خدا اس جانب توجہ دلا دے تو اس پر سیاست کی پھبتی لگا کر فرعون، ہامان اور نمرود کے ان دیرینہ دلائل کا سہارا لیا جاتا ہے کہ دیکھنا وطنِ عزیز کا تمام تر نظام تو ہمارے دم قدم سے ہی قائم ہے، اس پر تنقید کرنے والے یا ریاست مدینہ کی بات کرنے والے تو گویا قابلِ گردن زدنی ہیں۔حقِ حکمرانی تو گویا ہمارے خاندانوں اور فرقوں (مذہبی، لادینی) کا جدی اور پشتی حق ہے!

ذیل میں سید مودودی کی تفہیم (جلد ششم) سے درج بالا چند اقتباسات کی تفصیل قارئین کے غور وفکر کیلئے بطور آئینہ پیش کئے جارہے ہیں! (حاشیہ جات ۶ تا ۱۱)

☆......"ان آیات میں لفظ "مھین" استعمال ہوا ہے جو حقیر و ذلیل اور گھٹیا آدمی کیلئے بولا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ بہت قسمیں کھانے والے آدمی کی لازمی صفت ہے۔ وہ بات بات پر اس لئے قسم کھاتا ہے کہ اسے خود یہ احساس ہوتا ہے کہ لوگ اسے جھوٹا سمجھتے ہیں اور اس کی بات پر اس وقت تک یقین نہیں کریں گے جب تک وہ قسم نہ کھائے۔ اس بنا پر وہ اپنی نگاہ میں خود بھی ذلیل ہوتا ہے اور معاشرے میں بھی اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔" (حاشیہ ۶)

☆......اس طرح "مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ" الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔خیر عربی زبان میں مال کو بھی کہتے ہیں اور بھلائی کو بھی۔ اگر اس کو مال کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ سخت بخیل اور کنجوس آدمی ہے، کسی کو پھوٹی کوڑی دینے کا بھی روادار نہیں اور اگر خیر کو نیکی اور بھلائی کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ہر نیک کام میں رکاوٹ ڈالتا ہے اور یہ بھی کہ وہ اسلام سے لوگوں کو روکنے میں بہت سرگرم ہے۔" (حاشیہ ۷)

☆......"اصل میں لفظ عُتُلّ استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں ایسے شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو خوب ہٹا کٹا اور بہت کھانے پینے والا ہو، اور اس کے ساتھ نہایت بدخلق، جھگڑالو اور سفاک ہو۔" (حاشیہ ۸)

☆......اصل میں لفظ زَنِیْمٌ استعمال ہوا ہے۔کلامِ عرب میں یہ لفظ اس ولد الزنا کے لئے بولا جاتا ہے جو دراصل ایک خاندان کا فرد نہ ہو مگر اس میں شامل ہو گیا ہو۔سعید بن جبیر اور شعبی کہتے ہیں کہ یہ لفظ اس شخص کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو لوگوں میں اپنے شر کی وجہ سے معروف و مشہور ہو۔'' (حاشیہ ۹)

''اسی ضمن میں مزید تشریح کی کہ ان آیات میں جس شخص کے یہ اوصاف بیان کئے گئے ہیں اس کے بارے میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔کسی نے کہا ہے کہ یہ شخص ولید بن مغیرہ تھا۔کسی نے اسود بن عبد یغوث کا نام لیا ہے۔کسی نے اخنس بن شریق کو اس کا مصداق ٹھہرایا ہے۔اور بعض لوگوں نے کچھ دوسرے اشخاص کی نشاندہی کی ہے۔لیکن قرآن مجید میں نام لیے بغیر صرف اس کے اوصاف بیان کر دئے گئے ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں وہ اپنے ان اوصاف کے لئے اتنا مشہور تھا کہ اس کا نام لینے کی ضرورت نہ تھی۔اس کی یہ صفات سنتے ہی ہر شخص سمجھ سکتا تھا کہ اشارہ کس کی طرف ہے۔'' (حاشیہ نمبر ۹)

اسی تسلسل میں مزید لکھا کہ ''اس فقرے کا تعلق اوپر کے سلسلۂ کلام سے بھی ہو سکتا ہے اور بعد کے فقرے سے بھی۔پہلی صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ ایسے آدمی کی دھونس اس بنا پر قبول نہ کرو کہ وہ بہت مال اولاد رکھتا ہے۔دوسری صورت میں معنی یہ ہونگے کہ بہت مال و دولت ہونے کی بناء پر وہ مغرور ہو گیا ہے جب ہماری آیات اس کو سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ اگلے وقتوں کے افسانے ہیں۔" (حاشیہ ۱۰)

"چونکہ وہ اپنے آپ کو بڑی ناک والا سمجھتا ہے اس لئے اس کی ناک کو سونڈ کہا گیا ہے۔اور ناک پر داغ لگانے سے مراد تذلیل ہے یعنی ہم دنیا اور آخرت میں اس کو ایسا ذلیل و خوار کریں گے کہ ابد تک یہ عار اس کا پیچھا نہ چھوڑے گا۔" (حاشیہ ۱۱)

سورہ مزمل

سورہ مزمل میں بھی خوشحال اور مترفین طبقے کے بارے میں ان کی ریشہ دوانیوں پر تنقید کو جاری رکھتے ہوئے آیت نمبر ۱۱ میں اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو یہ تسلی دی کہ

"ان جھٹلانے والے خوشحال لوگوں سے نمٹنے کا کام تم مجھ پر چھوڑ دو اور انہیں ذرا کچھ دیر اسی حالت پر رہنے دو، ہمارے پاس ان کیلئے بھاری بیڑیاں ہیں۔"

سید مودودیؒ نے اس آیت کی تشریح حاشیہ نمبر ۱۲ میں یوں کی "ان الفاظ میں صاف اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ مکہ میں دراصل جو لوگ رسول اللہ ﷺ کو جھٹلا رہے تھے اور طرح طرح کے فریب دے کر اور تعصّبات ابھار کر عوام کو آپ کی مخالفت پر آمادہ کر رہے تھے، وہ قوم کے کھاتے پیتے، پیٹ بھرے، خوشحال لوگ تھے کیونکہ انہی کے مفاد پر اسلام کی دعوتِ اصلاح کی زد پڑ رہی تھی۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ معاملہ صرف رسول اللہ ﷺ ہی کے ساتھ خاص نہ تھا بلکہ ہمیشہ یہی گروہ اصلاح کی راہ روکنے کیلئے سنگِ گراں بن کر کھڑا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو الاعراف ۶۰، ۶۶، ۷۵، ۸۸، المؤمنون ۳۳، سبا ۳۴ تا ۳۵، الزخرف ۲۳

گزشتہ ۷۰ سالوں میں پاکستان مین بسنے والی امتِ مسلمہ، نام نہاد ملا، سیاستدان اور بیوروکریسی کے گٹھ جوڑ کا جس انداز میں نشانہ بنی رہی ہے اور جن کی بدولت آج وطنِ عزیز دیوالیہ پن (اخلاقی، دینی، تعلیمی، معاشی اور سیاسی) سے نبرد آزما ہو رہا ہے وہ قرآنی حکمت و دانائی کا ایک شاہکار ہیں کہ جب بھی کوئی قوم اللہ اور رسول ﷺ سے بغاوت کا رویہ اختیار کرتی ہے اور قوم کے ناکارہ ترین، کرپٹ عناصر کو اپنی باگ ڈور سنبھالنے کا موقع دیتی ہے تو پھر اس پر "معیشتِ زندگی دوبھر کر دی جاتی ہے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾ (طٰہٰ ۱۲۴)

سورہ المدثر

سورۃ المدثر کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اس میں اللہ رب العزت کو مقصود اپنے رسول کے ذریعے نہ صرف کفارِ مکہ کو تنبیہہ کرنا اور دعوت دین پہنچانا تھا بلکہ زمان و مکان کی حدود و قیود سے ماوراء، قیامت تک کے آنے والے انسانوں کو وہ چند کردار دکھانے بھی مقصود تھے

جو انسانی معاشرے میں ہمیشہ پائے جاتے ہیں۔ اس قسم کے ایک کردار کو اس سورت کی چند آیات میں بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تاہم ذیل کی عبارت سورۃ کے ابتدائی تعارف سے اخذ کی گئی ہے۔

''مکہ میں دعوت دین کے آغاز پر جب رسول اللہ ﷺ نے پے در پے نازل ہونے والی سورتیں لوگوں کو سنانی شروع کیں تو مکہ میں ایک کھلبلی مچ گئی اور مخالفتوں کا ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ حج کے زمانے پر حجاج نے تمام عرب سے اس مقصد کیلئے آنا تھا۔ کفار کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اگر محمد ﷺ نے انہیں قرآن جیسا بے نظیر اور مؤثر کلام سنانا شروع کیا تو عرب کے ہر گوشے تک اسلام کی دعوت پہنچ جائے گی۔ اس لئے کفار مکہ نے ایک کانفرنس منعقد کی تا کہ کوئی متفقہ لائحہ عمل طے کریں۔ لوگوں نے مختلف آراء پیش کیں۔ کسی نے کہا کہ آپ کاہن ہیں، کسی نے کہا آپ کو مجنون کہا جائے۔ اور کسی نے کہا کہ آپ کو شاعر کہا جائے۔ ان تمام آراء کو ولید بن مغیرہ نے ایک ایک کر کے رد کر دیا۔ اس نے کہا کہ ان باتوں میں سے جو بات بھی تم کرو گے لوگ اس کو ناروا الزام سمجھیں گے۔'' مزید کہا'' خدا کی قسم اس کلام میں بڑی حلاوت ہے اور اس کی جڑ بڑی گہری اور اس کی ڈالیاں بہت ثمر دار ہیں۔'' اس پر ابوجہل ولید کے سر ہو گیا اور اس نے کہا کہ تمہاری قوم (سرداران مکہ) تم سے راضی نہ ہو گی جب تک تم محمد ﷺ کے بارے میں کوئی بات نہ کرو۔ ولید سوچ کر بولا کہ تم عرب کے لوگوں سے کہو یہ شخص جادوگر ہے۔ یہ جو کلام پیش کر رہا ہے اس سے ایک آدمی کو اس کے باپ بھائی، بیوی بچوں اور سارے خاندان سے جدا کر دیتا ہے۔ اس تجویز کو سب نے قبول کیا اور یوں حج کے دوران تمام عرب میں حضور ﷺ کی نبوت کو متعارف کرا دیا۔'' (تعارف سورہ کا مختصر بیان)

''آیت نمبر ۱۱ سے ۲۶ تک ولید بن مغیرہ کا نام لئے بغیر یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو کیا کچھ نعمتیں دی تھیں اور ان کا جواب اس نے کس حق دشمنی کے ساتھ دیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس کی ذہنی کشمکش کی پوری تصویر کھینچ دی گئی ہے کہ ایک طرف دل میں

محمد ﷺ اور قرآن کی عظمت کا قائل ہو چکا تھا مگر دوسری طرف اپنی قوم میں اپنی ریاست ووجاہت کو بھی خطرے میں نہ ڈالنا چاہتا تھا، اس لئے نہ صرف یہ کہ وہ ایمان لانے سے باز رہا بلکہ کافی دیر تک اپنے ضمیر سے لڑنے جھگڑنے کے بعد آخرکار یہ بات بنا کر لایا کہ خلقِ خدا کو اس کلام پر ایمان لانے سے باز رکھنے کیلئے اسے جاروقرار دینا چاہئے۔ ان آیات میں نہ صرف اس کی صریح بد باطنی کو بے نقاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اپنے اس کرتوت کے بعد بھی یہ شخص چاہتا ہے کہ اسے مزید انعامات سے نوازا جائے حالانکہ اب یہ انعام کا نہیں بلکہ دوزخ کا سزاوار ہو چکا ہے۔" (ابتدائی تعارف سورہ)

اس پس منظر میں ان آیات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ دور کے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس قسم کے کرداروں کا وجود عنقا ہی نہیں بلکہ اس قدر فراواں ہو چکا ہے کہ شاید گزشتہ ۱۴ صدیوں کی مسلم تاریخ میں اس کی کوئی مثال بھی نہ مل سکے۔ آیئے اس پہلو سے ہم ولید بن مغیرہ جیسے کرداروں کا جائزہ سوسائٹی کے چند مختلف طبقات کے بارے میں کلام اقبال کی روشنی میں کرتے ہیں۔

الف۔دینی راہنما:

موجودہ مسلم سوسائٹی کی تعمیر وترقی میں دین کی راہ نمائی کو جو اولیت حاصل ہونی چاہیے وہ محتاج بیان نہیں۔ ایک دانشور کے اس قول سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں دین اسلام نے مسلمانوں کی حفاظت کی ہے نہ کہ مسلمانوں نے اسلام کی۔ اس حقیقت کے پیش نظر علامہ اقبال نے پنجاب کے پیرزادوں سے جس انداز میں خطاب کیا ہے، اس میں اس طبقے کا چہرہ درج بالا قرآنی آیات کی روشنی میں بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ نظم اقبال نے شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی ۱۵۶۳ء تا ۱۶۲۴ء) کے مزار پر حاضری کے موقعہ پر کہی تھی اس نظم میں اقبال اس دور کا نقشہ کھینچ رہے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی قبر پر
وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمئ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو
آنکھیں میری بینا ہیں و لیکن نہیں بیدار
آئی یہ صدا سلسلۂ فقر ہوا بند
ہیں اہل نظر کشور پنجاب سے بیزار
عارف کا ٹھکانہ نہیں وہ خطہ کہ جس میں
پیدا کلۂ فقر سے ہے طرۂ و دستار
باقی کلۂ فقر سے تھا ولولۂ حق
طروں نے چڑھایا ''نشۂ خدمت سرکار!''

یاد رہے کہ موجودہ پاکستان میں پیر صاحبان کے تمام خانوادوں (الا ماشاء اللہ) کی اولاد ''خدمت سرکار کے نشہ'' میں دھت جس طریق پر خدمات سرانجام دیتی رہی ہے، وہ صاحبان علم ونظر سے مخفی نہیں۔ سندھ کے سید ہوں یا ملتان کے گدی نشین، پختونخوا کے پٹھان ہوں یا لاہور کے باسی سب زبان حال سے میر کے اس شعر کے عین مصداق ہیں!

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے!

اسی طرح ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں شیطان نے اپنے مریدوں کو جو ایجنڈا دیا، دیکھئے اس میں شیطان نے وثوق سے کہا کہ اگرچہ یہ امت حامل قرآن نہیں رہی لیکن مجھے

عصرِ حاضر کے تقاضوں سے یہ خوف ہے کہ ان پر شرعِ پیغمبر ﷺ آشکارہ نہ ہوجائے۔ پھر اس نے آئین پیغمبرؐ کی چند اہم ترین خصوصیات حافظِ ناموسِ زن، مردآزما اور مرد آفریں کے حوالہ سے اس سے بچنے کا پیغام دیا۔

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے!

اس کے تسلسل میں شیطان نے ان چند مسائل اور مباحث کا بھی ذکر کیا جس میں موجودہ دور کے علماء بحث ومباحثے اور ان کی بنیاد پر تکفیر کے کارخانے کو جاری وساری رکھے ہوئے ہیں۔ اس قسم کے تمام مباحثوں اور مسائل کو اقبال نے لات ومنات قرار دیتے ہوئے اس امر کا اظہار کیا میں (شیطان) ہر نفس امت مسلمہ کی بیداری سے ڈرتا ہوں کہ جس کا دین، احتساب کائنات ایک زندہ حقیقت ہے۔ اس تمام کا نکتہ آخری جو نہ صرف اس کا کلائمکس ہے بلکہ دراصل وہ شیطانی ایجنڈا ہے جس پر ہمیں غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا ہم سب چھوٹے بڑے، عالم وجاہل، عام وخاص غرضیکہ معاشرے کے تمام طبقات اس ایجنڈے پر عمل تو نہیں کر رہے؟ شیطان نے اپنے مریدوں کو تلقین کی:

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اس ضمن میں اقبال کے افکار کا مطالعہ اس قدر گھمبیر اور معنی خیز ہے کہ چند صفحات میں اس کا احاطہ ممکن نہیں۔ تاہم "سید کی لوح تربت" نامی نظم کے آخری شعر میں امت مسلمہ کے منبر ومحراب سے تعلق رکھنے والے اصحاب کو یوں اپنی ذمہ داری کا احساس دلایا کہ

پاک رکھ اپنی زباں، تلمیذِ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو! ◆

◆ نوجوان نسل میں دین سے بیگانگی کی جو ہوا چل نکلی ہے کیا اب بھی منبر ومحراب پر متمکن اصحاب اس پر کان نہ دھریں گے؟

ب۔اساتذہ/تعلیمی ماہرین:

کسی بھی معاشرے کی تعمیر وترقی میں تعلیم ومعلم کو جو اہم حیثیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔گزشتہ صفحات میں جو چند معروضات کی گئی ہیں اگرچہ ان کا روئے سخن بھی اساتذہ/ماہرین تعلیم پر یکساں طور پر لاگو ہوتا ہے تاہم موجودہ دور میں (گزشتہ دوصدیوں کے غلامی کے دور سمیت) دنیاوی تعلیم اور دینی تعلیم کے علیحدہ ہونے کی بناء پر چند حروف ان اصحاب علم وفضل کے بارے میں بھی کہنے ضروری ہیں جو دنیاوی (سیکولر) تعلیم کے ذمہ دار ہیں اور سکولوں، کالج اور یونیورسٹیوں میں اس شعبے سے متعلق ہیں۔

اس ضمن میں انگریزی تعلیم اور اس کے مضمرات کے بارے میں ہم نے اپنے ایک مقالہ(۲۰۱۷) میں اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔اور یہ واضح کیا ہے کہ گزشتہ ایک صدی میں بے شمار اہل علم نے اس طرزِ تعلیم کے متعدد پہلوؤں پر بہت جاندار تنقید کی ہے تاہم یہاں ۲/۳ اصحاب علم وفضل کے خیالات کو پیش کرنے کی گنجائش ہی ہوگی۔

اولاً۔اکبرالہ آبادی کا مشہور زمانہ شعر اپنے اندر الفاظ ومعنی کا ایک سمندر لئے ہوئے ہے:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!

ثانیاً: علامہ اقبال نے اپنے کلام میں جس قدر بھرپور انداز میں مغربی طرز تعلیم پر تنقید کی ہے وہ بھی اپنے اندر سمندروں جیسی گہرائی اور پہاڑوں جیسی بلندی کی حامل ہے۔

گزشتہ ڈیڑھ دوصدیوں میں بالعموم اور قیام پاکستان کے بعد (آج سے قریباً ۵۰ سال قبل) تعلیمی نظام میں جس قدر اکھاڑ پچھاڑ ہوئی ہے اور نظام تعلیم کے ذمہ داران (بیوروکریسی) اور اس پر مستزاد وہ ان پڑھ وزرائے تعلیم اور وزرائے اعلیٰ **(خادمانِ اعلیٰ خدمت گاروں میں بھی "اعلیٰ" ہونا ضروری ہے)** نے جس قدر غیر ذمہ داری نہیں بلکہ مجرمانہ غفلت کا ثبوت دیا ہے اگر کسی عدالت میں بے لاگ جائزہ لیا جائے تو شاید اسے بھی جائز سمجھ لیا جائے کہ انہیں پھانسی چڑھایا جائے۔جیسا کہ سولہویں/سترھویں صدی عیسوی

میں عیسائی راہبوں نے کیا تھا)۔ وطن عزیز میں دو درجن سے زائد تعلیمی نظاموں نے ملک و ملت کی جوان نسل کو مختلف طبقات / گروہوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا ہے۔ ایک دردمند صاحب علم کے یہ الفاظ سنہرے حروف میں لکھنے کے قابل ہیں کہ

"سرکاری یونیورسٹیوں میں دہشت گردی اور تشدد کے واقعات دراصل درآمد کردہ نظام تعلیم کی ناکامی کی علامتیں ہیں"

(انیس احمد ۲۰۱۷)

☆......اخلاقی اقدار سے خالی تعلیم نے نوجوان نسل کو اپنی معاشرتی ثقافت اور اقدار سے محروم کر دیا ہے۔ "فردوس میں ایک مکالمہ" (بانگ درا) میں اقبالؒ نے حالیؒ اور شیخ سعدیؒ کے ایک مکالمے کا ذکر کیا ہے جس میں شیخ سعدیؒ نے حالیؒ سے سوال کیا:

کچھ کیفیت مسلم ہندی تو بیاں کر
وا ماندۂ منزل ہے کہ مصروفِ تگ و تاز

حالی نے جو جواب دیا، وہ آج کے مسلمان کے بارے میں اس قدر صحیح تصویر پیش کرتا ہے کہ ایک انسان اس پر غور کرنے سے حیرت میں ڈوب کر رہ جاتا ہے

جب پیر فلک نے ورق ایام کا الٹا
آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی، طائر دیں کر گیا پرواز
بنیاد لرز جائے جو دیوارِ چمن کی
ظاہر ہے کہ انجام گلستان کا ہے آغاز
پانی نہ ملا زمزمۂ ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

یہاں شیخ سعدیؒ نے جس انداز میں اس گفتگو کو سمیٹا ہے، ظاہر ہے کہ یہ انداز بھی انہی

جیسے صاحب فہم ونظر کا ہوسکتا ہے۔آپ نے فرمایا

خرمانتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم
دیبانتواں یافت ازاں پشم کہ رشتیم

ظاہر ہے کہ کانٹوں کی فصل اگانے سے خرما (کھجور) اوراون سے ریشم کا حصول ممکن نہیں...... یہاں اس امر کی صراحت ضروری نہیں کہ کانٹوں سے مقصود نظامِ تعلیم ہے جس سے امت مسلمہ الحادی تعلیم کے ذریعے گمراہ ہوئی ہے اور انہیں باور کرایا جارہا ہے کہ مغربی تعلیم کے ذریعے ہم اپنی اسلامی اقدار اور اخلاق کو حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ دنیا میں ترقی بھی کرسکیں گے (محمد آفتاب، اسماء آفتاب ۲۰۱۷)

اقبال نے ماہرین تعلیم کو اس طرز کے تعلیمی نظام کی ناکامی کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے کہا

ممکن نہیں اس باغ میں کوشش ہو بار آور تری
فرسودہ ہے پھندہ تیرا، زیرک ہے مرغ تیز تر!

تاہم اس کا علاج، نوجوان نسل کو مخاطب کرتے ہوئے (اس میں ماہرین تعلیم کیلئے بھی راہ نمائی ہے) فرمایا

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہو بے داغ، ضرب ہو کاری!

آج ضرورت ہے کہ ایسے نصاب تعلیم کو رائج کیا جائے جو نوجوان نسل کو بے داغ شباب اور ضرب کاری سے روشناس کردے!

ج۔منافقین امت:

سورہ المدثر میں بیان کردہ ولید بن مغیرہ کے کردار کی ایک جھلک ہمیں ان سیاسی منافقین کی شکل میں نظر آتی ہے جو آج امت مسلمہ کے طول وعرض میں اپنی حرکتوں سے دین کی تعلیمات کے بارے میں متعدد شکوک وشبہات کا اظہار مختلف انداز اور پیرایوں میں

کرتے رہتے ہیں۔اس گروہ میں مستشرقین کے دلدادہ اہل قلم جنہوں نے خیالات ہی نہیں بلکہ اکثر اوقات الفاظ تک ان سے مستعار لئے ہوئے ہیں کہ اس دور میں کسے اتنی فرصت کہ اصل کتابوں کو دیکھ کر ان کی اس چوری کا پتہ چلا سکے،صف اول میں کھڑے نظر آتے ہیں۔پھر مغربی تعلیم وتہذیب کے دلدادگان بھی ان کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آتے ہیں۔ پھر اس گروہ میں اسلامی تعلیمات (بالخصوص حدیث اور سیرت طیبہ) پر اعتراضات کرنے والے بھی صف آراستہ نظر آتے ہیں۔غرضیکہ بھان متی کا ایک کنبہ ہے جو اپنے اپنے طور پر خلاف اسلام، وطن عزیز کے جغرافیائی اور نظریاتی تشخص اور وطن عزیز میں انتشار اور افتراق کا ایک طوفان برپا کرنے میں مصروف ہے۔اس قسم کے نام نہاد حضرات پر ایک تبصرہ جو سید مودودیؒ نے مغربی نظام تعلیم کے پروردہ حضرات پر کیا وہ بہت سی کتب پر بھاری ہے۔سید مودودیؒ (۱۹۸۲) نے لکھا کہ

"اس نظام تعلیم نے ہم میں "اینگلومحمڈن" اور "اینگلوانڈین" پیدا کئے اور وہ بھی ایسے جن کی نفسیات میں "محمڈن" اور "انڈین" کا تناسب بس برائے نام ہی ہے۔"

ماضی قریب کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو سقوط بنگال اور دکن پر سیاسی اور طالع آزما منافقین کا جو کردار ہے اس پر اقبال نے کیا خوب تبصرہ کیا۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگ ملت، ننگ دیں، ننگِ وطن

اور پھر دور کیوں جایئے تین دہائیوں قبل "مشرقی پاکستان سے بنگالہ دیش" کا سفر کرنے والوں میں بھی جن چند ''حسینوں'' کے نام آتے ہیں، وہ تو ایک ایسی بدیہی اور آنکھوں دیکھا سانحہ ہے جس کی مثال ملتِ اسلامیہ کے منافقین کی فہرست میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی! منافقین کے اس ٹولے میں کس کس چہرے کی نشاندہی کی جائے؟

تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم؟

د)فرقہ بازعناصر

ہم اپنی اس طول بیانی سے اپنے اصل موضوع سے کسی قدر دور ہو گئے۔ تاہم دراصل اس تمام تر تحریر کا مقصد وحید صرف یہ ہے کہ موجودہ مسلمان (بلاتخصیص جغرافیائی حد بندی، مسلک، زبان، رنگ ونسل وغیرہ) قرآن کریم کے بتائے ہوئے کرداروں کے آئینے میں اپنا اپنا چہرہ دیکھ کر نہ صرف اس دنیاوی زندگی بلکہ اصلی اور اخروی زندگی میں اپنے مقام کا تعین کریں۔ بدقسمتی سے گزشتہ ادوار میں اسلامی تعلیمات کا ایک بہت ہی محدود تصور عبادات (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ) کی فرضیت کے بارے میں دے کر امت مسلمہ کو آخرت میں جواب دہی کے تصور سے غافل کر دیا گیا ہے۔ضرورت ہے کہ اسے بتایا جائے کہ قرآن مجید، صرف عربوں کیلئے ہی مکہ اور مدینہ میں اللہ کے رسولؐ پر نازل نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ یہ ایک ایسی راہنما کتاب ہے جس میں آخرت تک کیلئے تمام انسانوں کیلئے راہ نمائی موجود ہے۔ اس تعلیم کو اجاگر کرنے اور ذہن نشین کرانے کیلئے ہمیں موجودہ دور میں امت مسلمہ کے مختلف طبقات کا ایک اجمالی جائزہ لینا پڑا۔ وگرنہ یہ کام منبر ومحراب سے کیا جاتا تو ہمارے لئے اس تمام تر طول بیانی کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں تھی۔ تاہم اب ہم آخر میں اس نقطہ نظر سے ایک اور اہم ترین طبقے / گروہ / کردار کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں جن کا تذکرہ بنی اسرائیل ونصاریٰ کے ضمن میں نہ صرف قرآن میں کیا گیا بلکہ امت مسلمہ کے موجودہ دور میں بھی اس کا وجود پایا جاتا ہے۔ اور ایسے تمام عناصر سیاسی / معاشرتی / لسانی / قبائلی / جغرافیائی اور رنگ ونسل کی بناء پر وجود میں لائے گئے ہیں اور ان کی گزشتہ نصف صدی کے دوران اس قدر پذیرائی مختلف ادوار میں مختلف شخصیتوں کے ذریعہ عمل میں آئی کہ آج اور نمعلوم کب تک امت مسلمہ اس قسم کی قہرمانیوں کا شکار رہے گی؟

اللہ کے رسول ﷺ کے دور میں درج بالا مختلف عناصر کی موجودگی کا اندازہ ہمیں قرآن پڑھنے اور سمجھنے سے بآسانی ہو جاتا ہے تاہم کس قدر گہری مماثلت موجودہ دور میں ان عناصر کو اس دور کے عناصر سے ہے، اس کا جائزہ (نہایت چالاکی کے ساتھ) نہیں کیا گیا

مبادا امت کا سنجیدہ طبقہ صورت حال سے آگاہ ہوکر اپنی اصلاح کر لے کہ شیطانی ایجنڈا تو بہر حال یہی ہے کہ

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

علامہ اقبال نے ضرب کلیم میں درج محراب گل کے افکار کے بند ۱۸ کے درج ذیل اشعار میں نہایت خوبصورتی سے ان تمام مختلف عناصر کی تصویر کشی کی ہے۔

یہ نکتہ خوب کہا شیر شاہ سوری نے
کہ امتیازِ قبائل تمام تر خواری
عزیز ہے انہیں نامِ وزیری و محسود
ابھی یہ خلعت افغانیت سے ہیں عاری
ہزار پارہ ہے کوہسار کی مسلمانی
کہ ہر قبیلہ ہے اپنے بتوں کا زناری
وہی حرم ہے وہی اعتبارِ لات و منات
خدا نصیب کرے تجھ کو ضربتِ کاری!

باب چہارم

مذاہب عالم پر ایک طائرانہ نظر ◆1

انسانی تاریخ کے تاریک ترین دور ◆2 سے لے کر آج کے نام نہاد مہذب اور روشن دور تک، انسان مذہب کے صحیح تصور کے بارے میں ژولیدہ فکری کا شکار رہا ہے۔ مذاہب عالم کی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انسان نے مختلف ادوار میں نہ صرف مظاہر فطرت (سورج، پہاڑ، پانی، آتش فشاں پہاڑ وغیرہ) کو اپنا خدا تسلیم کیا بلکہ اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے مٹی، لکڑی اور پتھر کے بتوں کی بھی پوجا پرستش کی۔

دراصل انسان کے اندر کسی نہ کسی مافوق الفطرت ہستی کی طلب ہمیشہ سے پائی جاتی رہی ہے اور جب کبھی بھی اس نے کسی چیز سے نفع یا نقصان کا خطرہ محسوس کیا، تو اس کے آگے سجدہ ریز ہو کر اس نے اپنے ان جذباتِ عبودیت کی تسکین کا سامان فراہم کر لیا! تاہم قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب پہلا انسان (آدم علیہ السلام) اس دنیا میں بھیجا تو اس کی تمام تر جسمانی ضروریات کے ساتھ اس کی فطرت کی اس (پیاس) کا بھی بندوبست کیا جسے ہم الہامی ہدایت سے تعبیر کرتے ہیں۔ یوں وہ پہلا شخص (آدم علیہ السلام) جو اللہ نے اس دنیا میں بھیجا وہ ہدایت یافتہ (پیغمبر علیہ السلام) تھا۔ اس پیغمبر علیہ السلام کی اولاد جب

◆1 اس باب کا بیشتر مواد سید مودودی کی کتاب قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، پروفیسر خورشید کی دو جلدوں پر مشتمل کتب (۲۰۱۵) اور تفہیم القرآن سے اخذ کردہ ہیں۔

◆2 دونوں اصطلاحیں تقابلی انداز میں استعمال کی گئی ہیں وگرنہ شاید انسانی تاریخ کا کوئی دور بھی ''تاریک'' نہیں تھا اور اسی طرح آج کا ''نام نہاد مہذب اور روشن دور'' بھی ایسا روشن اور مہذب نہیں جیسا کہ سمجھا یا کہا جاتا ہے!

روئے زمین کے مختلف حصوں/خطوں میں پھیلنا شروع ہوئی تو اولاً حضرت آدم نے انہیں اللہ کے احکامات پر عمل کرنے کی ہدایت کی تاہم رفتہ رفتہ لوگوں نے اس ہدایت پر عمل کرنا چھوڑ دیا اوراس کے نتیجے میں شرک اور بت پرستی کا آغاز ہوا جس کی انتہا یہ ہوئی کہ انسان نے ہزاروں جاندار اور بے جان چیزوں کو اپنا خدا بنالیا۔انہی چیزوں میں سے چند کا ذکر ہم نے درج بالا سطور میں کیا لیکن ایک اور بہت بڑا خدا جس کی انسان ہمیشہ سے پرستش کرتا رہا اس کی اپنی ذات (نفس کا بت تھا)۔انسان نے اپنے مزعومہ خیالات،عقائد اور خواہشات کو اس قدر زیادہ اہمیت دی کہ ان کی حیثیت بھی ایک بت کی سی ہوگئی اور جب اس طرح ایک ذہن کے لوگ اکٹھے ہوئے تو انہوں نے گروہوں،قبیلوں اور ذاتوں کی شکل اختیار کر لی۔اب ان تمام قبیلوں اور نسلوں کے لوگوں نے اپنے اپنے عقیدوں اور خود ساختہ طریقوں،رسم ورواج،روایات یا اپنے اپنے عقیدوں اور خودساختہ طریقوں،رسم ورواج، اپنے بڑے بزرگوں کی پیروی کا نام دے کر ان کی پرستش اور عمل کرنا یعنی پوجا پاٹ (پرستش اور عمل کرنا) شروع کر دیا۔پھر جب ان کی تعداد میں اضافہ ہوا تو انہوں نے زمین کے بڑے بڑے قطعات/ علاقوں پر قبضہ جما کر اپنی حکمرانی شروع کردی جس سے بادشاہی/سرداری/چودہراہٹ کا نظام وجود میں آیا اور یوں اب ان لوگوں نے اپنے قبیلوں اور نسلوں کی روایات کو سرکاری طور پر عوام الناس میں پھیلانا شروع کیا۔جس سے مختلف قبائل اور نسلوں کے بادشاہوں کے درمیان کشمکش کا آغاز ہوا اور ایک دوسرے کے ملک/ علاقے کی تسخیر کے لیے جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجے میں لاکھوں کروڑوں انسانوں کی جانیں ان کی بھینٹ چڑھ گئیں۔دو عظیم جنگیں اسی ذہنیت کا شاخسانہ ہیں اور آج بھی جو مختلف ممالک میں لڑائی دنگے ہورہے ہیں۔وہ انسانوں کی دوسرے انسانوں پر حکومت کرنے (دعوئی خدائی) کا مظہر ہیں!

اسلام،دین فطرت

جیسا کہ سطور بالا میں اشارہ کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اولین انسان کو دنیا میں پیغمبر

ہدایت دے کر بھیجا تھا تو وہ سلسلہ ان کے بعد بھی جاری رہا۔ دنیا کے مختلف خطوں میں مسلسل ایسے لوگ مبعوث ہوتے رہے جو لوگوں کو اسی ہدایت کی تعلیم دیتے رہے جس کی تعلیم سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے انسانوں کو دی تھی۔

یہی وہ ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں اپنے انبیاء کے ذریعے انسانوں کے پاس بھیجی۔ یہی علم ہدایت (اسلام) حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر بہت سے پیغمبروں کو دیا گیا۔ پھر اس ہدایت علم کو لے کر سب سے آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے جو قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے ہدایت کا آخری معیار ہیں۔ یہاں ہم اس امر کی مزید صراحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ عام طور پر لوگ اس غلط فہمی میں ڈال دیئے گئے ہیں کہ اسلام کی ابتدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی۔ یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بانیٔ اسلام تک کہہ دیا جاتا ہے......اصل میں یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے جو گزشتہ ۱۳ سو سالوں میں مستشرقین اور ان سے متاثر لوگوں کے ذریعے پھیلائی گئی ہے تا کہ اسلام کو ''زمانہ حال کی ایجاد'' کے حوالے سے یہودیت اور عیسائیت سے کم تر ثابت کیا جائے جو قدیم ترین مذاہب سمجھے جاتے ہیں۔ اس غلط فہمی کو دور ہو جانا چاہیے کیوں کہ اسلام ہمیشہ سے نوع انسانی کا ایک ہی حقیقی/فطری مذہب (بلکہ دین) رہا ہے۔

ہم نے درج بالا سطور میں مذہب اور دین دو علیحدہ علیحدہ اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ ضروری ہے کہ اس کی تشریح کی جائے نیز بتایا جائے کہ وہ کونسی تعلیمات ہیں جو دین اسلام میں روح کی حیثیت رکھتی ہیں اور کون سے اعمال ایسے ہیں جو اس روح کو برقرار رکھنے، جاری وساری رکھنے اور تمام عمر ایک انسان کو ان پر عامل کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

انبیائے کرام کا نظریہ کائنات وانسان◆

حضرت آدم علیہ السلام تا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء نے اس حقیقت کو ذہن نشین کرایا

◆ درج بالا بیشتر گفتگو تفہیم القرآن سے اخذ کردہ ہے۔

کہ یہ ساری کائنات جس کا ایک جز انسان بھی ہے کسی اتفاقی ہنگامے کے نتیجے میں معرضِ وجود میں نہیں آئی بلکہ یہ ایک منظم اور باقاعدہ سلطنت ہے جسے اللہ نے بنایا ہے اور وہی اس کا اکیلا حاکم ہے۔ اس سلطنت میں تمام اختیارات (نفع یا نقصان) اس کے ہاتھ میں ہیں اور کسی کی مجال نہیں کہ اس کے حکم سے سرتابی کر سکے۔ اس ہمہ گیر نظام کے اندر کسی کی خود مختاری اور غیر ذمہ داری کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

☆......انسان اس کائنات میں پیدائشی رعیت ہے۔ لہٰذا یہ خود اپنے لیے زندگی کا کوئی طریقہ وضع کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔

☆......یہ کسی چیز کا مالک نہیں بلکہ امین ہے۔ حتیٰ کہ اس کا اپنا جسم اور ساری صلاحیتیں اور قوتیں بھی اللہ کی عنایت کردہ ہیں تاکہ وہ انہیں اصل مالک (اللہ) کے حکم کے مطابق برتے۔

☆......اسی طرح روئے زمین پر موجود تمام انسان بھی اللہ کی رعیت ہیں اس لیے ان تمام کو بھی اس ضابطے کا پابند ہونا چاہیے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے اس دنیا میں بھیجا ہے۔

☆......انسان کو دی گئیں تمام صلاحیتیں اور قوتیں دراصل اس دنیا میں آزمائش کے لیے دی گئی ہیں تاکہ اصل مالک یہ دیکھے کہ وہ انہیں کس طرح استعمال کرتا ہے۔ اس خود مختاری اور آزادی کا یہ مطلب ہے کہ وہ دیکھے کہ آیا انسان اپنے اختیار اور آزادی کو ان حدود کے اندر رہ کر استعمال کرتا ہے جو اس کے خالق نے اس کے لیے وضع کی ہیں یا نہیں؟

☆......چونکہ یہ دنیا آزمائش اور امتحان کی جگہ ہے لہٰذا یہاں جزا و سزا نہیں بلکہ اس کا حساب کتاب اس دنیاوی زندگی کے خاتمہ کے بعد ایک دن (روز قیامت) ہوگا جس میں انسان کے پورے کارنامۂ زندگی کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ امتحان میں کامیاب ہوا ہے یا ناکام؟......آخرت میں جس چیز پر کامیابی و ناکامیابی کا انحصار ہے وہ یہ ہے کہ انسان نے اپنی قوت اور صلاحیتوں کو اللہ کے احکامات کے مطابق گزارا ہے یا نہیں؟ اس ضمن میں

یہ ضروری ہے کہ اللہ کے احکام وفرامین پر عمل کرنے کا اسوۂ حسنہ اللہ کے آخری رسول محمد ﷺ کی ذات گرامی ہے۔

ان کا اتباع، زندگی کے انفرادی اور نجی پہلو سے لے کر اجتماعیت کی بڑی سے بڑی شکل (حکومت، سیادت، قیادت، ہمہ اقسام دینی و دنیوی) تک نہایت ضروری ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی، تمام بولہبی است

عقائد:

جیسا کہ درج بالا سطور میں بیان کیا گیا کہ انبیاء کی ان تعلیمات کا تعلق عقائد سے ہے جنہیں ایمانیات بھی کہتے ہیں۔ یہ پانچ بنیادی عقائد ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔ یہ پانچوں عقائد ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم کا تعلق رکھتے ہیں۔ ایک کا انکار، تمام عقائد کا انکار تصور کیا جاتا ہے!

☆......توحید باری تعالیٰ (اللہ پر ایمان)
☆......فرشتوں پر ایمان
☆......آسمانی کتب
☆......رسولوں پر ایمان (رسالت)
☆......آخرت پر ایمان

''توحید باری تعالیٰ کا سب سے بہترین تصور سورہ اخلاص میں پیش کیا گیا ہے جس کی تفصیل ہم تفہیم القرآن سے یہاں نقل کر رہے ہیں۔

''اخلاص، اس سورت کا محض نام ہی نہیں بلکہ اس کے مضمون کا عنوان بھی ہے کیونکہ اس میں خالص توحید بیان کی گئی ہے۔ آیت نمبر ۳، اور ۴ کی تشریح میں سید مودودیؒ کا حاشیہ نمبر ۵ ذیل میں درج ہے:

''مشرکین نے ہر زمانے میں خدائی کا یہ تصور اختیار کیا ہے کہ انسانوں کی طرح

خداؤں کی بھی کوئی جنس ہے جس کے بہت سے افراد ہیں اور ان میں شادی بیاہ اور توالد وتناسل کا سلسلہ چلتا ہے۔اس جاہلانہ تصور سے انہوں نے اللہ رب العالمین کو بھی پاک اور بالاتر نہیں سمجھا اور اس کے لیے بھی اولاد تجویز کی۔ چنانچہ اہل عرب کا یہ عقیدہ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ انبیاء علیہم السلام کی امتیں بھی اس جہالت سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ ان کے ہاں بھی کسی بزرگ انسان کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دینے کا عقیدہ پیدا ہو گیا۔ان مختلف توہمات میں دو قسم کے تصورات ہمیشہ خلط ملط ہو تے رہے ہیں۔بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ جن کو وہ اللہ تعالیٰ کی اولاد قرار دے رہے ہیں وہ اس ذاتِ پاک کی نسبی اولاد ہے اور بعض نے یہ دعویٰ کیا کہ جس کو وہ اللہ کا بیٹا کہہ رہے ہیں اسے اللہ نے اپنا متبنیٰ بنایا ہے۔ اگرچہ ان میں سے کسی کی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ معاذ اللہ کسی کو اللہ کا باپ قرار دیں،لیکن ظاہر ہے کہ جب کسی ہستی کے متعلق یہ تصور کیا جائے کہ وہ توالد وتناسل سے پاک نہیں ہے،اور اس کے بارے میں یہ خیال کیا جائے کہ وہ بھی انسان کی طرح اس قسم کی کوئی ہستی ہے جس کے ہاں اولاد پیدا ہوتی ہے،اور جس کو لاولد ہونے کی صورت میں کسی کو بیٹا بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے،تو پھر انسانی ذہن اس گمان سے محفوظ نہیں رہ سکتا کہ اسے بھی کسی کی اولاد سمجھے۔یہی وجہ ہے کہ جو سوالات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے گئے تھے ان میں ایک سوال یہ تھا کہ اللہ کا نسب کیا ہے؟ اور دوسرا یہ کہ کس سے اس نے دنیا کی میراث پائی ہے اور کون اُس کے بعد وارث ہوگا؟''

''ان جاہلانہ مفروضات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ منطقی طور پر ان کو فرض کر لینے سے کچھ اور چیزوں کو بھی فرض کرنا لازم آتا ہے۔''

''اول یہ کہ خدا ایک نہ ہو، بلکہ خداؤں کی کوئی جنس ہو،اور اس کے افراد خدائی کے اوصاف، افعال اور اختیارات میں شریک ہوں۔ یہ بات خدا کی صرف نسبی اولاد فرض کر لینے ہی سے لازم نہیں آئی، بلکہ کسی کو متبنیٰ فرض کرنے سے بھی لازم آتی ہے، کیونکہ کسی کا متبنیٰ لامحالہ اس کا ہم جنس ہی ہوسکتا ہے،اور جب معاذ اللہ وہ خدا کا ہم جنس ہے تو اس سے

انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خدائی کے اوصاف بھی رکھتا ہے۔''

''دوم یہ کہ اولاد کا کوئی تصور اس کے بغیر نہیں کیا جا سکتا کہ نر و مادہ میں اتصال ہوا اور (کسی قسم کا) کوئی مادہ باپ اور ماں کے جسم سے نکل کر بچے کی شکل اختیار کرے۔ پس اللہ کے لیے اولاد فرض کرنے سے لازم آتا ہے کہ معاذ اللہ وہ ایک مادی اور جسمانی وجود ہو، اس کی ہم جنس کوئی اس کی بیوی بھی ہو، اور اس کے جسم سے کوئی مادہ بھی خارج ہو۔''

''سوم یہ کہ توالد و تناسل کا سلسلہ جہاں بھی ہے اس کی علت یہ ہے کہ افراد فانی ہوتے ہیں اور ان کی جنس کے باقی رہنے کے لیے ناگزیر ہوتا ہے کہ ان سے اولاد پیدا ہو جس سے ان کی نسل آگے چلے۔ پس اللہ کے لیے اولاد فرض کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہ بذاتِ خود معاذ اللہ فانی ہو اور باقی رہنے والی چیز خداؤں کی نسل ہو نہ کہ ذاتِ خدا۔ نیز اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ تمام فانی افراد کی طرح نعوذ باللہ خدا کی بھی کوئی ابتدا اور انتہا ہو۔ کیونکہ توالد و تناسل پر جن اجناس کے بقاء کا انحصار ہوتا ہے ان کے افراد نہ ازلی ہوتے ہیں نہ اَبدی۔''

''چہارم یہ کہ کسی کو متبنیٰ بنانے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ایک لاولد شخص اپنی زندگی میں کسی مددگار کا، اور اپنی وفات کے بعد کسی وارث کا حاجت مند ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے لیے یہ فرض کرنا کہ اس نے کسی کو بیٹا بنایا ہے، اس ذاتِ پاک کی طرف لازماً وہی سب کمزوریاں منسوب کرنا ہے جو فانی اشخاص میں پائی جاتی ہیں۔''

''ان تمام مفروضات کی جڑ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو اَحد اور الصمد کہنے سے ہی کٹ جاتی ہے، لیکن اس کے بعد یہ ارشاد فرمانے سے کہ ''نہ اُس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد'' اس معاملہ میں کسی اشتباہ کی گنجائش بھی باقی نہیں رہتی۔ پھر چونکہ ذاتِ باری کے حق میں یہ تصورات شرک کے اہم ترین اسباب میں سے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے صرف سورۂ اخلاص ہی میں اُن کی صاف صاف اور قطعی و حتمی تردید کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ جگہ جگہ اس مضمون کو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے تاکہ لوگ حقیقت کو پوری طرح سمجھ لیں۔''

مثال کے طور پر آیات ذیل ملاحظہ ہوں:

اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ یَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ (النساء:۱۷۱)

''اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔ وہ بالاتر ہے اس سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو۔ زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں اس کی ملک ہیں۔''

سورہ اخلاص میں نہایت مختصر مگر جامع تعارف توحید کے بعد اب ہم درج بالا عقائد کے بارے میں کس قدر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

اللہ پر ایمان (توحید باری تعالیٰ)

''اسلام کی سب سے پہلی اور سب سے اہم تعلیم کلمہ توحید کے پہلے جز ولا الہ اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) میں واضح کی گئی ہے۔ یہ اسلام کی بنیاد ہے۔ اس کی وجہ سے انسانوں کے درمیان ایک بہت بڑا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ اس کے ماننے والے ایک گروہ بن جاتے ہیں جن کے لیے دنیا اور آخرت میں کامیابی و سرفرازی ہے اور نہ ماننے والے دوسرا گروہ بن جاتے ہیں جن کے لیے نامرادی اور ذلت و رسوائی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟''

جب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کلمے میں سب سے اہم لفظ اللہ ہے۔ قبل از یں کہ ہم اس لفظ اللہ کی تفصیل قرآن و حدیث سے مطالعہ کریں، ضروری محسوس ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم سے لے کر کفار اور مشرکین عرب اور بنی اسرائیل نیز امت مسلمہ میں آج بھی اس لفظ (اللہ) کے متعلق کیا غلط تصورات اور عقائد پائے جاتے ہیں جن کی تردید قرآن کریم نے کی ہے۔ ہم نے سید مودودی کی کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ ◆

◆ اس ضمن میں ہم اپنے ان قارئین سے جو اللہ سے متعلق قرآنی تعلیمات کے صحیح معنی و مفہوم اور ان کے تفصیلی مضمرات سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں، انہیں مشورہ دیں گے کہ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں نامی کتاب ضرور پڑھیں!

اہل جاہلیت (قدیم وجدید) کا تصورِ اللّٰہ

☆......''اہل جاہلیت جنہیں الٰہ کہتے تھے (یا موجودہ زمانے میں جولوگ ایسا کہتے ہیں) وہ انہیں حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے تھے نیز یہ کہ ان کے یہ الٰہ صرف جن یا فرشتے یا دیوتا ہی نہ تھے بلکہ وفات یافتہ انسان بھی تھے اور یہ کہ وہ ان کے متعلق یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ ان کی دعاؤں کو سنتے ہیں اور ان کی مدد کو پہنچنے پر قادر ہیں—— اس لحاظ سے وہ ولی (الٰہ) کو سمیع و بصیر سمجھتے تھے۔ نیز یہ کہ عالم اسباب پر ان کی فرماں روائی کو بھی سمجھتے تھے—— پس اللہ کا وہ تصور جس کی بناء پر دعا مانگی جاتی ہے، لامحالہ ایک فوق الطبعی اقتدار اور اس کے ساتھ ہی فوق الطبعی قوتوں کے مالک ہونے کا تصور ہے۔ (سورہ مریم، یٰسین، ہود، النحل وغیرہ)''

☆......''قرآن کی دیگر سورتوں/آیات سے پتہ چلتا ہے کہ اہل جاہلیت اپنے الٰہوں کے بارے میں یہ خیال بھی رکھتے تھے کہ وہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں گے۔ (الزمر: ۳)''

☆......''یہاں اس امر کی صراحت ضروری ہے کہ اہل جاہلیت اپنے الٰہوں کے متعلق یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ساری خدائی انہی کے درمیان تقسیم ہوگئی ہے اور ان کے اوپر کوئی خداوند اعلیٰ نہیں ہے۔ بلکہ وہ واضح طور پر خداوند اعلیٰ کا تصور رکھتے تھے جس کے لیے ان کی زبان میں اللہ کا لفظ تھا تاہم دوسرے الٰہوں سے متعلق ان کا اصل عقیدہ یہ تھا کہ اس خداوند اعلیٰ کی خدائی میں ان الٰہوں کا کچھ دخل اور اثر و رسوخ ہے، ان کی بات مانی جاتی ہے، ان کے ذریعے سے ہمارے کام بن سکتے ہیں، ان کی سفارش سے ہم نفع حاصل کر سکتے ہیں اور نقصانات سے بچ سکتے ہیں۔ قرآن کریم نے متعدد آیات میں اس کی تردید فرمائی کہ ''دو خدا نہ بناؤ، خدا تو ایک ہی ہے۔ لہٰذا تم مجھ سے ڈرو''۔ (النحل: ۵۱، ہود: ۵۴)

☆......''جاہلیت (قدیم اور جدید) دونوں میں ایک اور تصور بھی تھا اور ہے کہ انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا رکھا تھا اور مسیح ابن مریم کو بھی رب ٹھہرایا۔'' (التوبہ: ۳۱)

سید مودودیؒ نے یہاں وضاحت کی کہ ان آیات میں الٰہ کا ایک اور مفہوم بھی ملتا ہے جو پہلے مفہومات سے بالکل مختلف ہے یعنی یہ کہ وہ الٰہ اس معنی میں بنا لیے گئے ہیں کہ ان (علماء رراہبوں) کے حکم کو تسلیم کیا جاتا تھا، ان کے امر و نہی کی اطاعت کی جاتی تھی، اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام مان لیا گیا تھا، اور یہ خیال کر لیا گیا ہے کہ اسے بجائے خود حکم دینے اور منع کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

''اسی طرح سورہ الفرقان (آیت ۴۳) میں خواہش نفس کی اطاعت کو الٰہ بنانے کا مترادف قرار دیا ہے کہ ایسا شخص خواہش نفس کی اطاعت کو بالاتر رکھتا ہے حکم ربانی سے۔

درج بالا مختصر الفاظ میں لفظ الٰہ کا جو مفہوم مشرکین عرب رکھتے تھے کی وضاحت کے بعد سید مودودی نے قرآن کریم کے استدلال کو جس انداز میں پیش کیا ہے، اس کے مقدمات اور نتائج حسب ذیل ترتیب کے ساتھ اچھی طرح سمجھ آسکتے ہیں۔

☆......''حاجت روائی، مشکل کشائی، پناہ و بندگی، امداد و اعانت، خبر گیری و حفاظت اور استجابت دعوات معمولی کام نہیں کیونکہ تمہاری دعائیں سننے اور تمہاری حاجتیں رفع کرنے کے لیے کوئی معمولی اقتدار نہیں بلکہ وہ اقتدار درکار ہے جو پوری کائنات کا انتظام کر سکے۔''

☆...... یہ اقتدار ناقابل تقسیم ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ خلق (پیدائش) کا اقتدار کسی کے پاس ہو اور رزق کا کسی اور کے پاس۔ بیماری، صحت کسی اور کے اختیار میں ہو اور موت و زندگی کسی اور کے اختیار میں —— لہٰذا تمام اقتدارات اور اختیارات کا ایک ہی مرکزی فرماں روا کے قبضہ میں ہونا ضروری ہے۔

☆......''جب تمام اقتدار ایک ہی فرماں روا کے ہاتھ میں ہے تو لامحالہ الوہیت بھی بالکلیہ اُسی فرماں روا کے لیے خاص ہے۔ کسی میں یہ طاقت نہیں کہ وہ تمہاری فریادیں سن سکے، دعائیں قبول کر سکے، پناہ دے سکے یا نفع نقصان پہنچا سکے۔ نیز یہ کہ کوئی ایسا بھی الٰہ نہیں کہ فرماں روائے کائنات کے ہاں مقربِ بارگاہ ہونے کی حیثیت ہی سے اس کا کچھ

زور چلتا ہو اور اس کی سفارش مانی جاتی ہو۔ سفارش قبول کرنا یا نہ کرنا بالکل اسی کے اختیار میں ہے۔''

☆......اقتدار اعلیٰ کی وحدانیت کا اقتضا یہ ہے کہ حاکمیت وفرماں روائی کی جتنی قسمیں ہیں سب ایک ہی مقتدرِ اعلیٰ کی ذات میں مرکوز ہوں اگر کوئی شخص اللہ کے حکم کی سند کے بغیر کسی دوسرے کے حکم کو واجب اور طاعت سمجھتا ہے تو وہ ایسا ہی شرک کرتا ہے جیسا کہ ایک غیر اللہ سے دعا مانگنے والا شرک کرتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص سیاسی معنوں میں مالک الملک اور مقتدر اعلیٰ اور حاکم علی الاطلاق ہونے کا دعوی کرتا ہے تو اس کا یہ دعوی بالکل اس طرح خدائی کا دعوی ہے جس طرح فوق الطبعی معنی میں کسی کا یہ کہنا کہ تمہارا ولی وکارساز محافظ میں ہوں۔ (سورہ آل عمران ۲۶، المومنون، ۱۱۶، ودیگر)

درج بالا سطور میں نہایت ہی مختصر الفاظ میں ان تمام صفاتِ عالیہ کا ذکر کیا گیا ہے جو اللہ رب العزت کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں تاہم کیا یہ امر ایک المیہ سے کم نہیں کہ آج امت مسلمہ کا ایک بہت بڑا حصہ (الا ماشاء اللہ) اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا گیا ہے کہ محدود معنوں میں یہ تمام صفات ولیوں، پیروں، فقیروں، اپنے اپنے فرقوں کے بزرگوں اور سیاسی حکمرانوں کو بھی حاصل ہیں۔ ◆

کلمہ لا الہ میں جس الٰہ کے تصور کی تردید، انکار، تکذیب کا تصور پایا جاتا ہے وہ ماضی اور زمانہ حال میں کما حقہ عوام الناس کو نہ دیا جا سکا جس کا شاخسانہ گلی محلوں، سڑکوں اور مختلف جگہوں پر بے شمار قبروں کا وجود ہے جن پر نذر و نیاز کے نام پر ہزاروں روپے جمع کیے جاتے ہیں اور اس طرح بڑے بڑے مزاروں پر بزرگوں کی اولاد قابض ہے جو صرف سالانہ عرس کے موقعہ پر بہت بڑی بڑی پگڑیاں پہن کر ۱، ۲ دن کے لیے ''مریدین کو نوازتے'' ہیں اور یوں ان سے لوٹی ہوئی دولت سے دنیاوی عیش و آرام ہی حاصل نہیں

◆ موجودہ زمانے میں غلام احمد پرویز نے یہ شوشہ چھوڑا ہے تاکہ احادیث رسول کے اسوۂ حسنہ کی نفی ہو اور قرآن کی تفسیر کا حق ہر زمانے کے صاحبان اقتدار کو حاصل ہو جائے۔

کرتے بلکہ بڑے بڑے شہروں میں جب آپ کبھی ان کی خواتین کی صورت دیکھیں تو ایسی خواتین سگریٹ نوشی اور عریاں لباس میں ملبوس چلتی پھرتی نظر آتی ہیں جبکہ یہی خواتین جب اپنے مریدین کے گاؤں میں جاتی ہیں تو گاؤں کے تمام بالغ مرد، گاؤں سے باہر چلے جاتے ہیں کہ پیرنی کے احترام کا یہ عین دینی تقاضہ سمجھا جاتا ہے۔ وطنِ عزیز میں گزشتہ کئی صدیوں سے دینی اور دینی تعلیمات کا جو تصور منبر و محراب کے ذریعے دیا جارہا ہے، اس سے ذہنی بغاوت کے جو بیج نوجوان نسل میں بارآور ہورہے ہیں اور ان کی وجہ سے عوام الناس میں دین سے دوری (بلکہ بغاوت) کے جو حالات پیدا ہورہے ہیں، ان کی عکاسی علامہ اقبال نے بہت خوبصورت اور اچھوتے تاہم زمینی حقائق کے حوالے سے ''باغی مرید'' کے تحت بالِ جبرائیل میں کی ہے، وہ پڑھنے کے لائق ہے۔

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو، دیہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانند بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن
نذرانہ نہیں، سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

ہمیں اس امر کی صراحت کی ضرورت نہیں کہ پیری مریدی کا جو کاروبار آج وطن عزیز میں رائج ہے، اس کے مریدوں میں غریب و امیر ہی نہیں بڑے بڑے سیاستدان اور اعلیٰ مناصب پر فائز سول اور ملٹری کے صاحبان نیز بڑے بڑے تاجر اور صنعت کار بھی ان کی زلفوں کے اسیر ہیں اور جن کے نذرانوں سے ان کی دنیاوی زندگی کے ٹھاٹ باٹ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں ـــــ اور یہ سب مل جل کر وطن عزیز میں ''ٹھیٹ اسلامی نظام'' لانے کی

راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہیں (وکیل انجم)◆

امت مسلمہ کے لیے صحیح تعلیم اور کردار کی جو ضرورت و اہمیت ہے، اس کا احساس نہ کرنے اور اس کے لیے دینی فرقوں میں کسی متفقہ راہ عمل میں اشتراک نہ ہونے کے بارے میں ''روایتی دینی ذہن'' میں جو اشکالات ہیں، ان کے بارے میں ہمیں روزانہ کوئی نہ کوئی صورت نظر آتی رہتی ہے۔ نوبت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ موجودہ زمانے کا پڑھا لکھا یا مغرب سے متاثر نوجوان، اب ان فتوؤں کا بھی کوئی اثر نہیں لیتا جو اس قسم کے اہل علم صادر فرماتے ہیں۔ حالیہ دور میں فتنۂ انکار حدیث، مسئلہ قادیانیت اور جنسی اباحیت کے بارے میں بھی اکثر و بیشتر صحیح الفکر اہل علم کی آراء بھی نوجوان نسل کو کسی حد تک متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہوتیں۔

یہاں اس امر کی صراحت شاید ضروری ہو کہ عقیدہ توحید ہی دراصل وہ قوتِ محرکہ ہے جو ایک مسلمان کو ہر آن، ہر لحہ، اندھیرے/ اجالے/ حالت عام یا پوشیدہ میں احکاماتِ ربانی کی روگردانی سے روکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر شخص شیطان کے اس حملے کا سب سے پہلا نشانہ بنتا ہے کہ وہ اسے شرک کی کسی بھی یا خفی یا جلی صورت میں مبتلا کر دیتا ہے۔

ایمان بالرسالت: عقیدۂ توحید کے بعد دوسرا بنیادی عقیدہ رسالت ہے۔ جیسا کہ بتایا گیا کہ حضرت آدم سے لے کر آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو اس دنیا میں اس لیے مبعوث

◆ پیری/ مریدی کے اس کاروبار کی تازہ ترین شکل لاڑکانہ میں ''بھٹو شہید'' کے مزار کی تعمیر بھی ہے (جہاں اپنوں ہی کے ہاتھوں ایک دوسری شہیدہ بھی دفن ہے) گویا اس ''کاروبار کی افادیت کا اب سیاسی اور لبرل طبقہ بھی قائل ہو گیا ہے کہ اس طرح مستقبل بعید میں اپنی آنے والی نسلوں کی رزق رسانی کا بھی ایک مستقل اور دیرپا ذریعہ انہوں نے دریافت کر لیا ہے ـــــ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ایسے لوگوں کی ذات کے ساتھ مافوق الفطرت اعتقادات بھی جنم لیتے رہتے ہیں اور یوں ایسے خاندانوں کی نسلیں بھی ملکی قیادت اور سیادت پر قابض ہو جاتی ہیں!...... وطن عزیز کے جنوبی علاقے اور سندھ میں پیروں/ وڈیروں کی نام نہاد پیری مریدی کے سلسلے اس امر کے بدیہی ثبوت ہیں!

فرمایا گیا کہ وہ اللہ کا پیغام لوگوں تک زبان اور عمل کے ذریعے پہنچائیں۔قرآن کریم سے انبیاء کرام کی ان صفات کا پتہ چلتا ہے کہ:

i) رسالت ایک وہبی چیز ہے یعنی رسالت خدا کا ایک خصوصی عطیہ ہے جس میں کسی انسان کے اپنے ارادے اور کوشش کو کوئی دخل حاصل نہیں۔

ii) سارے رسول انسان تھے۔(سورہ ابراہیم ۱۱، المومنون: ۳۳)

iii) انبیاء کے پاس حقیقی علم وبصیرت ہوتی ہے۔(سورہ مریم: ۴۳)

iv) رسول خدا کے ترجمان ہوتے ہیں۔(سورہ النجم: ۳)

v) رسول اپنی دعوت کا مکمل عملی نمونہ ہوتے ہیں۔(ہود: ۸۸)

vi) تمام انبیاء ایک ہی پیغام لائے۔(النحل: ۳۶)

vii) تمام انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے۔(النساء: ۶۴)

viii) حضور ﷺ کی تعلیمات کا دائمی ہونا۔

ix) حضور ﷺ کی تعلیمات ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔

x) ختم نبوت: رسالت محمدی کی ایک نمایاں ترین خصوصیات یہ ہے کہ آپ ﷺ کے بعد اب قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا۔اس بارے میں گزشتہ ۱۴ سو سال میں امت کے درمیان کبھی کوئی اختلاف رونما نہیں ہوا سوائے قادیانیوں/احمدیوں کے جنہیں پاکستان کی قومی اسمبلی نے اتفاق رائے کے ساتھ غیر مسلم قرار دیا ہے۔

xii) محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی ایک نمایاں ترین خصوصیت کا یہ تقاضہ ہے کہ ایک مسلمان/انسان ہر اس ہدایت کو بے چون و چرا قبول کرے جو محمد ﷺ سے ثابت ہو۔ایک مسلمان کو کسی حکم کی تعمیل کرنے اور کسی اور طریقے سے روک دینے کے لیے صرف اتنی بات ہی کافی ہے کہ اس چیز کا حکم یا اس کی مخالفت حضور ﷺ سے ثابت ہے۔رسول کی اطاعت گویا اللہ کی اطاعت ہے۔(النساء: ۸۰)

عقیدہ توحید کی طرح یہ عقیدہ بھی دراصل انسانیت کو ان تمام غلط طریقوں سے نجات

دینے کا بہترین طریقہ ہے جو نام نہاد ماہرین مذاہب، سیاستدان، فلسفی یا دیگر لوگ پیش کرتے ہیں۔

آخرت پر ایمان: اسلام کے عقائد کی اہم ترین کڑی آخرت پر ایمان لانا ہے جس دن تمام عالم اور اس کی مخلوقات کو دنیا میں اپنے نامہ اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ جس کے اچھے اعمال ہوں گے اس کو جنت میں داخل کر دیا جائے گا اور جس کے برے اعمال ہوں گے وہ جہنم میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ جہاں وہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔

اسلام میں عقیدہ آخرت کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا میں ایک انسان کے تمام اعمال و افعال کی اگر کسی جگہ پوچھ گچھ نہیں تو پھر ایک انسان کے لیے دنیاوی زندگی میں کسی بھی برے ترین عمل کو کر گزرنے میں اسے ہرگز کوئی باک نہیں ہوتا۔ جبکہ عقیدہ آخرت پر ایمان کی وجہ سے ایک انسان کی سیرت پر انتہائی گہرے اور دور رس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً ایسا انسان دیانت دار ہوتا ہے اور اپنی زندگی میں بڑی سے بڑی مالی بے ضابطگی پر تیار نہیں ہوتا جبکہ موجودہ امت مسلمہ کا یہ حال ہے کہ ایک نہایت معمولی سی چیز پر اس کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے۔

☆......آخرت پر ایمان رکھنے والا آدمی رشوت، سفارش، لوٹ کھسوٹ، ناجائز آمدنی کے حصول، حق تلفی، ظلم و زیادتی سے بچا رہتا ہے اور یوں ایسا معاشرہ تشکیل پاتا ہے جس میں خیر خواہی اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی و تعاون کے جذبات پائے جاتے ہیں۔

☆......عقیدہ آخرت کا حامل شخص بہت بہادر اور شجاع ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے آخرت میں انعام کی وجہ سے کسی ظلم و ستم سے نہ صرف خود باز رہتا ہے بلکہ دنیا میں بھی ظلم و ستم کے خلاف ایک رکاوٹ بن جاتا ہے۔ ایک ایسا آدمی جو آخرت کی جزا پر یقین رکھتا ہے، وہ نہایت سیر چشم اور اعلیٰ ظرف کا مالک ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن و حدیث میں اس عقیدے پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔

فرشتوں پر ایمان: اسلام کے بنیادی عقائد میں فرشتوں پر ایمان رکھنا ضروری

ہے۔ اسلام نے ملائکہ کے بارے میں جو مختلف قسم کے غلط اور شرک پر مبنی خیالات تھے، ان کا خاتمہ کیا۔

کتابوں پر ایمان: اسلام کے بنیادی عقائد میں ان تمام کتابوں پر ایمان لانا بھی شامل ہے جو مختلف انبیائے کرام پر گزشتہ ادوار میں نازل ہوئی تھیں۔ اللہ کے آخری رسول ﷺ پر نازل ہونے والی آخری کتاب قرآن مجید ہے۔ اسے دیگر کتب سماوی پر، جو اب مکمل طور پر صحیح صورت میں دنیا میں موجود نہیں، متعدد خصوصیات کی بناء پر فوقیت حاصل ہے۔ یہ محفوظ ترین کتاب ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ رب العزت نے خود لی ہے (سورہ الحجر: ۹)۔ یہ کتاب ہر قسم کی انسانی تحریف سے پاک ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ پچھلے تمام انبیاء کی کتب میں ان کے ماننے والوں نے کلام الٰہی کے ساتھ ساتھ اپنی قومی تاریخ، بزرگوں کے حالات اور دیگر فقہی مسائل، ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیئے تھے۔ جبکہ قرآن کریم ایسی ہر تحریف سے پاک اور منزہ ہے! قرآن کریم کی تعلیمات ابدی ہیں اور عالمگیر نوعیت کی ہیں جو زمان و مکان سے ماوراء قیامت تک کے لیے انسانوں کی راہ نمائی کے لیے کافی ہیں۔ واضح رہے کہ قرآن کریم ایک مکمل ضابطہ حیات کا نقشہ پیش کرتا ہے جس میں ایک انسان کی انفرادی اور بحیثیت مجموعی (اجتماعی) مسائل زندگی کے بارے میں راہ نمائی موجود ہے جس کی عملاً شکل، رسول اللہ ﷺ نے اپنی ۲۳ سالہ زندگی میں بسر کر کے دکھا دی۔ باب اول میں ہم نے اس کتاب کے نزول، مقصد اور اس نصب العین کی وضاحت کی ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو اپنے رسول ﷺ پر نازل فرمایا تھا۔

اسلام میں عبادت کا تصور: درج بالا عقائد کے علاوہ اسلام جن عملی چیزوں کا مطالبہ کرتا ہے، ان میں پانچ وقت کی نماز، سال میں ایک ماہ کے روزے، عمر میں کم از کم ایک بار حج، سالانہ زکوٰۃ کی ادائیگی اور فریضہ جہاد فی سبیل اللہ شامل ہیں۔ یاد رہے کہ توحید رسالت اور آخرت کے تصورات کو، ایک مسلمان کے دل میں ہر لمحہ، ہر وقت اور ہر جگہ جاگزیں رکھنے، زندگی کے ہر پہلو میں ان کا استحضار تازہ رکھنے اور ان کے مطابق زندگی کے

ہر قدم پر عمل کرنے کے لیے ان پانچ اعمال کی حیثیت ایک یاددھانی کی ہے کہ بار بار پانچ وقت نماز کی ادائیگی اور دیگر مراسم عبودیت کے بجالانے سے ایک مسلمان کا ایمان اور ایقان ذات باری تعالیٰ، رسالت محمدی ﷺ اور آخرت پر تازہ دم ہوتا رہتا ہے۔ ذیل میں ہم اس پہلو سے ان عبادات کی ادائیگی کے بارے میں چند مختصر گزارشات پیش کریں گے جس سے پتہ چلے گا کہ کس طریق پر یہ عبادات اس مقصد کے حصول کے لیے تجویز کی گئی ہیں۔ تاہم اس موضوع پر اہل علم نے بہت تفصیل کے ساتھ خامہ فرسائی کی ہے جن کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے۔

اسلام کا نظام عبادت: سورہ الزمر کی آیت نمبر ۳ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو، دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔''

اس کی تشریح کے لیے سید مودودیؒ نے جو حاشیہ لکھا وہ لفظ عبادت کے لفظ کی بہترین وضاحت کرتا ہے جو ذیل میں درج ہے۔ (حاشیہ نمبر ۳)

''یہ ایک نہایت اہم آیت ہے جس میں دعوتِ اسلام کے اصل مقصود کو بیان کیا گیا ہے، اس لیے اس پر سے سرسری طور پر نہ گزر جانا چاہیے، بلکہ اس کے مفہوم و مدعا کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے بنیادی نکات دو ہیں جنہیں سمجھے بغیر آیت کا مطلب نہیں سمجھا جا سکتا۔ ایک یہ کہ مطالبہ اللہ کی عبادت کرنے کا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایسی عبادت کا مطالبہ ہے جو دین کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے کی جائے۔''

''عبادت کا مادہ عبد ہے۔ اور یہ لفظ ''آزاد'' کے مقابلے میں ''غلام'' اور ''مملوک'' کے لیے عربی زبان میں مستعمل ہوتا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے ''عبادت'' میں دو مفہوم پیدا ہوئے ہیں۔ ایک پوجا اور پرستش، پس مطالبہ صرف اللہ تعالیٰ کی پوجا اور پرستش ہی کا نہیں ہے بلکہ اس کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت اور اس کے قانونِ شرعی کی برضا و رغبت پیروی، اور اس کے امر و نہی کی دل و جان سے فرمانبرداری کا بھی ہے۔''

''دین کا لفظ عربی زبان میں متعدد مفہومات کا حامل ہے:''

☆......''ایک مفہوم ہے غلبہ واقتدار، مالکانہ اور حاکمانہ تصرف، سیاست وفرمانروائی اور دوسروں پر فیصلہ نافذ کرنا۔ دوسرا مفہوم ہے اطاعت، فرمانبرداری اور غلامی، تیسرا مفہوم ہے وہ عادت اور طریقہ جس کی انسان پیروی کرے۔

''ان تینوں مفہومات کوملحوظ رکھتے ہوئے دین کے معنی اس آیت میں اُس طرزِ عمل اور اس رویے کے ہیں جو کسی کی بالاتری تسلیم اور کسی کی اطاعت قبول کر کے انسان اختیار کرے۔ اور دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ''آدمی اللہ کی بندگی کے ساتھ کسی دوسرے کی بندگی شامل نہ کرے، بلکہ اسی کی پرستش، اسی کی ہدایت کا اتباع اور اسی کے احکام اوامر کی اطاعت کرے۔''

''یہ ایک امر واقعہ اور ایک حقیقت ہے جسے اوپر کے مطالبے کے لیے دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے لیے دین کو خالص کر کے اس کی بندگی تم کو کرنی چاہیے کیونکہ خالص اور بے آمیز اطاعت و بندگی اللہ کا حق ہے۔ دوسرے الفاظ میں بندگی کا مستحق کوئی دوسرا ہے ہی نہیں کہ اللہ کے ساتھ اس کی بھی پرستش اور اس کے احکام و قوانین کی بھی اطاعت کی جائے۔ اگر کوئی شخص اللہ کے سوا کسی اور کی خالص اور بے آمیز بندگی کرتا ہے تو غلط کرتا ہے۔ اور اسی طرح اگر وہ اللہ کی بندگی کے ساتھ بندگی غیر کی آمیزش کرتا ہے تو یہ بھی حق کے سراسر خلاف ہے۔ اس آیت کی بہترین تشریح وہ حدیث ہے جو ابن مردویہ نے یزید الرقاشی سے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ہم اپنا مال دیتے ہیں اس لیے کہ ہمارا نام بلند ہو، کیا اس پر ہمیں کوئی اجر ملے گا؟ حضور ﷺ نے فرمایا نہیں۔ اس نے پوچھا اگر اللہ کے اجر اور دنیا کی ناموری دونوں کی نیت ہو؟ آپ نے فرمایا: ان اللہ تعالیٰ لا یقبل الا من اخلص لہ ''اللہ تعالیٰ کوئی عمل بھی قبول نہیں کرتا جب تک وہ خالص اسی کے لیے نہ ہو۔'' اس کے بعد حضور ﷺ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔''

''ان آیات کی رو سے انسانوں اور جنوں کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی رویہ مناسب

نہیں کہ وہ صرف اور صرف اللہ کے وفادار رہیں—— اللہ کی عبادت یہ ہے کہ ہوش سنبھالنے سے لے کر مرتے دم تک انسان اللہ کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرے۔ انسان کی انفرادی زندگی میں سونا، جاگنا، اٹھنا، بیٹھنا، کھانا پینا، کام کاج کرنا، کاروبار کرنا، غرضیکہ زندگی کے تمام امور کو اس طرح سرانجام دینا کہ اس میں اللہ کے احکام کا خیال رکھا جائے۔ اسی طرح اجتماعی دائرے میں انسانی زندگی کے تمام جملہ امور سرانجام دینے میں بھی اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق عمل کیا جائے۔ مسلمانوں کے ملک میں عدالتیں، بازار، منڈیاں، سیاست، تعلیم، معیشت، لین دین، امور خارجہ و داخلہ، جنگ و صلح غرضیکہ اجتماعی زندگی کے جملہ امور بھی اللہ کے احکامات کے تابع ہوں اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں اس کا عملاً مظاہرہ اللہ کے رسول ﷺ کے اُسوہ حسنہ کا اتباع کرنا ہے۔ (سورہ النساء: ۸۰، سورہ الاحزاب: ۲۱)''

''نبی اکرم ﷺ کا ارشادگرامی ہے کہ اسلام کی تعمیر پانچ چیزوں پر ہوتی ہے جنہیں ارکانِ اسلام بھی کہتے ہیں۔

ارکان اسلام:

۱۔ یہ شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں
۲۔ نماز قائم کرنا
۳۔ زکوٰۃ ادا کرنا
۴۔ رمضان کے روزے رکھنا
۵۔ بیت اللہ کا حج کرنا

درج بالا عبادات ایک انسان کو ہر وقت یہ یاد دلاتی رہتی ہیں کہ ایک مسلمان، اللہ کا بندہ ہے اور اسے احکامات الٰہی کی پابندی یا اتباع رسول ﷺ کے ذریعے کرنی چاہیے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ ۱۰، ۱۲ صدیوں سے ان عبادات کو صرف پوجا پاٹ (پرستش) کی حد تک محدود باور کرایا گیا ہے۔ اسی طرح دوسری جانب ایک طبقے نے ہندومت، بدھ مت،

یہودیت اور عیسائیت کی طرح اس امر کو پروان چڑھایا کہ انسان کو اپنی انفرادی زندگی کی اصلاح کے لیے دنیاوی زندگی سے الگ ہو کر خدا کی طرف دھیان کرنا چاہیے اپنے جسم وجاں کو نفس کش مجاہدات کے ذریعے اپنی اندرونی قوتوں کو نشوونما اور دنیوی زندگی کی ذمہ داریوں سے فرار حاصل کر کے اخروی نجات حاصل کرنے کی فکر کرے۔ خلافت راشدہ کے نظام کے اختتام پر امت کو جس المیے کا سامنا کرنا پڑا وہ بادشاہت اور موروثی حکومت کی بدترین شکل میں آہستہ آہستہ یوں جڑ پکڑتا گیا کہ حکومتیں دین کی ترویج واشاعت کے فریضے سے غافل ہوتی چلی گئیں اور یوں دین ودنیا کا وہ تصور ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا جسے سولہویں اور سترہویں صدی میں یہودیت اور عیسائیت کی لڑائی نے اس حد تک پہنچا دیا کہ انقلاب فرانس کے نتیجے میں لا کلیسا، لا سلاطین لا الٰہ کا نعرہ بلند ہو گیا۔ سائنس اور صنعتی ترقی کی بناء پر یورپ میں جو انقلاب رونما ہوا، بدقسمتی سے عیسائی راہبوں اور پوپ نے اس کی اس انداز میں اندھا دھند مخالفت کی کہ نہایت معمولی اختلافات کی بناء پر احتسابی عدالتوں (PERSECUTION COURTS) کا قیام عمل میں آیا جنہوں نے ۱۴۸۱ء سے لے کر ۱۸۰۸ء (تین صدیوں سے زائد) عرصے میں تین لاکھ چالیس ہزار آدمیوں کو سزائیں دیں جن میں ہزاروں کو آگ میں زندہ جلا ڈالا گیا۔ سائنس کی جدید تحقیقات کی مخالفت اور خود ساختہ تعلیمات کے تحت گلیلو (Galiloo)، اٹلی کے مشہور سائنس دان برونو (Bruno) اور فلکیات کے ماہر کوپرنکس (Copernicu) کو مختلف اقسام کی سزائیں دیں۔

چرچ کے ان مظالم کی وجہ سے لوگوں میں عیسائیت کے خلاف ردعمل پیدا ہوا اور لوگوں میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا کہ مذہب اور سائنس ایک دوسرے کے خلاف ہیں حالانکہ جس چیز میں تضاد وتصادم تھا وہ مذہب اور سائنس میں نہیں بلکہ عیسائیت کی بگڑی ہوئی شکل اور انیسویں صدی کا فلسفہ تھا۔ عجیب امر یہ ہے کہ عیسائی مذہب کو دیگر الہامی دین اسلام کے مترادف قرار دے کر اسلام کے بارے میں بھی یہ تاثر عام کر دیا گیا کہ یہ بھی سائنسی ترقی کا دشمن ہے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ عین یہی وہ دور تھا جب مسلمانانِ عالم (تقریباً تمام دنیا

میں) تنزل کا شکار ہو رہے تھے۔ مغربی یورپی طاقتوں (برطانیہ، ولندیزی، فرانسیسی وغیرہ) نے بیشتر مسلم ممالک کو فتح کر کے اپنے قبضے میں کرلیا تھا۔ انہوں نے ان تمام ممالک بشمول برصغیر ہندوستان میں عیسائی مشنریز کے ذریعے عیسائیت کی تعلیم کے ذریعے نہ صرف اپنے استحصالی نظام کو مستحکم کیا بلکہ امت مسلمہ کو مزاجِ خانقاہی میں پختہ تر کر دیا اور دین اسلام کو مذہب (ہندومت، بدھ مت) کے مترادف ٹھہرا کر امت مسلمہ کو اس فرض سے غافل کر دیا جس کی خاطر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی معزولی کے بعد امت محمدیہ ﷺ کو ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں کسی حد تک تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا کہ اسلام کا تصور عبادت یہ ہے کہ ایک مسلمان اپنی ساری زندگی خدا کی بندگی میں گزارے۔ اس کا سونا، جاگنا، اٹھنا، بیٹھنا، کھانا پینا، غرضیکہ سب کچھ خدا کی بندگی میں ہو۔ اپنے گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ، اپنے محلے میں ہمسایوں کے ساتھ، اپنی سوسائٹی میں دوستوں کے ساتھ اپنے کاروبار میں اہل معاملہ کے ساتھ برتاؤ کرتے وقت ایک ایک بات اور ایک ایک کام میں خدا کی مقرر کردہ حدود کا اسے کو خیال رکھنا چاہیے۔

اس نکتہ نظر سے جب ہم موجودہ امت مسلمہ کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ مایوس کن صورت حال سامنے آتی ہے کہ ہمارے عوام، خواص، پڑھا لکھا طبقہ، طبقہ اشرافیہ، سیاست دان اور سب سے بڑھ کر منبر محراب اور مذہبی راہ نما دین اور دنیا کی دوئی کے قائل ہی نہیں بلکہ اپنی زندگیوں میں اس رویے پر عامل بھی ہیں۔ کہیں اپنے ذاتی خیالات (نفس) کی پرستش ہو رہی، کہیں ذات، برادری، قبیلے کی بات مانی جارہی ہے، کسی نے رنگ، نسل، زبان کو اپنا الٰہ بنا رکھا ہے اور کہیں آباؤ اجداد کے رسم و رواج پر اس سختی کے ساتھ عمل ہو رہا ہے اور شادی بیاہ کی رسموں میں ہندوانہ، مشرکانہ، مغربی تہذیب و تمدن کے کی پوجا کی جارہی ہے۔ جبکہ اسلامی تعلیمات کا یہ تقاضہ ہے کہ

☆......دنیا کو چھوڑ کر کونوں/گوشوں (خانقاہوں/مزاروں) میں جا بیٹھنا اور ریاضت

کرنا عبادت نہیں بلکہ دنیا کی سرگرمیوں میں رہتے ہوئے دنیوی زندگی گزارتے ہوئے خدا کے قانون اور رسول ﷺ کا اتباع کرنا ہی عبادت ہے۔

☆......اگر اللہ نے آپ کو اختیارات/ سیادت وقیادت دنیا دیئے ہیں اور حکومت کی کرسی پر بیٹھے ہیں تو یہ یاد رکھیں کہ میں بندوں کا خدا نہیں، خدا کا بندہ ہوں۔

☆......عدالت کی کرسی پر براجمان ہوں تو انصاف کے دامن کو کسی بڑے سے بڑے لالچ یا خوف کی بناء پر ترک نہ کریں۔

☆......زمین کے خزانوں کا کنٹرول حاصل ہو تو یاد رکھیں کہ میں ان خزانوں کا مالک نہیں بلکہ امانت دار ہوں اور پیسہ پیسہ کا حساب مجھے اصلی مالک (اللہ) کو دینا ہے۔

☆......فوجوں کے کمانڈر بنئے اور اللہ کا خوف آپ کو طاقت کے نشے میں مدہوش نہ ہونے دے۔

☆......تجارت اور صنعت و مالیات کی باگیں سنبھالیں پھر کامیابی کے ذرائع میں پاک اور ناپاک، حلال اور حرام کا لحاظ کریں۔

بدقسمتی سے دور انحطاط سے لے کر آج تک صحیح دینی تعلیمات جو قرآن اور سیرتِ رسول ﷺ سے اخذ کی جاسکتی ہیں، انہیں درخور اعتناء نہیں سمجھا گیا اور عوام الناس کو اپنے اپنے فقہی گروہوں اور مسلکوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ امت مسلمہ کا جسد واحد بے شمار خود ساختہ عقائد اور ازموں کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ یہی وہ حالات تھے جن کی وجہ سے بنی اسرائیل کو امت مسلمہ کے منصب اعلیٰ سے معزول کر کے امت محمدیہ کو اس منصب پر فائز کیا گیا تھا۔ **ضرورت ہے کہ آج ہر چھوٹا بڑا، غریب امیر، قیادت وسیادت پر براجمان لوگ، تعلیم یافتہ طبقہ اور بالخصوص مذہبی قیادت اور اہل علم اس سوال پر غور کریں کہ بنی اسرائیل کیوں نہیں اور امت محمدیہ ﷺ کیوں؟** ...... یہ کتاب دراصل اس سوال کا جواب دینے کی ایک ادنیٰ سی کوشش ہے...... خدا کرے کہ اس آئینے میں ہمیں اپنا چہرہ ایسا نظر نہ آئے جس کی تصویر کشی بنی اسرائیل کے عوام اور مذہبی طبقے کی قرآن کریم نے

پیش کی ہے!

چند دیگر الہامی مذاہب کا تعارف: جیسا کہ ہم نے اس باب میں تفصیل کے ساتھ بتایا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک لاکھوں پیغمبر، اللہ رب العزت کا پیغام لے کر دنیا کے مختلف خطوں اور قوموں کی طرف مبعوث ہوتے رہے۔ اگرچہ ہر قبیلے یا قوم کی طرف بھیجے جانے والے پیغمبر نے ان خامیوں اور کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے خاص توجہ دی جو اس قوم میں بالخصوص پھیلی ہوئی تھیں۔ تاہم سب کی تعلیمات کا مرکز و محور اللہ کی وحدانیت، رسالت کا اقرار اور آخرت کی جوابدہی کا تصور تھا۔ یہ تمام پیغمبر جس ہدایت کی جانب دعوت دیتے رہے وہ اسلام یعنی اللہ کی فرمانبرداری ہی تھی۔

اگرچہ انبیائے کرام کی دعوت توحید سے زمین کا ہر آباد علاقہ سرفراز ہو چکا تھا لیکن انسانیت کی بدنصیبی کہ اس نے اس سبق کو بھلا دیا اور اپنی خواہشات کی پیروی میں چاند، سورج، پہاڑوں، انسانوں اور نہ جانے کن کن اشیاء کو اپنا خدا ٹھہرا لیا۔ دنیا کے مختلف ممالک روم، ایران، ہندوستان وغیرہ میں کفر و شرک کا دور دورہ تھا۔ عرب کے بڑے حصے میں یہودی آباد تھے جن کے علماء نے دین کو بچوں کا کھیل بنا رکھا تھا اور نت نئی تاویلات سے کام لے کر دین موسوی کو مسخ کر ڈالا تھا۔ چونکہ اس کتاب کا مقصد تالیف یہود و نصاریٰ کی ان تمام مشرکانہ اور خلاف اسلام حرکات کا جائزہ لینا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ان دونوں اقوام کے مذاہب کا مختصر تعارف اور ان کے تاریخی پس منظر سے بھی آگاہی حاصل کی جائے جس کی روشنی میں آئندہ ابواب کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ ذیل میں ہم یہودیت اور عیسائیت کے بارے میں مختصر معلومات یوسف ظفر کی کتاب (۲۰۱۶ء)، پروفیسر خورشید احمد کی کتاب (۲۰۱۶ء) اور سید مودودی کی تفہیم القرآن سے دے رہے ہیں۔

''اسرائیل عبرانی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں ''خدا کا بندہ'' اور یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا عبرانی زبان میں نام تھا۔ اس طرح بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ یہودیت کی بنیاد دو عقائد پر ہے۔ اول خدا کی وحدانیت اور دوم بنی اسرائیل کا خدا کی منتخب

اور مخصوص امت ہونا۔

یہودیوں کا یہ دعویٰ کہ وہ خدا کے منتخب اور لاڈلے بندے ہیں اور خدا سے ان کا تعلق خصوصی نوعیت رکھتا ہے، غلط سہی مگر بالکل بے بنیاد نہیں۔ خود قرآن نے کئی جگہ بنی اسرائیل کی فضیلت کا ذکر کیا ہے۔ (البقرہ: ۱۲۲)

"اے بنی اسرائیل! میری نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تمہیں دی تھیں اور یہ کہ میں نے تمہیں پوری دنیا پر فضیلت بخشی تھی۔"

لیکن جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہوں پر کہا گیا ہے، اس فضیلت کی وجہ کوئی نسلی یا وراثتی امتیاز نہ تھا بلکہ یہ تھا کہ خدا نے بنی اسرائیل کو اسلام کی دعوت ساری دنیا تک پہنچانے کی ذمہ داری سپرد کی تھی۔ پھر جب بنی اسرائیل نے اس فریضے سے منہ پھیرا تو ان کو اس اعزاز سے محروم کر دیا گیا۔

بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانے ہی میں مصر آ گئے تھے۔ یہاں ان کی نسل خوب پھلی پھولی۔ اس وقت مصر میں بنی اسرائیل کے علاوہ ایک نسل قبطیوں کی تھی۔ آگے چل کر جب بنی اسرائیل اپنے فریضہ دعوت حق سے غافل ہوئے تو قبطیوں نے انہیں اپنا غلام بنا لیا۔ اسی غلامانہ پستی کے دور میں حضرت موسیٰ علیہ السلام مبعوث کیے گئے۔ آپ کا زمانہ بعثت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً ۱۳ صدی قبل ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رہنمائی میں بنی اسرائیل مصر سے ہجرت کر کے جزیرہ نمائے سینا کی طرف آئے۔ کوہ سینا ہی میں آپ پر توراۃ کے بیشتر احکام نازل ہوئے۔ ایک طویل عرصے تک خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرنے کے بعد بنی اسرائیل نے فلسطین پر قبضہ کیا اور اپنی حکومت قائم کی۔ یہ حکومت اگرچہ محدود علاقے پر تھی اور اس کی آبادی بھی بہت زیادہ نہ تھی لیکن ہر حیثیت سے برتر اور بہت دولت مند تھی۔

یہودیوں کی تاریخ مسلسل عروج و زوال کی داستان ہے۔ یہ عروج و زوال مادی بھی تھا اور روحانی بھی۔ جب انہوں نے خدا کی نافرمانی کی، انہیں زوال ہوا۔ پھر ان میں پیغمبر

مبعوث ہوئے اور انہوں نے ان کو پستی کی گہرائیوں سے نکالا۔ان میں حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے پیغمبر بھی مبعوث ہوئے جو ساتھ ہی ساتھ بادشاہ بھی تھے اور جن کے عہد میں بنی اسرائیل کی سلطنت اپنی شان وشوکت کے عروج پر پہنچ گئی،لیکن بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کی سزا کے طور پر خدا نے ایسے فاتحین بھیجے جنہوں نے فلسطین کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور انہیں وہاں سے نکال دیا۔

ایک یہودی فلسفی موسیٰ بن میمون نے ان عقائد کو ذرا تفصیلاً اس طرح بیان کیا ہے:

(۱) وجود خداوندی پر ایمان (۲) اس کے ایک ہونے پر ایمان (۳) اس کے ہمیشہ رہنے والا ہونے پر ایمان (۴) اس کے غیر مادی ہونے کا تصور (۵) اس پر ایمان کہ عبادت صرف اسی کی جائے (۶) پیغمبر پر ایمان (۷) اس پر ایمان کہ حضرت موسیٰ سب سے بڑے پیغمبر تھے (۸) اس پر ایمان کہ توراۃ (زبانی وتحریری دونوں) حضرت موسیٰ کو کوہ سینا پر عطا کی گئی (۹) اس پر ایمان کہ اس میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی (۱۰) اس پر ایمان کہ خدا سب کچھ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے (۱۱) یوم آخرت کی جزاوسزا اور زندگی بعد موت پر ایمان (۱۲) مسیح کے آنے پر ایمان اور (۱۳) مردوں کے دوبارہ اٹھائے جانے پر ایمان۔

یہودیوں کے یہاں سبت (ہفتہ کے دن) کی چھٹی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔سبت کا دن جمعہ کے دن غروب آفتاب سے شروع ہوکر ہفتہ کی شام ستاروں کے نمودار ہونے پر ختم ہوتا ہے۔اس دوران میں راسخ العقیدہ یہودی دنیاوی کاموں کو چھوڑ کر زیادہ سے زیادہ عبادت اور مراقبے میں مشغول رہتے ہیں۔

یہودیوں کی مقدس کتاب تورات ہے۔تورات اصل میں تو ان پانچ کتابوں کو کہتے ہیں جو کوہ سینا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملی تھیں،لیکن اکثر لفظ تورات کو زیادہ وسیع معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور اس میں یہودیت کا طرزِ معاشرت، اخلاق اور طریقہ عبادت سب

شامل ہوجاتے ہیں۔تورات آج سے تقریباً سوا تین ہزار سال پہلے نازل ہوئی تھی۔اس وقت کتب کو لکھے جانے کو جو انتظام ممکن ہوسکتا تھا وہ ظاہر ہے کہ آج جیسا نہیں تھا۔پھر بھی ان احکام کو تختیوں پر کندہ کرایا گیا،لیکن وہ بھی فاتحین کے حملوں کی وجہ سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ جس نے بھی یروشلم فتح کیا ان نسخوں کو آگ لگا دی، اور اگرچہ یہودیوں نے اسے محفوظ رکھنے کی بڑی کوشش کی لیکن نہ کرسکے۔ پھر اس سے بڑھ کر خرابی یہ ہوئی کہ یہودیوں کا اخلاقی بگاڑ مذہبی طبقے میں بھی پھیل گیا اور چونکہ نشر واشاعت کے ذرائع محدود تھے اور تورات صرف ان لوگوں کے پاس تھی لہٰذا انہوں نے اس میں اپنی پسند کی تبدیلیاں کرڈالیں۔

اپنی طویل تاریخ اور حکمرانی کے باوجود دنیا میں یہودیوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے اور ہمیشہ تھوڑی ہی رہی ہے۔حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں جو ان کی شان وشوکت اور عروج کا زمانہ تھا،ان کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔عددی اعتبار سے وہ سب سے زیادہ عروج پر جنگ عظیم دوم سے قبل تھے اور اس وقت ان کی تعداد ڈیڑھ کروڑ کے قریب تھی۔۲۰۱۰ء میں ان کی آبادی کا اندازہ ایک کروڑ چالیس لاکھ (۱۴ ملین) ہے۔ یہ دنیا کی کل آبادی کا صرف ۲ فی صد بنتا ہے۔ان کی آبادی میں کمی کا رجحان ہے۔

یہودیت: چند حالیہ حقائق

گذشتہ صفحات میں ہم نے یہود کے بارے میں بیشتر ان کارروائیوں کا جائزہ لیا ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔تاہم آج کے جدید دور میں یہود کا جو جارحانہ کردار ہے،اس سے نسل نو ہی نہیں بلکہ بہت سے پڑھے لکھے بھی ناآشنا ہیں۔اس وجہ سے درج ذیل صفحات میں ہم نے انٹرنیٹ سے اخذ کردہ معلومات کی بناء پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس جدید ترین علم وتحقیق کے دور میں،جس پر یورپ اور امریکہ کو بہت فخر ہے اور جس کے بارے میں ہماری نوجوان پڑھی لکھی نسل جہت حد تک متاثر اور مرعوب نظر آتی ہے،کو بتایا جائے کہ

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

ذیل میں ''یہودی چند حقائق'' کے تحت جو معروضات پیش کی گئی ہیں، ان کے مطالعے کے بعد ہم اپنے ان عزیزوں کو دعوتِ فکر دیں گے کہ وہ مغرب بالخصوص امریکہ اور یہودی گٹھ جوڑ کے بارے میں اپنے موقف اور معلومات پر دوبارہ غور کریں۔

ہم نے درج ذیل صفحات میں واضح کیا ہے کہ یہودی قوم کس طریق پر ماضی میں اپنی حرکتوں کی بناء پر دنیا سے دھتکاری گئی اور مغربی ممالکنے جس طرح ان کی حرکتوں سے ''محفوظ'' رہنے کے لئے انہیں اپنے اپنے ملکوں سے نکال کر فلسطین میں، ان کے ''نام نہاد مذہبی دعویٰ'' کی بنا پر، آباد کرنے کی مذموم کوششیں کیں، ان کا ایک جائزہ بھی لیا ہے تا کہ نسل نو کو پتہ چلے کہ جس انداز میں انہیں یہ ''بین الاقوامی طاقتیں'' اپنے سے دور رکھ کر، فلسطین کی اصل مالک مسلمان عربوں کی نسل کشی کر رہے ہیں، ان کے پیچھے ان کا وہ ''مذہبی منافرت'' (Fanaticism) کا داعیہ ہے جو انہوں نے گذشتہ کئی صدیوں سے دین اسلام کے خلاف اپنے مذہبی جنونی پادریوں اور ربیوں کی تعلیمات سے ورثے میں پائی ہیں۔

درج بالاصفحات میں یہود کے بارے میں جو واقعات درج کیے گئے ہیں وہ آج سے 1400 سال قبل کے ہیں جن کا ذکر قران کریم میں اور سیرت رسولؐ کی کتب میں آیا ہے۔ اگر چہ اس دور میں یہودیوں کا کردار بھی بہت ہی گھناؤنا رہا۔ کون سا ایسا موقع تھا جب انھوں نے رسولؐ اللہ کے ساتھ زیادتی روانہ رکھی ہو۔ زہر دینے کی سازش سے لیکر پتھر سے آپؐ کو جان سے مار دینے کی کوششیں اور کفار ومشرکین کیساتھ گٹھ جوڑ کے ذریعے رسولؐ اللہ کے مشن کو ناکام کرنا گویا ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا جسے وہ آج تک پورا کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ اپنی تاریخ کے چار ہزار سالہ دور میں یہود نے بطور ایک سازشی گروہ۔ ایک احسان شناس کینہ پرور قوم، ہر قسم کے ظلم وستم اور ریشہ دوانیوں کو روا رکھنے میں نمایاں ترین کردار ادا کیا ہے۔ اقوام عالم میں سب سے زیادہ نرمی اور احسان کا

سلوک ان کیساتھ نبی آخرؐالزمان اورآپؐ کی امت نے اپنے اپنے دورحکومت میں کیا۔ ہالینڈ۔ برطانیہ۔ جرمنی اورفرانس سے دھتکارے ہوئے یہ یہودی جب ترکی پہنچےتو انھوں نے اپنے دروازے ان کے لیےکھول دیے۔لیکن انھوں نے ترکی کو مرد بیمار بنا کراسلام کے مرکز کی حیثیت سے ختم کر کےان کے''احسان کا خوب بدلہ چکایا''۔دوسری جنگ عظیم کے بعد جب عالمی طاقتوں نے اسپین وفلسطین میں انھیں اپنا تسلط قائم کرنے کا موقع فراہم کیاتوانہوں نے وہاں کیا کیاستم نہیں ڈھائے اس قوم کاتو یہ حال ہے کہ بنی اسرائیل(اولاد یعقوبؑ) ہی کے ایک دوسرے نبی (حضرت عیسیٰؑ) کو بزعم خود پھانسی چڑھانے کا''تمغہ'' حاصل کیا! اسی طرح عیسائیوں کوبھی ہمیشہ اپنی تاریخ کےمختلف ادوار میں انہیں سازشوں چالاکیوں اورریشہ دوانیوں کے ذریعےکواس بری طرح''استعمال''(Exploit) کہ آج کی دنیامیں ایک سپرپاورکی نکیل اس چھوٹے سے مذہبی جنونیوں کے ہاتھ ہے۔

فرنگ کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے!

یہاں اس امرکی صراحت بھی ضروری ہے کہ آج کی مہذب دنیا بھی ان کے گھناونے جرائم اور۔حرکتوں کی شکار ہے۔فلسطین ہو یا کشمیر،شام ہو یامصر۔ یادنیا کے دیگر مسلمان مما لک (سوڈان ۔انڈونیشیا۔ترکی)ان تمام جگہوں پرظلم وستم کا جوبازارگرم ہےکیااس کے پیچھےامریکہ کا ہاتھ نہیں اورامریکی حکومت کی باگ ڈورکس کے ہاتھوں میں ہے۔اس پراگر کوئی صاحب علم تحقیق کریں تواس کے پیچھےاسرائیل/ یہودی دماغ سازش کرتانظرآئیگا۔

درج بالا انسانیت سوز ظالمانہ اقدامات کاایک بہت ہی افسوس ناک اورقابل مذمت پہلو یہ ہے کہ عالمی ضمیر (مغربی طاقتیں اورامریکہ) اس تمام ترصورت حال پرمنہ میں گھنگنا یاں ڈالے خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں ۔اگرسوڈان میں معاملہ عیسائیوں کا ہوتو راتوں رات یہ اقوام متحدہ اورسیکورٹی کونسل کے اجلاس بلاکرفیصلہ عیسائیوں کےحق میں کر دیتے ہیں۔میانمر میں اگر24000 مسلمان قتل کردیئے جائیں توکسی کی ابروپرکوئی شکن نظر نہیں آتی ۔اس تمام ترصورت حال کے باوجودامریکی صدرٹرمپ نہایت" بھولپن" سے

پوچھتے ہیں نہ معلوم مسلم امت امریکہ سے ناراض کیوں رہتی ہے۔ یا مسلمان شدت پسند کیوں ہیں؟۔صدر امریکہ کوکون بتائے۔ ایں ہمہ کردہ ءتست

یہ تمام تر" نفرت اور شدت پسندی" جس کا طعنہ آپ ہمیں دے رہے ہیں، آپ اور آپ کی حکومتوں کے اس" بے جا ناز برداری" کا شاخسانہ ہے کہ آپ نے اپنی سرپرستی میں ایک ایسی قوم/فرقے کو پناہ دے رکھی ہے جو اگر کبھی آپ (عیسائی قوم) ان کے داؤ میں آ گئی تو وہ اپنے سابقہ تاریخی عمل (حضرت عیسیٰؑ کے قتل کی گھناؤنی سازش) کو دھرانے سے بھی باز نہ آئیں گے۔ذیل کی چند سطور ہماری اس گزارش کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

برمین جیوش ڈیٹا بینک BERMAN JEWISH DATA BANK کے اعداد وشمار (2015) کے مطابق امریکہ کے متمول ترین اور نہایت ترقی یافتہ شہر نیو یارک میں یہودیوں کی تعداد 1،75 ملین یعنی 5،17 لاکھ) ہے جو اس شہر کی کل آبادی کا تیرہ فی صد ہے۔ جبکہ امریکہ میں آباد کل یہودی آبادی کی تعداد کا 25 فی صد! امریکہ میں یہودیوں کے دو کٹر طبقے (آرتھوڈوکس) اور غالی متشدد یہودی (الٹرا آرتھوڈوکس) کے نام سے نیوسکوائر میں بہت بڑی تعداد میں KYRIA نامی میں آباد ہیں۔گویا کہ ان علاقوں میں انکا قبضہ ہے۔امریکہ میں دو کٹر یہودی طبقوں کی آبادی میں نہایت تیزی کیساتھ اضافہ ہورہا ہے امریکہ میں یہودیوں کی تعداد کا اندازہ اسرائیل کی ریاست کی مکمل آبادی کے قریباً برابر ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے امریکی حکمران طبقے کی اس مجبوری کی جس کے تحت وہ اسرائیل کی سیاسی معاشی اور فوجی امداد کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔

☆ اسرائیل کو سالانہ ساڑھے تین 5،3 بلین ڈالرز کی امداد امریکہ سے ملتی ہے۔اکثر و بیشتر امریکی حکومتیں اپنے عوام کو دھوکہ دینے کے لیے یہ بہانہ تراشتی ہیں کہ مڈل ایسٹ میں اسرائیل واحد جمہوری ریاست ہے۔ یہ ایک بہت بڑا سفید جھوٹ ہے کیونکہ یہی امریکی حکمران اس خطے میں بہت سی ایسی تنظیموں کی بھی امداد کرتی ہیں جو اسرائیل اور امریکہ کے مفاد کے لیے اس علاقے میں کام کررہی ہیں۔

یہاں ایک بڑی تلخ حقیقت کا انکشاف بھی بہت ضروری ہے جس سے امریکہ اور دیگر مغربی طاقتیں صرف نظر کر رہی کہ یہودی عقائد کے تحت اسرائیلی ریاست کا قیام دراصل ان قدیم ترین مذہبی احکامات تورات کو نافذ کرنا ہے نہ کہ جمہوریت کا قیام/فروغ!۔ یہ امر ان تمام طاقتوں کے اس منافقانہ رویہ کی روشن مثال ہے جو یہ چاہتی ہیں کہ دنیا کے ہر ملک/خطے میں سیاسی معاملات لادینیت (سیکولرازم) کی بنیاد پر مبنی ہونے چاہییں۔ تاہم وہ اس امر سے جان بوجھ کر آنکھیں چراتے ہیں کہ موجودہ صورت میں اسرائیلی ریاست کا قیام یہودیوں کی مذہبی روایات کے تحت فلسطین کا علاقہ یہودی قوم کو خدا کی طرف سے 4 ہزار سال قبل" بخشش کے طور پر دیا گیا تھا۔ مغربی طاقتوں اور امریکہ کا ''خدا بیزاری'' (سیکولرازم) اور''یہودی خدائی مذہب'' کی سرپرستی، کا یہ ایک ایسا منافقانہ رویہ ہے کہ بے اختیار کہنے کو جی چاہتا ہے۔

نہ ہاتھ میں خنجر ہے نہ دامن پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو!

امریکہ جیسے ملک میں یہود پرور ذہن کے سیاسی لیڈروں اور حکمران طبقے کی سوچ کے علی الرغم حیرت تو امریکی عوام پر ہوتی ہے جو جمہوری روایات کے نہایت زیرک اور ذہین و فتین آبادی پر مشتمل ہونے پر فخر ومباہات کا اظہار کرتے نہیں تھکتے۔ کیا انہوں نے کبھی بھی اس منافقانہ دوروخے پن پر اپنی حکومت سے سوال کیا کہ وہ امریکی شہریوں کی گاڑھی محنت سے کمائے ہوئے آمدنی پر ٹیکسوں کی بھاری رقوم سے یہودیوں کو کیوں نواز رہے ہیں؟ کیا اس سے یہ اخذ کیا جائے کہ امریکی عوام بھی پسماندہ اقوام کی طرح اندھے ہو کر دو پارٹیوں کے جذبات محبت میں مبتلا ہو کر ووٹ ڈالتے ہیں یا پھر یہ کہ امریکی قوم اسقدر بانجھ ہو چکی ہے کہ اتنی بڑی آبادی کے باوجود ان میں ایک بھی رجل رشید پیدا نہیں ہوا۔۔۔ اس صورت میں امریکہ کو اپنے اسقدر بھاری بھرکم وجود کو برقرار رکھنا بہت دیر تک ممکن نہ ہوگا۔۔۔ کیا اس قوم پر بھی روس کی طرح وہ وقت قریب نہیں آ گیا جس طرح کمیونزم اور سرمایہ دارانہ

نظام کی تباہی و بربادی کی نوید ایک مردمومن نے دی تھی۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے 30 ستمبر 1946 میں تقریر کرتے ہوئے پیشن گوئی فرمائی تھی کہ

> **''حتیٰ ایک وہ وقت آئیگا جب کمیونزم خود ماسکو میں اپنے بچاؤ کے لیے پریشان ہوگا، سرمایہ دارانہ ڈیموکریسی خود واشنگٹن اور نیویارک میں اپنے تحفظ کے لیے لرزہ براندام ہوگی، مادہ پرستانہ الحاد خود لندن و پیرس کی یونیورسٹیوں میں جگہ پانے سے عاجز ہوگا، نسل پرستی و قوم پرستی خود براہمنوں و جرمنوں میں مقتدر نہ پا سکے گی اور یہ آج کا دور تاریخ عالم میں ایک داستان عبرت کی حیثیت سے باقی رہ جائیگا، کہ اسلام جیسی عالمگیر اور جہاں کشا طاقت کے نام لیوا کبھی اتنے بیوقوف ہو گئے تھے کہ عصائے موسیٰؑ بغل میں تھا اور وہ لاٹھیوں اور رسیوں کو دیکھ کر لرز رہے تھے'' (ایک تقریر سے اقتباس جو 13، ستمبر 1946 کو سیالکوٹ کے علاقے میں کی گئی)**

مغربی ممالک اور امریکہ کا ایک اور طریقہ واردات بھی دنیا کے سوچنے سمجھنے والے لوگوں کیلیے غور فکر کا سامان فراہم کرتا ہے۔ یہودی پروپیگنڈے کے تحت یہ اقوام امت مسلمہ پر مذہبی اور جنون تشدد کا الزام لگاتے نہیں تھکتے۔ یہ نعرہ بھی یہودیوں کی شدت پسندی اور مذہبی غلو پر پردہ ڈالنے کی ایک عیارانہ چال ہے۔ مذہبی جنوں اور شدت پسندی کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہوگی کہ یہود فلسطین میں چار ہزار سال قبل دیے گئے" انعام یا بخشش (TIP) کے تحت" نام نہاد" خدا پرستانہ حکومت" قائم کرانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ پھر اس" خدائی حکومت" کو قائم رکھنے کیلیے ظلم و ستم کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ روزانہ نہ معلوم کتنے معصوم انسانوں کا خون اس" خود ساختہ خدائی نظام" کو قائم رکھنے کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔ خون مسلم کے اسطرح ناحق بے دریغ بہانے پر عیسیٰؑ کے ماننے والوں کو اس تعلیم کا ضرور خیال رکھنا چاہیے جس نے ایک گال پر تھپڑ لگانے پر دوسرا گال پیش کرنے کی بھی اپنے ماننے والوں کو نصیحت کی تھی۔ آخر دنیا کا ضمیر مذہبی بنیادوں پر ان دو مختلف اقسام کے رویوں

کو کب تک گوارا کریگا؟۔ دنیا کے انصاف پسند لوگوں نے، جو انسانیت کے احترام میں کسی قسم کی بھی مذہبی، طبقاتی، رنگ ونسل یا صنفی تشدد کے قائل نہیں کو یہود کے درج ذیل جملہ شدت پسندی پر مبنی حقائق پر غور کرنا چاہیے۔

صنفی تفاوت:

امریکی شہر نیویارک سٹی میں جو کٹر اور متشدد ترین یہودی آباد ہیں ان علاقوں کی سڑکوں پر ہر دو اصناف (مرد و خواتین) کے چلنے کیلیے علیحدہ علیحدہ متعین راستے ہیں۔ سڑکوں پر چلنے کے لیے دائیں یا بائیں دونوں اصناف کے لیے واضح نشانات لگے ہوئے ہیں جن کی پابندی سختی کے ساتھ کرائی جاتی ہے۔ یہ صورت حال امریکہ کے متمول ترین اور نہایت ماڈرن جدید شہر نیویارک کی ہے جو مساوات مرد و زن کے نعرے کا سب سے بڑا مویداور دعویدار ہے۔ یہ طبقہ اپنے بچوں کو پبلک اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے نہیں بھیجتے تا کہ اس شہر کے عریاں/فحش اور غیر مذہبی ماحول کے اثرات بد سے بچا یا جا سکے۔ بچوں کو بیرونی دنیا کے واقعات سے آگاہ ہونے (ٹی وی۔ اخبارات۔ فلمیں۔ ہمہ اقسام فحش اور غیر تعلیمی) اور غیر مذہبی لٹریچر پڑھنے کی بھی اجازت نہیں مبادا وہ سیکولر بن جائیں اور یوں اپنی یہودی مذہبی رسم و رواج پر سختی سے عمل کرایا جاتا ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ اس قسم کے سخت ماحول میں پلنے والے بچے کس طرح کسی ملک کے مفید اور امن پسند شہری بن سکتے ہیں اور بڑے ہو کر وہ دنیا میں مذہبی شدت پسندی کے کتنے طوفان برپا کریں گے؟

اس متشدد ترین طبقے کے بارے میں ایک اور حیران کن امر یہ ہے کہ اس متشدد ذہن کے لوگ اسرائیل میں رہنے والی کل آبادی کا ایک تہائی (33 فی صد) ہے۔ جو اسرائیل میں کسی قسم کا کوئی دنیاوی کام کاج نہیں کرتے اور نہ ہی خود کما کر گزر اوقات کرتے ہیں۔ ایسے تمام لوگوں کی گزر اوقات حکومت کی جانب سے دی جانے والے سوشل سپورٹ سسٹم کے تحت ہوتی ہے۔ جبکہ ایسے تمام لوگ ربیوں کی بتائی ہوئی تورات کی تعلیم حاصل کرنے میں دن رات مصروف رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں متشدد ترین لوگوں کو

صرف اسلیے تیار کیا جاتا ہے تاکہ وہ دنیا میں کسی جگہ بھی ہر قسم کی ظالمانہ اور تشدد پر مبنی کاروائیاں کریں گے۔۔۔۔۔ان کاروائیوں سے اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ مذہبی تشدد پسندی کا الزام مسلمانوں پر لگا کر یہودیوں کو اس امر کی کھلی چھٹی دیدی گئی ہے کہ وہ اپنی کاروائیوں میں مصروف رہیں۔ حیرت تو دنیا کی ان تنظیموں پر ہوتی ہے۔جنہیں اسرائیل اور امریکہ نیز دیگر مغربی ممالک میں اس قسم کی کاروائیاں نظر نہیں آتیں لیکن اسلامی ممالک بالخصوص پاکستان کے دور دراز قبائلی علاقوں میں مدرسوں اور مساجد میں زیر تعلیم قران پڑھتے بچے نظر آجاتے ہیں اور وہ ان کی تصاویر لیکر ساری دنیا میں ڈھنڈورہ پیٹنے میں ہی نہیں لگ جاتے بلکہ ڈرون حملوں کے ذریعے انھیں جان سے ماردینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

اسرائیل میں اس طبقے کے لوگوں کو لازمی فوجی سروس سے بھی استثناء حاصل ہے۔ یہاں بھی مذہبی تعلیم کا حصول ان کی معاونت کرتا ہے۔لیکن کیا مجال کہ کسی مغربی ملک کے پریس یا ابلاغ کے ادارے نے کبھی منہ سے بھاپ بھی نکالی ہو۔

یہودیوں کے مذہبی جنون اور شدت پسندی کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اوپر کسی بھی قسم کے اعتراض سے بچنے کیلئے ''مخالف یہود'' (ANTISEMITISIM) کی اصطلاح کے تحت ایک حفاظتی حصار اس نظریے/ اصول کے تحت مغربی ممالک سے منوایا ہوا ہے جو ان پر بزعم خود جرمنی میں ہٹلر کے ہاتھوں ظلم وستم پر ڈھایا گیا تھا۔اس طرح یہودیوں کے طرز فکر وعمل مذہبی جنون اور شدت پسندی وعقائید پر ہر قسم کی تنقید ایک قابل تعزیر جرم سمجھا جاتا ہے!

یہود کا مذہبی جنون اور صنف نازک:

ذیل میں ہم ان کٹر متشدد یہودیوں کے مذہبی جنون کے بارے میں چند مزید حقائق پیش کر رہے ہیں۔صنف نازک کے بارے میں دنیا کے موجودہ مسخ شدہ الہامی مذاہب (یہودیت، نصرانیت) اور قدیم تہذیبوں میں نہایت حقیر اور ہتک آمیز تصورات پائے

جاتے رہے ہیں۔ روم و یونان اور ہندوستان و مصر کی قدیم تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے ہاں عورت کے اولین گناہ یعنی جنت میں حضرت آدمؑ کو ورغلا کر ممانعت کردہ درخت کا پھل کھلانے کا نتیجہ ہیں۔ ان دونوں کو سزا کے طور پر اور شیطان کو حضرت حوا کو پھل کھانے کی ترغیب دینے پر دنیا میں بھیج دیا گیا اگرچہ قران اس کی تردید کرتا ہے۔ یہود و نصارٰ دونوں آجتک عورت کی تحقیر اور اپنے دیرینہ خیالات پر نہایت سختی سے جمے ہوئے ہیں۔ یہ امر بہت سے لوگوں کیلیے حیرت وتعجب کا باعث ہوگا کہ امریکی شہر نیویارک میں یہودیوں کے یہ دونوں متشدد طبقے صنف نازک کے بارے میں کیا کہتے ہیں وہ درج ذیل واقعات سے واضح ہوتا ہے۔

☆عورت ناپاک اور اس کا جسم غلیظ ہے۔ ان کا وجود شرمناک ہے اور انہی صفات کے بنا پر وہ فطری طور پر مجسم بدی ہیں

☆عورت پر قابو پانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کر کے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرے۔۔۔۔۔۔ یہ خیالات چند انٹرویوز، کتابوں اور ڈاکومنٹری فلموں سے لیے گئے ہیں۔ جو یوٹیوب سے باآسانی دیکھے جا سکتے ہیں۔جس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

1۔ امریکی شہر نیویارک کے علاقے (بروک لین) کی رہنے والی ایک خاتون ڈیبرا فلڈ مین DEBRA FELDMAN نے جرمن سٹیٹ ٹیلی ویژن کو ایک انٹرویو دیا۔ جو یوٹیوب چینل پر ۲۹ جولائی ۲۰۱۹ میں نشر ہوا اور یہ ایک بڑی تعداد میں شائع ہونے والی کتاب (UNORTHODOX) میں شائع ہوا یہ خاتون بروکلین کے اسی تشدد ترین فرقے میں پیدا ہوئی۔ اس کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جو ہنگری میں ہولوکاسٹ (قتل عام یہود کی اصطلاح) کے پسماندگان سے تعلق رکھتا تھا۔ ان لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ہٹلر کا یہ ظالمانہ قتل عام دراصل عذاب خداوندی کا ایک کوڑا تھا جو یہودیوں کی پیٹھ پر برسا۔ اس فرقے کے مطابق تورات کے احکامات کی نافرمانی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے

بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ تورات کی تعلیمات پر من وعن سختی کے ساتھ عمل کیا جائے اس فرقہ کا یہ خودساختہ عقیدہ ہے کہ خداایک ایسی ہستی ہے جو کسی انسان کی غلطی پر اسے سزا دینے کیلیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔اس خاتون نے اس معاشرے کوایک نہایت تندخواور سخت گیر ماحول والے معاشرے سے تشبیہ دی۔مزید بتایا کہ اس معاشرے میں عورت کے وجود کو بدی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔جس پر قابو پانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ اپنی فطری برائی کو زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کر کے دور کرے۔اس خاتون نے مزید انکشاف کیا کہ اس عقیدے کی بناء پراس معاشرے میں ایک عورت کومجبور کیا جاتا ہے کہ وہ 10 سے 20 بچے پیدا کرے۔اس خاتون نے اس سخت گیر معاشرے سے بھاگ کر جرمنی کے شہر برلن میں پناہ حاسل کر لی۔

☆ اسی طرح کی ایک کہانی (ETLY AUSCH) نامی خاتون کی ہے۔جو بروکلین کے اسی فرقے میں پیدا ہوئی۔یہ کہانی ایک ڈاکومنٹری فلم سے اخذ کردہ ہے جو میگن کیلیے (MEGAN KELLY) کے مشہور زمانہ پروگرام میں یوٹیوب پر 30 مئی 2018 کو پوسٹ کیا گیا۔اس عورت کی جبری شادی ایک ایسے شخص کیساتھ کردی گئی جسے وہ جانتی تک نہ تھی۔مزید یہ کہ شادی کیوقت اسے جنسی جبلت اور عائلی زندگی میں زوجین کے درمیان تعلقات کی نوعیت کا قطعاً کوئی علم نہ تھا (اس کٹر فرقے کے اپنے بچوں کی تربیت یہودی اسکولوں میں بیرونی ماحول سے مکمل طور پر کاٹ کر پڑھانے کا ذکر کیا جاچکا ہے)۔تا ہم 27 سال کی عمر تک اس کے ہاں سات بچے پیدا ہو چکے تھے۔۔۔اس واقعہ کواس نے جنسی تشدد کی بدترین شکل قرار دیا اور خودکشی کا ارادہ کیا۔اسے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ وہاں اس نے اپنے فرقے اور خاوند سے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا۔خاوند اس فیصلے سے اس پر بہت غصہ ہوااور قتل کی دھمکی دی۔وہ عورت عدالت میں گئی۔وہاں سے خاوند کوگھر سے نکلنے کی سزا ہوئی لیکن۔۔۔۔ابھی اس کے خاوند کوگھر چھوڑے۔ایک ہی گھنٹہ گزرا تھا کہ 20 مذہبی غنڈوں نے حملہ کر کے اس کے گھر کے دروازے توڑ ڈالے اور اس کے بچوں کو اغوا

کرنا چاہا۔اسی خوف سے وہ کئی دن تک باہر نکل کر روزانہ استعمال کا گھریلو سامان بھی نہ خرید سکی۔بلآخر اس نے اپنی نوکری سے استعفیٰ دیا اور اپنی نیز اپنے بچوں کی سلامتی کیلیے اس علاقے/ محلے کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ رہنا شروع کیا لیکن اس یہودی فرقے نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور بچوں کی واپسی کے لیے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا مبادا ماں بچوں کو کافر وملحد بنا دے(یہودیت سے اخراج)۔وہ مقدمہ ہار گئی اور یوں وہ اپنے بچوں کو کھو بیٹھی۔بعد میں وہ امریکہ ہی میں کسی اور جگہ بطور(HOMO SEXUAL)زندگی بسر کرنے پر پر مجبور ہوگئی۔

☆ تیسری کہانی بھی DEFENDERS نامی ایک ڈاکومنٹری فلم سے ہے۔جسے (FRAIDAY REISS)نامی خاتون نے یوٹیوب چینل پر 31اگست 2018 کو پیش کیا۔اس کی شادی بھی نوعمری میں اس کی مرضی کے خلاف کر دی گئی۔جس کا فیصلہ بقول اس کے" کسی دوسرے SOME ONE ELSE)") نے کیا۔انیس سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ایک ہفتے کہ اندر ہی خاوند نے اسے جان سے مار دینے کی دھمکی دی۔اس نے اس یہودی فرقے کی بستی سے بھاگ جانے کا پروگرام بنایا لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا۔کسی شخص نے بھی اسکی مدد نہ کی۔اسے سختی کے ساتھ اسی معاشرے میں رہنے کی ہدایت کی۔۔۔۔۔ بلآخر 27 سال کی عمر میں اس نے" (بیڑیوں سے آزاد UNCHAINED)نامی ایک این جی او بنائی تاکہ وہ امریکہ میں انتہا پسند متشدد یہودی فرقے میں جبری شادی کے ظلم وستم کی شکار لڑکیوں کی مدد کر سکے۔

☆ چوتھی کہانی ڈاکٹر نینسی سینڈر نامی خاتون نے یوٹیوب پر 23 جون 2013 کو پوسٹ کی۔یہ دو لڑکیوں کی کہانی ہے جنہوں نے بروکلین محلے میں اس یہودی فرقے کی تشدد پر مبنی سماجی زندگی کے خلاف بغاوت کی۔انھوں نے اپنی آپ بیتی یوں بیان کی کہ اس فرقے کے کسی بچے کو ٹی وی تک رسائی نہیں ہوتی۔کسی کو فلم دیکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔شادیاں اس طریق پر کی جاتی ہیں کہ کسی نے یک دوسرے کو دیکھا نہیں ہوتا۔بچپن ہی سے

انہیں منع کیا جاتا ہے کہ وہ (DINOSAUR) کے بارے میں گفتگو نہ کریں۔ان کیلیے کائنات (UNIVERSE اور جیمینزم) جیسے موضوعات پر گفتگو کرنے کی اجازت نہ تھی۔ انہیں ڈارون کی تھیوری پڑھنے کی بھی ممانعت تھی۔

☆ پانچویں کہانی امریکہ کے مشہور ترین اور نامی گرامی (WINFREY OPERA) کے میڈیا ایگزیکٹو کی روایت کردہ ہے جس نے بروکلین میں ایک متشدد یہودی گھرانے خاندان سے انٹرویولیا۔ یہ کہانی بھی یوٹیوب 13 فروری سنہ 2012 پر پوسٹ کی گئی۔اس کے بقول" یہ متمول خاندان چھ سے آٹھ بچوں پر مشتمل تھا جو اپنے والدین کیساتھ رہتے ہیں۔ان کی عمریں 2 سے 14 سال کی تھیں۔ان میں سے کسی نے بھی ٹی وی یا کوئی فلم نہیں دیکھی تھی۔صرف ان کی ماں کے پاس ایک موبائل فون تھا۔ان بچوں کو میڈیا کی اہمیت اور فوائید کے بارے میں قطعاً کوئی علم نہ تھا۔وہ کسی اداکار یا اداکارہ کا نام تک نہ جانتے تھے۔ان کی ماں نے انہیں ہدایت کی تھی کہ وہ دنیاوی آرام وآسائش کا خیال نہ کریں اور اپنی معاشرتی زندگی صبر واطمینان سے بسر کریں۔اس جوڑے نے بتایا کہ ہر ماہ میں دوہفتوں کے لیے وہ ایک دوسرے کے" قریب" نہیں جا سکتے جس کے بعد عورت کو غسل کرنا چاہیے ایک روحانی علاج کے طور پر اس سے قبل کہ وہ ایک دوسرے کیساتھ اختلاط کریں۔

یہ چند مثالیں بطور مشت از خروارے دی گئی ہیں جبکہ اسطرح کے سینکڑوں واقعات انٹرنیٹ سے تلاش کیے جا سکتے ہیں ان سے یہ نتیجہ نکالنا تو مناسب نہیں کہ انہیں کسی ایک مذہبی فرقہ کے عقائد واعمال سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ یا یہ کہ ان واقعات کو دنیا کے کسی پسماندہ ملک یا مسلمانوں کے کھاتے میں ڈال دیا جائے ۔ یہ تمام واقعات امریکہ جیسے ماڈرن ملک کے نہایت دولتمند شہر نیویارک کے ایک محلے میں متشدد ترین کٹر یہودی خاندانوں سے متعلق ہیں جو تعلیم اور اپنی دولت کے لحاظ سے نمایاں ترین حیثیت کے حامل ہیں جو ایک ایسے زمانے میں روا رکھے جا رہے ہیں جسے مساوات مرد وزن کا نعرہ بلند کرنے

کا شرف ہی حاصل نہیں بلکہ اقوام متحدہ کا صدر دفتر بھی یہاں واقع ہے۔ جہاں سے تمام دنیا کو معاشرتی زندگی میں مساوات مرد وزن اور نہ معلوم کیا کیا خلاف فطرت پروگرام تشکیل پاتے ہیں لیکن حال یہ ہے کہ امریکن قوم کا باشعور طبقہ، دولتمند لوگ، عیسائی مذہبی عوام، سیاسی پارٹیاں اور برسر اقتدار طبقہ کسی کو بھی یہ حقائق نظر نہیں آتے ۔۔۔ان سب کی تان اگر ٹوٹتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر۔ 11 / 9 کا واقعہ ہو تو مسلمان ذمہ دار اور اگر کسی گورے/میم کو چھینک آ جائے تو بھی مسلمان موردالزام ٹھرائے جاتے ہیں۔

تیری زلف پہ پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو میرے نامۂ سیاہ میں تھی

دنیا میں ہزاروں تنظیمیں انسانی ہمدردی اور نہ معلوم کن کن نعروں کی آڑ میں کام کر رہی ہیں لیکن کسی کو ہندوستان میں بالخصوص مقبوضہ کشمیر میں 70 سالوں سے ظلم وستم کی چکی میں پسنے والا خون مسلم نظر نہیں آتا۔ علم بھی وجہ البصیرت یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ مقبوضہ کشمیر میں مسلمانوں کے قتل عام کی جو کوششیں گزشتہ 70 سال بالخصوص دس مہینوں میں جو کھیل کھیلا جا رہا ہے، اس کی پشت پر بھی یہودی دماغ کام کر رہا ہے، انہوں نے جس طریق پر فلسطین کی سرزمین پر مغربی ممالک اور امریکہ کی حمایت اور دورے جس طرح اسرائیلی ریاست کی بیاد ڈالی ہے، انہوں نے ہندوؤں کے کٹر طبقے (مودی حکومت) کو بھی یہ سبق پڑھایا ہے کہ وہ اس طرح مکمل مقبوضہ کشمیر اور بعد ازاں ہندوستان میں (جس کی شروعات دہلی کے خونی فسادات سے) شروع ہو چکی ہیں جاری رکھنے سے مسلمانوں کا قلع قمع کر سکیں گے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ دنیا کے انصاف پسند لوگ اس صورت حال کا نہایت سنجیدگی سے نوٹس لیں اور تمام دنیا کے انسانوں کو اپنے بنائے ہوئے اصولوں وقوانین، اخلاق کے، مسلمہ روایات کے تحت ہر قسم کے تعصب (مذہب، رنگ ونسل، علاقہ، زبان، ترقی یافتہ/ پسماندہ اقوام وغیرہ) سے بالاتر ہو کر انسان کی حیثیت سے یکساں طور پر سلوک کرنے کا عہد کریں۔ اس ضمن میں ہم اپنے تعلیم یافتہ مسلمان بھائی بہنوں سے بھی جو کسی

بھی ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اپیل کریں گے۔ کہ وہ بھی اپنے اپنے مذمومہ خیالات کے خول سے باہر آئیں اوران حالات پر بالکل مثبت انداز میں غور کریں اور مغربی مما لک میں پائے جانے والے اس قسم کی متشدد کاروائیوں اور ظلم وستم کے خلاف اس سونامی میں اپنا وزن حق وانصاف سچائی اور صداقت کا علم بلند کرنے میں اپنا حصہ شامل کریں!

سعودی عرب اور امریکہ تعلقات: تاریخ کے آئینے میں!

یہودیوں کی انہی ریشہ دوانیوں جس کے ذریعے انہوں نے فلسطین میں ایک اسرائیلی ریاست قائم کرلی ہے، تاریخ کے صفحات سے ہم نے ایک دستاویز تلاش کی ہے۔ اسے بھی ملاحظہ فرمائیں۔

روزنامہ نوائے وقت کی اشاعت ۲۹ نومبر ۲۰۱۱ء کا ایک کالم ''کنکریاں'' کے نام سے ایک کالم نگار عباس اطہر صاحب کا لکھا ہوا ہے، ذیل درج کررہے ہیں جس کا مقصد نہ صرف اس امر کی وضاحت کرنا ہے کہ امریکہ صاحب کے دل میں عرصہ دراز سے یہود کی محبت کس انداز سے جاگزیں رہی ہے بلکہ ہم سعودی عرب کے موجودہ حکمرانوں کی توجہ بھی اس جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے آباء واجداد کے اس کھرے اور مبنی برحق موقف سے دستبردار ہوکر دنیا میں عزت واحترام نہیں کما سکیں گے—— تاریخ میں ملک عبدالعزیز آل سعود اور شاہ فیصل کا نام ہی سنہرے حروف میں لکھا جائے گا کہ

انہیں کا کام ہے یہ، حوصلے ہیں جن کے زیاد!

روزنامہ نوائے وقت 2001-11-29

سراب اور حقائق

عباس اطہر

پچھلے پچاس ساٹھ سال میں اس زمین پر مسلمانوں کے خلاف جو ظلم برپا ہوئے اور جتنا خون بہا اس میں بنیادی تنازعہ یہودیوں نے پیدا کیا۔ امریکہ اور یورپی اقوام ان کی

پشت پر تھیں۔ آج کے صدر بش اور 1948ء کے صدر ٹرومین کے رویئے ایک جیسے تھے۔ ٹرومین دور میں بھی امریکہ اپنی طاقت پر آج جتنا ہی مان تھا اور وہ دنیا کو یہودیوں کے حق میں ڈکٹیٹ کرتا تھا۔ عربوں اور فلسطینیوں نے برتر اور مہلک اسلحہ کے خلاف لڑتے ہوئے مسلسل نقصانات اٹھائے۔ یہ سلسلہ ابھی تک مشرق وسطیٰ میں جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گا جب تک ہم مسلمان سرابوں کے کھنڈرات سے نکل کر حقائق کی دنیا میں واپس نہیں آجاتے۔

اوکاڑہ سے ابوحیدر آصف فاروق صاحب نے 1948ء کے دور کے دو مطبوعہ خطوط کی فوٹو کاپیاں مجھے بھیجی ہیں۔ پہلا خط 10 فروری 1948ء کو صدر ٹرومین نے سعودی عرب کے فرمانروا ملک عبدالعزیز آل سعود کو لکھا۔ جوابی خط پر 10 ربیع الثانی 1367ء کی تاریخ درج ہے۔ **گویا شاہ عبدالعزیز نے انگریزی تاریخ درج کرنے کی مروت بھی مناسب نہ سمجھی۔** صدر ٹرومین کے خط کے چند اقتباسات حسب ذیل ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ اب ہمارے تعلقات اس قدر مضبوط ہو چکے ہیں کہ دونوں میں کسی ایک ملک میں ہونے والے ہر خوشگوار و ناخوشگوار واقعہ کی صدائے بازگشت دوسرے ملک میں سنائی دیتی ہے۔ میں نے یہ مناسب سمجھا کہ عالمی سلامتی اور ایک ستائی ہوئی مظلوم قوم کے نام پر آپ سے مدد طلب کروں تاکہ یہود کے درمیان برپا خانہ جنگی کو روکنے میں اپنا اثر ورسوخ استعمال کر سکیں اور عرب قوم کو اپنے ہم وطن یہودیوں کے ساتھ مصالحت پر آمادہ کرلیں۔ ہٹلر کے دور میں یہودیوں نے جو عذاب جھیلے کیا وہ ان کے لئے کافی نہیں کہ اب بھی وہ ستائے جاتے رہیں۔ عربوں کا یہ انداز اقوام متحدہ شامل تمام مملکوں کے خلاف جس میں سرفہرست آپ کا ملک آتا ہے، سرکشی اور زیادتی کے مترادف ہے۔

''جس بات کا مجھے ڈر ہے وہ یہ کہ کہیں مختلف ممالک متحدہ طور پر ان بغاوت کرنے والوں کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کی خلاف ورزی کرنے پر درست کرنے کے لئے ان پر فوج کشی نہ کردیں جس سے آپ کی قوم کی ہزاروں جانوں کے تلف ہوجانے کا خدشہ ہے۔

تاریخ آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ آپ اپنی قوم کے لوگوں کو جنگ کی تکالیف سے بچا لیجیے اور مجبور و مظلوم اسرائیلی قوم کو سکھ کا سانس لینے کا موقع فراہم کیجیے۔''

جوابی خط میں شاہ عبدالعزیز نے لکھا:

''میں جوں جوں آپ کے خط کی عبارت سنتا رہا، اسی طرح میری حیرت اور استعجاب میں اضافہ ہوتا رہا کہ آپ نے کس طرح یہودی قوم کے باطل کو حق ثابت کرنے کی کوشش میں مجھ جیسے عربی بادشاہ کے بارے میں یوں بدگمانی کر لی۔''

''فلسطین میں جاری جنگ کوئی داخلی جنگ نہیں جیسا کہ آپ کا خیال ہے، بلکہ یہ اس کی اصل حقدار عرب قوم اور ان صیہونی جنگجوؤں کے درمیان جاری لڑائی ہے جو عالمی سلامتی کا دعویٰ کرنے والے چند ایک ملکوں کی مدد سے فلسطین کو تقسیم کر کے اس پر قبضہ جمانے کی کوشش میں ہیں۔ قرارداد جس کو مختلف ملکوں سے منظور کروانے میں آپ کا رول نمایاں رہا ہے یہ محض ظلم و ناانصافی پر مبنی قرارداد ہے۔

یاد رکھئے کہ یہ اقتصادی مفادات میرے نزدیک پر کاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتے، میں ان اقتصادی مفادات کو قربان کر سکتا ہوں مگر مجھے یہ منظور نہیں کہ اس کے بدلے فلسطین کی ایک بالشت زمین بھی مجرم یہودیوں کے ہاتھوں فروخت کر دوں۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر گواہ ہے کہ میں تیل کے ان کنوؤں کو بند کر سکتا ہوں، تیل کے یہ کنویں اللہ تعالیٰ کی دو نعمتیں ہیں جو اس نے آج ہم پر جاری فرمائی ہیں لہٰذا ہم ان کو کبھی بھی عذابِ الٰہی میں تبدیل کرنا نہیں چاہتے۔ میں نے اس سے قبل کئی دفعہ ساری دنیا پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ میں اپنے تمام بیٹوں سمیت فلسطین کے لئے لڑنے مرنے پر تیار ہوں، پھر اس کے باوجود میرے لیے تیل کے یہ کنویں میری اپنی جان اور میری اولاد سے کیسے عزیز ہو سکتے ہیں۔''

آخر میں صاحب صدر! میں آپکو یاد دلاتا چلوں کہ جن تجارتی اشیا کی بنیاد پر ہمارے مابین اقتصادی تعلقات قائم ہیں، یہ وہ مال ہے کہ دنیا کی مارکیٹ میں اس کے فروخت

کرنے والے بہت کم ہیں لیکن اس کے خریدنے والے بہت زیادہ ہیں۔

یہ دونوں خطوط تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں اور وقت نے ثابت کیا ہے کہ امریکہ یورپ اور اسرائیل کی جنگی طاقت کے سامنے نہتے عربوں اور فلسطینیوں کے نعرے نہیں ٹھہر سکے۔

موجودہ دور میں یہودی ریاست کا قیام اور اس کی مسلم دشمن کارروائیاں

تاریخی طور پر یہود کو فلسطین میں آباد کرنے کی جن کوششوں میں مغرب اور امریکہ گذشتہ ۳/۴ صدیوں سے ''بے تاب'' نظر آرہے ہیں، اس کا بھی ایک جائزہ ہم سید مودودی کی کتاب ''یہودی، قرآن کی روشنی میں'' (2018) سے نقل کررہے ہیں کہ ہماری معلومات کی حد تک اس قسم کا نہایت معقول اور مدلل بیان، ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ اس کا مقصد امت مسلمہ بالخصوص نوجوان نسل کو آگاہ کرنا ہے کہ وہ قرآن کریم میں یہود کے مکروہ چہرے کو تاریخ کا ایک باب سمجھ کر اسے نظر انداز نہ کردیں بلکہ دراصل اسے ان مکروہ اور انسانیت کش کارروائیوں کا ایک تسلسل اور شاخسانہ ہی سمجھیں جو یہود کو حضور ﷺ کے مشن سے تھا اور جسے وہ آج بلکہ مستقبل میں بھی جاری رکھنے کا فاسد داعیہ رکھتے ہیں!

تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں!

یہاں ہم یہ امر بھی واضح کردینا چاہتے ہیں کہ یہود اور مغربی طاقتوں بشمول امریکہ کی اس ہلہ شیری کو دیکھتے ہوئے ہی نہیں بلکہ ایک امرِ واقعہ کے طور پر اس وقت، ہندوستان کی حکومت جس انداز میں عرصہ نو ماہ سے زائد مقبوض کشمیر میں اور دہلی میں قتل و غارت کا طوفان برپا کیے ہوئے ہیں، اس کے پیچھے بھی یہود کا دماغ اور مدد شامل حال ہے۔ ہندوستان کی موجودہ حکومت کو یہود کی جانب سے یہ باور کرایا گیا ہے کہ جس طرح ہم نے گذشتہ ۳/۴ صدیوں میں فلسطین پر قبضہ کیا ہے، تمہارے لیے بھی اس میں ایک مثال ہے۔ اس طریق پر مسلم کش اقدامات کے نتیجے میں، ہندوستان اور مقبوض کشمیر سے مسلمانوں کی نسل کشی کی جاسکتی ہے!

یہودی ریاست کے قیام کا پس منظر

یہودی عزائم کی تاریخ:

بیت المقدس اور فلسطین کے متعلق آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تقریباً ۱۳۰۰ قبل مسیح میں بنی اسرائیل اس علاقے میں داخل ہوئے تھے اور دو صدیوں کی مسلسل کشمکش کے بعد بالآخر اس پر قابض ہو گئے تھے۔ وہ اس سرزمین کے اصل باشندے نہیں تھے۔ قدیم باشندے دوسرے لوگ تھے جن کے قبائل اور اقوام کے نام خود بائبل میں تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور بائبل ہی کی تصریحات سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے ان قوموں کا قتل عام کر کے اس سرزمین پر اسی طرح قبضہ کیا تھا جس طرح فرنگیوں نے سرخ ہندیوں (Red Indians) کو فنا کر کے امریکا پر قبضہ کیا۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ خدا نے یہ **ملک ان کی میراث میں دے دیا ہے، اس لیے انھیں حق پہنچتا ہے کہ اس کے اصل باشندوں کو بے دخل کر کے بلکہ ان کی نسل کو مٹا کر اس پر قابض ہو جائیں۔**

اس کے بعد آٹھویں صدی قبل مسیح میں اسیریا نے شمالی فلسطین پر قبضہ کر کے اسرائیلیوں کا بالکل قلع قمع کر دیا اور ان کی جگہ دوسری قوموں کو لا بسایا جو زیادہ تر عربی النسل تھیں۔ پھر چھٹی صدی قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے جنوبی فلسطین پر قبضہ کر کے تمام یہودیوں کو جلاوطن کر دیا، بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور ہیکل سلیمانی (Temple of Solomon) کو، جسے دسویں صدی قبل مسیح میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کرایا تھا، اس طرح پیوند خاک کر دیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ قائم نہ رہی۔ ایک طویل مدت کی جلاوطنی کے بعد ایرانیوں کے دورِ حکومت میں یہودیوں کو پھر سے جنوبی فلسطین میں آ کر آباد ہونے کا موقع ملا اور انھوں نے بیت المقدس میں دوبارہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی۔ لیکن یہ دوسرا وقفہ بھی تین چار سو برس سے زیادہ دراز نہ ہوا۔ ۷۰ء میں یہودیوں نے رومی سلطنت کے خلاف بغاوت کی جس کی پاداش میں بیت المقدس کے شہر اور

ہیکل سلیمانی کو بالکل مسمار کر دیا گیا، اور پھر ایک دوسری بغاوت کو کچل کر ۱۳۵ء میں رومیوں نے پورے فلسطین سے یہودیوں کو نکال باہر کیا۔ اس دوسرے اخراج کے بعد جنوبی فلسطین میں بھی اس طرح عربی النسل قبائل آباد ہو گئے جس طرح شمالی فلسطین میں وہ آٹھ سو برس پہلے آباد ہوئے تھے۔ اسلام کی آمد سے پہلے یہ پورا علاقہ عربی قوموں سے آباد تھا، بیت المقدس میں یہودیوں کا داخلہ تک رومیوں نے ممنوع کر رکھا تھا، اور فلسطین میں بھی یہودی آبادی قریب قریب بالکل ناپید تھی۔ اس تاریخ سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ

۱۔ یہودی ابتداء نسل کشی (Genocide) کے مرتکب ہو کر فلسطین پر زبردستی قابض ہوئے تھے۔

۲۔ شمالی فلسطین میں صرف چار پانچ سو برس تک آباد رہے۔

۳۔ جنوبی فلسطین میں ان کے قیام کی مدت زیادہ سے زیادہ آٹھ نو سو برس رہی۔

۴۔ اور عرب شمالی فلسطین میں ڈھائی ہزار سال سے، اور جنوبی فلسطین میں تقریباً دو ہزار سال سے آباد چلے آرہے ہیں۔ **لیکن اس کے باوجود یہودیوں کا آج بھی یہ دعویٰ ہے کہ فلسطین ان کے باپ دادا کی میراث ہے جو خدا نے انھیں عطا فرمائی ہے اور انھیں حق پہنچتا ہے کہ اس میراث کو بزور حاصل کر کے اس علاقے کے قدیم باشندوں کو اسی طرح نکال باہر کریں اور خود ان کی جگہ بس جائیں جس طرح تیرہ سو برس قبل مسیح میں انھوں نے کیا تھا۔**

دو ہزار برس سے دنیا بھر کے یہودی ہفتے میں چار مرتبہ یہ دعائیں مانگتے رہے ہیں کہ بیت المقدس پھر ہمارے ہاتھ آئے اور ہم ہیکل سلیمانی کو پھر تعمیر کریں۔ ہر یہودی گھر میں مذہبی تقریبات کے موقع پر اس تاریخ کا پورا ڈراما کھیلا جاتا ہے کہ ہم مصر سے کس طرح نکلے اور فلسطین میں کس طرح آباد ہوئے اور کیسے بابل والے ہم کو لے گئے اور ہم کس طرح سے فلسطین سے نکالے گئے اور تتر بتر ہوئے۔ اس طرح یہودیوں کے بچے بچے کے دماغ میں یہ بات ۲۰ صدیوں سے بٹھائی جارہی ہے کہ فلسطین تمہارا ہے اور تمھیں واپس ملنا ہے اور

تمہارا مقصد زندگی یہ ہے کہ تم بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کو پھر تعمیر کرو۔ بارھویں صدی عیسوی کے مشہور یہودی فلسفی موسیٰ بن میمون (Maimonides) نے اپنی کتاب قانونِ یہود (The Code of Jewish) میں صاف صاف لکھا ہے کہ ہر یہودی نسل کا یہ فرض ہے کہ وہ بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کو ازسرِ نو تعمیر کرے۔ مشہور فری میسن تحریک (Freemason Movement) بھی، جس کے متعلق ہمارے ملک کے اخبارات میں قریب قریب سارے ہی حقائق اب شائع ہو چکے ہیں۔ اصلاً ایک یہودی تحریک ہے اور اس میں بھی ہیکل سلیمان کی تعمیر نو کو مقصود قرار دیا گیا ہے بلکہ پوری فری میسن تحریک کا مرکزی تصور یہی ہے اور تمام فری میسن لاجوں میں اس کا باقاعدہ ڈراما ہوتا ہے کہ کس طرح سے ہیکل سلیمانی کو دوبارہ تعمیر کرنا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ میں آگ لگنا کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے۔ صدیوں سے یہودی قوم کی زندگی کا نصب العین یہی رہا ہے کہ وہ مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمانی کو تعمیر کرے، اور اب بیت المقدس پر ان کا قبضہ ہو جانے کے بعد یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے اس نصب العین کو پورا کرنے سے باز رہ جائیں۔

یہودیوں کی احسان فراموشی

آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک بات کی اور وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہیکل سلیمانی کے متعلق یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ اسے ۷۰ء میں بالکل مسمار کر دیا گیا تھا اور عمرؓ کے زمانے میں جب بیت المقدس فتح ہوا اس وقت یہاں یہودیوں کا کوئی معبد نہ تھا بلکہ کھنڈر پڑے ہوئے تھے۔ اس لیے مسجد اقصیٰ اور قبۂ صخرہ کی تعمیر کے بارے میں کوئی یہودی یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ ان کے کسی معبد کو توڑ کر مسلمانوں نے یہ مساجد بنائی تھیں۔ یہ بات بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ رومیوں کے زمانے میں فلسطین یہودیوں سے خالی کرا لیا گیا تھا اور بیت المقدس میں تو ان کا داخلہ بھی ممنوع تھا۔ یہ مسلمانوں کی شرافت تھی کہ انھوں نے پھر انھیں وہاں رہنے اور بسنے کی اجازت دی۔ تاریخ اس بات پر بھی شاہد ہے کہ پچھلی تیرہ چودہ صدیوں میں یہودیوں کو اگر کہیں امن نصیب ہوا ہے تو وہ صرف مسلمان ملک

تھے، ورنہ دنیا کے ہر حصے میں جہاں بھی عیسائیوں کی حکومت رہی وہاں وہ ظلم وستم کا نشانہ ہی بنتے رہے۔ یہودیوں کے اپنے مؤرخین اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی تاریخ کا سب سے زیادہ شاندار دور وہ تھا جب وہ اندلس میں مسلمانوں کی رعایا کی حیثیت سے آباد تھے۔ یہ دیوارگریہ جس کو آج یہودی اپنی سب سے بڑی مقدس یادگار سمجھتے ہیں، یہ بھی مسلمانوں ہی کی عنایت سے انھیں ملی تھی۔ بمبئی سے اسرائیلی حکومت کا ایک سرکاری بلیٹن News From Israel شائع ہوتا ہے۔ اس کی یکم جولائی ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ دیوارِگریہ پہلے ملبےاور کوڑے کرکٹ میں دبی ہوئی تھی اور اس کا کوئی نشان تک لوگوں کو معلوم نہ تھا۔ سولہویں صدی عیسوی میں سلطان سلیم عثمانی کو اتفاقاً اس کے وجود کا علم ہوا اور اس نے اس جگہ کو صاف کرا کے یہودیوں کو ان کی زیارت عطا کی لیکن یہودی ایک ایسی احسان فراموش قوم ہے کہ مسلمانوں کی شرافت اور فیاضی اور حسن سلوک کا بدلہ آج اس شکل میں ان کو دے رہی ہے۔

یہودیوں کی منصوبہ بندی

اب میں مختصر طور پر آپ کو بتاؤں گا کہ ان ظالموں نے کس طرح باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے فلسطین اور بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لیے کام کیا ہے۔ سب سے پہلے ان کے ہاں ایک تحریک شروع ہوئی کہ مختلف علاقوں سے یہودی ہجرت کر کے فلسطین میں جا کر آباد ہوں اور وہاں زمینیں خریدنی شروع کریں۔ چنانچہ ۱۸۸۰ء سے اس مہاجرت کا سلسلہ شروع ہوا اور زیادہ تر مشرقی یورپ سے یہودی خاندان وہاں منتقل ہونے لگے۔ اس کے بعد مشہور یہودی لیڈر تھوڈور ہرتزل (Hartzl) نے ۱۸۹۷ء میں صیہونی تحریک (Zionist Movement) کا باقاعدہ آغاز کیا اور اس میں اس بات کو مقصود قرار دیا گیا کہ فلسطین پر دوبارہ قبضہ حاصل کیا جائے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی جائے۔ یہودی سرمایہ داروں نے اس غرض کے لیے بڑے پیمانے پر مالی امداد فراہم کی کہ فلسطین منتقل ہونے والے یہودی خاندان وہاں زمینیں خریدیں اور منظم طریقے سے اپنی بستیاں بسائیں۔ پھر

۱۹۰۱ء میں ہرتزل نے سلطان عبدالحمید خاں (سلطان ترکی) کو باقاعدہ یہ پیغام بھجوایا کہ یہودی ترکی کے تمام قرضے ادا کرنے کو تیار ہیں، آپ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی اجازت دے دیں۔ مگر سلطان عبدالحمید خاں نے اس پیغام پر تھوک دیا اور صاف کہہ دیا کہ ''جب تک میں زندہ ہوں اور جب تک ترکی سلطنت موجود ہے اس وقت تک اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ فلسطین یہودیوں کے حوالے کیا جائے۔ تمہاری ساری دولت پر میں تھوکتا ہوں۔'' جس شخص کے ہاتھ یہ پیغام بھیجا گیا تھا اسکا نام حاخام قرہ صوآفندی تھا۔ یہ سالونیکا کا یہودی باشندہ تھا اور ان یہودی خاندانوں میں سے تھا جو اسپین سے نکالے جانے کے بعد ترکی میں آباد ہوئے تھے۔ ترکی رعایا ہونے کے باوجود اس نے یہ جرأت کی کہ سلطان ترکی کے دربار میں پہنچ کر فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ پیش کر دے۔ اس پیر بس نہیں، بلکہ سلطان عبدالحمید خاں کا جواب سن کر ہرتزل کی طرف سے ان کو صاف صاف یہ دھمکی دے دی گئی کہ تم اس کا برا نتیجہ دیکھو گے۔ چنانچہ اس کے بعد فوراً ہی سلطان عبدالحمید کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازشیں شروع ہو گئیں جن میں فری میسن، دُنمہ، ◆ اور وہ مسلمان نوجوان شریک تھے جو مغربی تعلیم کے زیر اثر آ کر ترکی قوم پرستی کے علمبردار بن گئے۔ ان لوگوں نے ترکی فوج میں اپنے اثرات پھیلائے اور سات سال کے اندر ان کی سازشیں پختہ ہو کر اس منزل پر پہنچ گئیں کہ سلطان عبدالحمید کو معزول کر دیں۔ اس موقع پر جو انتہائی عبرتناک واقعہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ ۱۹۰۸ء میں جو تین آدمی سلطان کی معزولی کا پروانہ لے کر ان کے پاس گئے تھے ان میں دو ترک تھے اور تیسرا وہی حاخام قرہ صوآفندی تھا جس کے ہاتھ ہرتزل سے فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ سلطان کے پاس بھیجا تھا۔ مسلمانوں کی بے غیرتی کا اس سے اندازہ کیجیے کہ اپنے سلطان کی معزولی کا پروانہ بھیجتے بھی ہیں تو ایک ایسے یہودی کے ہاتھ جو سات ہی برس پہلے اسی سلطان کے پاس

◆ یہ وہ یہودی تھے جنھوں نے ریاکارانہ اسلام قبول کر رکھا تھا۔ ترک ان کو دونمہ کہتے ہیں۔

فلسطین کی حوالگی کا مطالبہ لے کر گیا تھا اور اس سے سخت جواب سن کر آیا تھا۔ ذرا تصور کیجیے کہ سلطان کے دل پر کیا گزری ہوگی جب وہی یہودی ان کی معزولی کا پروانہ لیے ہوئے ان کے سامنے کھڑا تھا۔

بین الاقوامی صورتِ حال

ترکی اور عربی قوم پرستی کا تصادم

اسی زمانے میں ایک دوسری سازش بھی زور شور سے چل رہی تھی جس کا مقصد ترکی سلطنت کے ٹکڑے اُڑانا تھا اور اس سازش میں بھی مغربی سیاست کاروں کے ساتھ ساتھ یہودی دماغ ابتداء سے کارفرما رہا۔ ایک طرف ترکوں میں یہ تحریک اٹھائی گئی کہ وہ سلطنت کی بنا اسلامی اخوت کے بجائے ترکی قوم پرستی پر رکھیں، حالانکہ ترکی سلطنت میں صرف ترک ہی آباد نہیں تھے بلکہ عرب اور کُرد اور دوسری نسلوں کے مسلمان بھی تھے۔ ایسی سلطنت کو صرف ترکی قوم کی سلطنت قرار دینے کے صاف معنی یہ تھے کہ تمام غیر ترک مسلمانوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ختم ہو جائیں۔ دوسری طرف عربوں کو عربی قومیت کا سبق پڑھایا گیا اور ان کے دماغ میں یہ بات بٹھائی گئی کہ وہ ترکوں کی غلامی سے آزاد ہونے کی جدوجہد کریں۔ عربوں میں اس عرب قوم پرستی کا فتنہ اٹھانے والے عیسائی عرب تھے، بیروت اس کا مرکز تھا، اور بیروت کی امریکن یونیورسٹی اس کو فروغ دینے کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ اس طرح ترکوں اور عربوں میں بیک وقت دو متضاد قسم کی قوم پرستیاں اُبھاری گئیں اور ان کو یہاں تک بھڑکایا گیا کہ ۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگ عظیم برپا ہوئی تو ترک اور عرب ایک دوسرے کے رفیق ہونے کے بجائے دشمن اور خون کے پیاسے بن کر آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔

جنگ عظیم اوّل اور اعلانِ بالفور

پہلی جنگ عظیم میں ابتداء یہودیوں نے حکومت جرمنی سے معاملہ کرنا چاہا تھا، کیونکہ

جرمنی میں اس وقت یہودیوں کا اتنا ہی زور تھا جتنا آج امریکہ میں پایا جاتا ہے۔انھوں نے قیصر ولیم سے یہ وعدہ لینے کی کوشش کی کہ وہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنوا دے گا۔لیکن جس وجہ سے یہودی اس پر یہ اعتماد نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ایسا کرے گا، وہ یہ تھی کہ ترکی حکومت اس وقت جنگ میں جرمنی کی حلیف تھی۔ یہودیوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ قیصر ولیم ہم سے یہ وعدہ پورا کر سکے گا۔اس موقع پر ڈاکٹر وائزمین آگے بڑھا اور اس نے انگلستان کی حکومت کو یہ یقین دلایا کہ جنگ میں تمام دنیا کے یہودیوں کا سرمایہ اور تمام دنیا کے یہودیوں کا دماغ اور ان کی ساری قوت انگلستان اور فرانس کے ساتھ آسکتی ہے۔**اگر آپ ہم کو یہ یقین دلا دیں کہ آپ فتح یاب ہو کر فلسطین کو یہودیوں کا قومی دن بنا دیں گے۔ڈاکٹر وائزمین ہی اس وقت یہودیوں کے قومی وطن کی تحریک کا علمبردار تھا۔** آخر اس نے ۱۹۱۷ء میں انگریزی حکومت سے وہ مشہور پروانہ حاصل کیا جو اعلانِ بالفور کے نام سے مشہور ہے۔ یہ انگریزوں کی بددیانتی کا شاہکار ہے کہ ایک طرف وہ عربوں کو یقین دلا رہے تھے کہ ہم عربوں کی ایک خود مختار ریاست بنائیں گے اور اس غرض کے لیے انھوں نے شریف حسین کو تحریکی وعدہ دے دیا تھا اور اسی وعدے کی بنیاد پر عربوں نے ترکوں سے بغاوت کر کے فلسطین اور عراق اور شام پر انگلستان کا قبضہ کرا دیا تھا۔دوسری طرف وہی انگریز یہودیوں کو باقاعدہ یہ تحریر دے رہے تھے کہ ہم فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنائیں گے۔ یہ اتنی بڑی بے ایمانی تھی کہ جب تک انگریزی قوم دنیا میں موجود ہے وہ اپنی تاریخ پر سے اس کلنک کے ٹیکے کو نہ مٹا سکے گی۔ پھر ذرا غور کیجیے کہ فلسطین کو یہود کا قومی وطن بنانے کے آخر معنی کیا تھے؟ کیا فلسطین کوئی خالی پڑی ہوئی زمین تھی جس پر کسی قوم کو آباد کر دینے کا وعدہ کیا جا رہا تھا؟ وہاں دو اڑھائی ہزار برس سے ایک قوم آباد چلی آ رہی تھی۔اعلانِ بالفور کے وقت وہاں یہودیوں کی آبادی پوری ۵ فیصدی بھی نہ تھی۔ایسے ملک کے متعلق سلطنت برطانیہ کا وزیر خارجہ یہ تحریری وعدہ دے رہا تھا کہ ایک قوم کے وطن میں ایک دوسری قوم کا وطن بنایا جائے گا جو دنیا بھر میں ۱۹ سو برس سے بکھری ہوئی تھی۔اس

کا صاف مطلب گویا یہ وعدہ کرنا تھا کہ ہم تمھیں موقع دیں گے کہ عربوں کے جس وطن پر ہم نے خود عربوں کی مدد سے قبضہ کیا ہے اس سے تم انھی عربوں کو نکال باہر کرو اور ان کی جگہ دنیا کے گوشے گوشے سے اپنے افراد کو لا کر بسا دو۔ یہ ایک ایسا ظلم تھا جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس زخم پر نمک پاشی یہ ہے کہ لارڈ بالفور نے اپنے اس خط کے متعلق اپنی ڈائری میں یہ الفاظ لکھے تھے:

> **''ہمیں فلسطین کے متعلق کوئی فیصلہ کرتے ہوئے وہاں کے موجودہ باشندوں سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صیہونیت ہمارے لیے ان سات لاکھ عربوں کی خواہشات اور تعصّبات سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جو اس قدیم سرزمین میں اس وقت آباد ہیں۔''**

بالفور کی ڈائری کے یہ الفاظ آج بھی برطانوی پالیسی کی دستاویزات (Documents of British Policy) کی جلد سوم میں ثبت ہیں۔

مجلس اقوام کی کارگزاری

فلسطین پر انگریزوں کے قبضے اور لارڈ بالفور کے اعلان سے یہودیوں کے طویل المیعاد منصوبے کا پہلا مرحلہ مکمل ہو گیا۔ ۱۸۸۰ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۷ء تک اس مرحلے کی تکمیل میں ۳۷ سال صرف ہوئے۔ اس کے بعد اس منصوبے کا دوسرا دور شروع ہوا جس میں مجلس اقوام (League of Nations) اور اس کی اصل کارفرما دو بڑی طاقتوں برطانیہ اور فرانس نے بالکل اس طرح کام کیا گویا وہ آزاد سلطنتیں نہیں ہیں بلکہ محض صیہونی تحریک کی ایجنٹ ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں مجلس اقوام نے فیصلہ کیا کہ فلسطین کو انگریزوں کے انتداب ◆ (Mendate) میں دے دیا جائے۔ اس موقع پر فلسطین میں جو مردم شماری

◆ انتداب کا مطلب یہ ہے کہ ایک حکومت بطورِ خود کسی مُلک کی فرمانروائی نہیں کر رہی ہے بلکہ مجلس اقوام کی طرف سے اس کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ وہ وہاں خاص شرائط کے تحت فرمانروائی کرے۔

کرائی گئی تھی اس میں مسلمان عرب ۶۶۰۶۴۱، عیسائی عرب ۶۴۱۴۷ اور یہودی ۸۲۷۹۰ تھے، اور یہودیوں کی اتنی آبادی بھی اس وجہ سے تھی کہ وہ دھڑا دھڑا وہاں جا کر آباد ہو رہے تھے۔ ◆ اس پر بھی مجلس اقوام نے برطانیہ کو انتداب کا پروانہ دیتے ہوئے پوری بےشرمی کے کے ساتھ یہ ہدایت کی کہ اس کی یہ ذمہ داری ہو گی کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کے لیے ہر طرح کی آسانیاں فراہم کرے، صیہونی تنظیم کو سرکاری طور پر باقاعدہ تسلیم کر کے اسے نظم و نسق میں شریک کرے اور اس کے مشورے اور تعاون سے یہودی قومی وطن کی تجویز کو عملی جامہ پہنائے۔ اس کے ساتھ وہاں کے قدیم اور اصل باشندوں کے لیے صرف اتنی ہدایت پر اکتفا کیا گیا کہ ان کے مذہبی اور مدنی (Civil) حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ سیاسی حقوق کا اس میں سرے سے کوئی ذکر نہ تھا۔ یہ تھا اس مجلس اقوام کا انصاف جسے دنیا میں امن قائم کرنے کا نام لے کر وجود میں لایا گیا تھا۔ اس نے یہودیوں کو باہر سے لا کر بسائے جانے والوں کو تو سیاسی اقتدار میں شریک کر دیا، اور ملک کے اصل باشندوں کو اسکا مستحق بھی نہ سمجھا کہ ان کے سیاسی حقوق کا برائے نام بھی تذکرہ کر دیا جاتا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس وقت دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں اور مجلس اقوام میں یہودیوں نے کتنے اثرات پیدا کر لیے تھے جن کی بدولت فلسطین کو انگریزوں کے ابتداب میں دیتے ہوئے یہ ہدایت جاری کی گئی تھیں۔

انگریزی انتداب کا کارنامہ

یہ انتداب حاصل کرنے کے بعد یہودیوں کو فلسطین میں لا کر بسانے کا باقاعدہ سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ فلسطین کا پہلا برطانوی ہائی کمشنر سر ہربرٹ سیمول خود ایک یہودی تھا۔ صیہونی تنظیم کو عملاً حکومت کے نظم و نسق میں شریک کیا گیا اور اس کے سپرد نہ صرف تعلیم اور زراعت کے محکمے کیے گئے بلکہ بیرونی ممالک سے لوگوں کے داخل، سفر اور قومیت کے

◆ ۱۹۱۷ء میں یہودی آبادی صرف ۵۶ ہزار تھی۔ پانچ سال کے اندر وہ بڑھ کر ۸۳ ہزار کے قریب پہنچ گئی۔

معاملات بھی اس کے حوالے کر دیے گئے۔ ایسے قوانین بنائے گئے جن کے ذریعے سے باہر کے یہودیوں کو فلسطین میں آ کر زمینیں حاصل کرنے کی پوری سہولتیں دی گئیں۔ مزید برآں ان کو زمینیں کاشت کرنے کے لیے قرضوں اور تقاوی اور دوسری سہولتیوں سے بھی نوازا گیا۔ عربوں پر بھاری ٹیکس لگائے گئے اور ٹیکسوں کے بقایا پر ہر بہانے عدالتوں نے زمینیں ضبط کرنے کی ڈگریاں دینی شروع کر دیں۔ ضبط شدہ زمینیں یہودیوں کے ہاتھ فروخت کی گئیں اور سرکاری زمینوں کے بھی بڑے بڑے رقبے یہودی نوآبادکاروں کو کہیں مفت اور کہیں برائے نام پٹے پر دے دیے گئے۔ بعض مقامات پر کسی نہ کسی بہانے پورے پورے گاؤں صاف کر دیے گئے اور وہاں یہودی بستیاں بسائی گئیں۔ ایک علاقے میں تو ۸ ہزار عرب کاشتکاروں اور زراعتی کارکنوں کو ۵۰ ہزار ایکڑ زمین سے حکماً بے دخل کر دیا گیا اور ان کو فی کس ۴ پونڈ دس شلنگ دے کر چلتا کر دیا گیا۔ ان تدبیروں سے ۱۷ سال کے اندر یہودی آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں وہ ۸۲ ہزار سے کچھ زائد تھے۔ ۱۹۳۹ء میں ان کی تعداد ساڑھے چار لاکھ تک پہنچ گئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انگریز فلسطین میں صرف صیہونیت کی خدمت سرانجام دیتے رہے اور ان کے ضمیر نے ایک دن بھی ان کو یہ احساس نہ دلایا کہ کسی ملک کی حکومت پر اس کے اصل باشندوں کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں جن کی نگہداشت کرنا اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔

جنگ عظیم دوم کے زمانے میں معاملہ اس سے بہت آگے بڑھ گیا۔ ہٹلر کے مظالم سے بھاگنے والے یہودی ہر قانونی اور غیر قانونی طریقے سے بے تحاشا فلسطین میں داخل ہونے لگے۔ صیہونی ایجنسی نے ان کو ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ملک کے اندر گھسانا شروع کیا اور مسلح تنظیمیں قائم کیں جنھوں نے ہر طرف مار دھاڑ کر کے عربوں کو بھگانے اور یہودیوں کو ان کی جگہ بسانے میں سفاکی کی حد کر دی۔ انگریزی انتداب کی ناک کے نیچے یہودیوں کو ہر طرح کے ہتھیار پہنچ رہے تھے کے جواب میں مدافعت کرنے سے روک رہا تھا۔ البتہ برطانوی حکومت جان بچا کر بھاگنے والے عربوں کو نقل مکانی کی سہولتیں فراہم

کرنے میں بڑی فراخ دلی تھی۔ اس طرح ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ۳۰ سال کے اندر یہودی منصوبے کا دوسرا مرحلہ مکمل ہوا جس میں وہ اس قابل ہو گئے کہ فلسطین کو یہودیوں کا ''قومی وطن'' بنانے کے بجائے ان کی ''قومی ریاست'' قائم کر دیں۔

یہودیوں کا آئندہ لائحہ عمل

''قومی وطن'' سے ''قومی ریاست'' تک

۱۹۴۷ء میں برطانوی حکومت نے فلسطین کا مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش کر دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجلس اقوام (لیگ آف نیشنز) نے صیہونیت کی جو خدمت ہمارے سپرد کی تھی وہ ہم انجام دے چکے ہیں۔ اب آگے کا کام اس آنجہانی مجلس کی نئی جانشین اقوام متحدہ انجام دے۔ اب ملاحظہ کیجیے کہ یہ دوسری مجلس جو دنیا میں امن و انصاف کے قیام کی علم بردار بن کر اٹھی تھی، اس نے فلسطین میں کیا انصاف کیا۔

نومبر ۱۹۴۷ء میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فلسطین کو یہودیوں اور عربوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ یہ فیصلہ ہوا کس طرح؟ اس کے حق میں ۳۳ ووٹ اور اس کے خلاف ۱۳ ووٹ تھے۔ دس ملکوں نے کوئی ووٹ نہیں دیا۔ یہ کم سے کم اکثریت تھی جس سے جنرل اسمبلی میں کوئی ریزولیوشن پاس ہو سکتا تھا۔ چند روز پہلے تک اس تجویز کے حق میں اتنی اکثریت بھی نہ تھی۔ صرف ۳۰ ملک اس کے حق میں تھے۔ آخر کار امریکا نے غیر معمولی دباؤ ڈال کر ہائٹی، فلپائن اور لائبیریا کو مجبور کر کے اس کی تائید کرائی۔ یہ بات خود امریکن کانگریس کے ریکارڈ پر موجود ہے کہ یہ تین ووٹ زبردستی حاصل کیے گئے تھے اور جیمز فوریسٹائل (Forrestal) اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ ''اس معاملہ میں دوسری قوموں پر دباؤ ڈالنے اور ان کو ووٹ دینے پر مجبور کرنے کے لیے جو طریقے استعمال کیے گئے وہ شرمناک کارروائی (Scandal) کی حد تک پہنچے ہوئے تھے۔''

تقسیم کی جو تجویز ان ہتھکنڈوں سے پاس کرائی گئی اس کی رُو سے فلسطین کا ۵۵ فی

صدی رقبہ ۳۳ فی صدی یہودی آبادی کو، اور ۴۵ فی صدی رقبہ ۶۷ فی صدی عرب آبادی کو دیا گیا۔ حالانکہ اس وقت تک فلسطین کی زمین کا صرف ۶ فی صدی یہودیوں کے قبضے میں آیا تھا۔ یہ تھا اقوامِ متحدہ کا انصاف!

لیکن یہودی اس بندر بانٹ سے بھی راضی نہ ہوئے اور انھوں نے مار دھاڑ کر کے عربوں کو نکالنا اور ملک کے زیادہ سے زیادہ حصے پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں جو مظالم عربوں پر کیے گئے، **آرنلڈ ٹائن بی ان کے متعلق اپنی کتاب (A Study of History) میں کہتا ہے کہ کسی طرح بھی ان مظالم سے کم نہ تھے جو نازیوں نے خود یہودیوں پر کیے تھے۔ دیر یاسین میں ۹، اپریل ۱۹۴۸ء کے قتل عام کا خاص طور پر اس نے ذکر کیا ہے جس میں عرب عورتوں، بچوں اور مردوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتارا گیا، عرب عورتوں اور لڑکیوں کا برہنہ جلوس سڑکوں پر نکالا گیا اور یہودی موٹروں پر لاؤڈ سپیکر لگا کر جگہ جگہ یہ اعلان کرتے پھرے کہ ''ہم نے دیر یاسین کی عرب آبادی کے ساتھ یہ اور یہ کیا ہے، اگر تم نہیں چاہتے کہ تمہارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو تو یہاں سے نکل جاؤ۔'' ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ کیا یہ کسی ایسی قوم کا کارنامہ ہو سکتا ہے جس میں رمق برابر بھی شرافت وانسانیت موجود ہو؟**

ان حالات کے دوران میں ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو عین اس وقت جب کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی فلسطین کے مسئلے پر بحث کر رہی تھی، یہودی ایجنسی نے رات کے دس بجے اسرائیلی ریاست کے قیام کا باقاعدہ اعلان کر دیا، اور سب سے پہلے امریکا اور روس نے آگے بڑھ کر اس کو تسلیم کیا، حالانکہ اس وقت تک اقوامِ متحدہ نے یہودیوں کو فلسطین میں اپنی قومی ریاست قائم کرنے کا مجاز نہ کیا تھا۔ اس اعلان کے وقت تک ۶ لاکھ سے زیادہ عرب گھر سے بے گھر کیے جا چکے تھے، اور اقوامِ متحدہ کی تجویز کے بالکل خلاف یروشلم (بیت المقدس) کے آدھے سے زیادہ حصے پر اسرائیل قبضہ کر چکا تھا۔

ریاست اسرائیل کے قیام کا اعلان ہونے کے بعد گردو پیش کی عرب ریاستوں نے بے سہارا عرب آبادی کو مار دھاڑ اور لوٹ مار سے بچانے کے لیے مداخلت کی اور ان کی فوجیں فلسطین میں داخل ہوگئیں۔لیکن یہودی اس وقت تک اتنے طاقت ور ہو چکے تھے کہ **یہ سب ریاستیں مل کر بھی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ بلکہ جب نومبر ۱۹۴۸ء میں اقوامِ متحدہ نے جنگ بندی کا فیصلہ کیا اس وقت تک فلسطین کے رقبے کا ۷۷ فیصدی سے بھی کچھ زیادہ حصہ یہودیوں کے قبضے میں جا چکا تھا۔سوال یہ ہے کہ یہودیوں کو اتنی جنگی طاقت کس نے فراہم کر کے دی تھی کہ پانچ عرب ریاستوں کی متحدہ طاقت بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکی؟** اس طاقت کے فراہم کرنے میں سرمایہ داری نظام اور اشترا کی نظام دونوں شریک تھے،اور سب سے زیادہ ہتھیار اس جنگ کے لیے چیکوسلوواکیا سے آئے تھے جو آج خود ظلم وستم کا شکار ہے۔اقوامِ متحدہ میں بھی جو بحثیں اس زمانے میں ہوئیں ان کا ریکارڈ شاہد ہے کہ یہودیوں کی حمایت اور عربوں کی مخالفت میں مغربی سرمایہ دارانہ نظام اور اشترا کی نظام، دونوں کے وہ صرف چار پانچ دن کے اندر اپنے گردوپیش کی تمام عرب ریاستوں کو لپیٹ لے گا۔سیاسی حیثیت سے ہر موقع پر امریکا اور اس کے ساتھی اس کی پشت پناہی کرتے رہے اور انھی کی حمایت کی وجہ سے اقوام متحدہ اس کی پے در پے زیادتیوں کا کوئی تدارک نہ کر سکی۔نومبر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک اقوامِ متحدہ کے ۲۸ ریزولیوشن وہ اسکے منہ پر مار چکا تھا۔ستمبر ۱۹۴۸ء سے نومبر ۱۹۶۶ء تک ۷ مرتبہ اقوام متحدہ نے اس کے خلاف مذمت کی قراردادیں پاس کیں مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی ۔اس کے بے باکی کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد جب جنرل اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے والا تھا اس وقت اسرائیل کے وزیر اعظم لیوی اشکول نے علی الاعلان یہ کہا کہ ''اگر اقوام متحدہ کے ۱۲۲ ممبروں میں سے ۱۲۱ بھی فیصلہ دے دیں اور تنہا اسرائیل کا اپنا ووٹ ہی ہمارے حق میں رہ جائے،تب بھی ہم اپنے مفتوحہ علاقے سے نہ نکلیں گے۔'' یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ امریکا اور اسکے

ساتھیوں کی حمایت کے بل پر اسرائیل تمام دنیا کی رائے کو ٹھوکر پر مارتا ہے اور اقوامِ متحدہ اس کے مقابلے میں قطعی بے بس ہے۔

امریکا کی دلچسپی اسرائیل کے ساتھ کتنی بڑھی ہوئی ہے، اس کو جاننے کے لیے آپ ذرا اُس رویے پر ایک نگاہ ڈال لیں جو جون ۱۹۶۷ء کے موقع پر اس نے اختیار کیا تھا۔ جنگ سے ایک ہفتہ پہلے امریکی فوج کے جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کے صدر جنرل ہیلر نے صدر جانسن کو اطمینان دلایا تھا کہ اگر اسرائیل بڑھ کر پہلے ایک کامیاب ہوائی حملہ کر دے تو پھر زیادہ سے زیادہ تین چار دن کے اندر وہ عربوں کو مار لے گا۔ لیکن اس رپورٹ پر بھی جانسن صاحب پوری طرح مطمئن نہ ہو سکے اور انھوں نے سی آئی اے کے چیف رچرڈ ہیلمس (Helms) سے رپورٹ طلب کی۔ جب اس نے بھی ہیلر کے اندازوں کی توثیق کر دی تو جانسن صاحب نے روس کی طرح رجوع کر کے یہ اطمینان حاصل کیا کہ وہ عربوں کی مدد کے لیے عملاً کوئی مداخل نہ کرے گا۔ اس کے بعد کہیں جا کر اسرائیل پر ''وحی'' ◆ نازل ہوئی کہ اب عرب ملکوں پر حملہ کر دینے کا مناسب موقع آ گیا ہے۔ اس پر بھی امریکا چھٹا بحری بیڑا مصر و اسرائیل کے سواحل کے قریب اپنی پوری طاقت کے ساتھ مستعد کھڑا تھا تا کہ بوقت ضرورت کام آ سکے۔

انگریزوں کی اسرائیل نوازی کا حال یہ تھا کہ ان کا ایک طیارہ بردار بحری جہاز مالٹا میں اور دوسرا عدن میں ایک منٹ کے نوٹس پر اسرائیل کی مدد پر حرکت کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ جنگ کے بعد لنڈن سنڈے ٹائمز نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا (The Holy War - June 67) اس کا جو باب بیت المقدس پر یہودی قبضے کے بیان میں ہے ان کا عنوان رکھا گیا (Back After 896 Years) یعنی ''۸۹۶ برس کے بعد واپسی'' اب یہ ظاہر ہے کہ

◆ اس لفظ پر چونکیے نہیں۔ شیاطین بھی اپنے اولیاء پر ''وحی'' کیا کرتے تھے۔

۸۹۶ سال پہلے بیت المقدس پر سے صلیبی عیسائیوں کا قبضہ اٹھا تھا نہ کہ یہودیوں کا۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسرائیل کے ساتھ انگریزوں کی ہمدردی میں صلیبی جذبہ کام کررہا تھا اور اس لڑائی کو وہ صلیبی جنگوں ہی کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔

روس کی عرب دوستی کا حال بھی یہ تھا کہ جس صبح کو مصر کے ہوائی اڈوں پر اسرائیل کا حملہ ہونے والا تھا اس کی رات کو روس نے صدر ناصر کو اطمینان دلایا تھا کہ کوئی حملہ ہونے والا نہیں ہے۔ یہ ویسی ہی یقین دہانی تھی جیسی ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہم کو کرائی گئی تھی کہ ہندوستان بین الاقوامی سرحد پار نہ کرے گا! عربوں کے ساتھ کے رویے پر **یوگوسلاویہ کے ایک ڈپلومیٹ کا یہ تبصرہ بڑا سبق آموز ہے کہ ''ایک بڑی طاقت جب تمہارا ساتھ چھوڑتی ہے تو وہ تم کو پیراشوٹ کے بغیر ہوائی جہاز سے گرا دیتی ہے۔''**

یہ ہیں وہ اسباب جن کی وجہ سے یہودیوں کا تیسرا منصوبہ بھی کامیاب ہو گیا اور بیت المقدس سمیت پورا فلسطین جزیرہ نمائے سینا سمیت ان کے ہاتھ آ گیا۔

یہودیوں کا چوتھا منصوبہ

اب درحقیقت جس چیز سے دنیائے اسلام کو سابقہ درپیش ہے وہ یہودیوں کا چوتھا اور آخری منصوبہ ہے جس کے لیے وہ ہزار سال سے بے تاب تھے اور جس کی خاطر وہ ۹۰ سال سے باقاعدہ ایک اسکیم کے مطابق کام کرتے رہے ہیں۔

اس منصوبے کے اہم ترین اجزاء دو ہیں۔ ایک یہ کہ مسجد اقصیٰ اور قبۂ صخرہ کو ڈھا کر ہیکل سلیمانی پھر سے تعمیر کیا جائے، کیونکہ اس کی تعمیر ان دونوں مقاماتِ مقدسہ کو ڈھائے بغیر نہیں ہوسکتی۔ دوسرے یہ کہ اس پورے علاقے پر قبضہ کیا جائے جسے اسرائیل اپنی میراث سمجھتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس منصوبے کے ان دونوں اجزاء کو ہر مسلمان اچھی طرح سمجھ لے۔

جہاں تک پہلے جز کا تعلق ہے اسرائیل اسے عملی جامہ پہنانے پر اسی وقت قادر ہو چکا

تھا جب بیت المقدس پر اس کا قبضہ ہوا تھا۔لیکن دو وجوہ سے وہ اب تک اس کام میں تامل کرتا رہا ہے۔ایک وجہ یہ ہے کہ اسے اور اس کے سرپرست امریکا کو دنیائے اسلام کے شدید ردِعمل کا اندیشہ تھا۔دوسرے یہ کہ خود یہودیوں کے اندر مذہبی بنیاد پر اس مسئلے میں اختلاف برپا ہے۔ان کے ایک گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ ہیکل کی تعمیر نو مسیح ہی آ کر کرے گا، جب تک وہ نہ آ جائے ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔ ❶ یہ ان کے قدامت پسند گروہ کا خیال ہے۔دوسرا گروہ وہ جو شدت پسند ہے، اور جس کے ہاتھ میں دراصل اس وقت اسرائیل کے اقتدار کی باگیں ہیں، کہتا ہے کہ قدیم بیت المقدس اور دیوارِ گریہ پر قبضہ ہو جانے کے بعد ہم دورِ مسیحائی (Messianic Era) میں داخل ہو چکے ہیں۔یہی بات یہودی فوج کے چیف ربی ❷ نے تورات ہاتھ میں لے کر اس روز کہہ دی تھی جب بیت المقدس کی فتح کے بعد وہ دیوارِ گریہ کے سامنے کھڑا تھا۔اس کے الفاظ یہ تھے کہ ''آج ہم ملت یہود کے لیے دورِ مسیحائی میں داخل ہو رہے ہیں۔'' انھی دو وجوہ سے مسجد اقصیٰ کو یک لخت ڈھا دینے کے بجائے تمہید کے طور پر اس کو آگ لگائی گئی ہے تا کہ ایک طرف دنیائے اسلام کا ردِعمل دیکھ لیا جائے اور دوسری طرف یہودی قوم کو آخری کارروائی کے لیے بتدریج تیار کیا جائے۔

دوسرا جز اس منصوبے کا یہ ہے کہ ''میراث کے مُلک'' پر قبضہ کیا جائے۔ یہ میراث کا مُلک کیا ہے؟ اسرائیل کی پارلیمنٹ کی پیشانی پر یہ الفاظ کندہ ہیں:

''اے اسرائیل! تیری سرحدیں نیل سے فرات تک ہیں۔''

دنیا میں صرف ایک اسرائیل ہی ایسا مُلک ہے جس نے کھلم کھلا دوسری قوموں کے مُلک

---

❶ واضح رہے کہ مسلمان عیسائی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح مانتے ہیں، مگر یہودی ان کا انکار کرتے ہیں اور وہ ابھی تک مسیح موعود (PROMISED MESSIAH) کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ان کا یہ مسیح موعود وہی ہے جسے حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے مسیح دجال قرار دیا ہے۔

❷ جس طرح ہماری فوج کے ساتھ پیش امام ہوتے ہیں اسی طرح یہودی فوج کے ساتھ ربی ہوتے ہیں، اور ان کے چیف ربی کو اسرائیلی فوج میں بریگیڈیئر جنرل کا رینک حاصل ہے۔

پر قبضہ کرنے کا ارادہ عین اپنی پارلیمنٹ کی عمارت پر ثبت کر رکھا ہے۔ کسی دوسرے ملک نے اس طرح علانیہ اپنی جارحیت کے ارادوں کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اس منصوبے کی جو تفصیل صیہونی تحریک کے شائع کردہ نقشے میں دی گئی ہے اس کی رُو سے اسرائیل جن علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے ان میں دریائے نیل تک مصر، پورا اردن، پورا شام، پورا لبنان، عراق کا بڑا حصہ، ترکی کا جنوبی علاقہ اور جگر تمام کر سینے کہ مدینہ منورہ تک حجاز کا پورا بالائی علاقہ شامل ہے۔ اگر دنیائے عرب اسی طرح کمزور رہی جیسی آج ہے، اور خدانخواستہ دنیائے اسلام کا ردِعمل بھی مسجد اقصیٰ کی آتش زدگی پر کچھ زیادہ مؤثر ثابت نہ ہوسکا، تو پھر خاکم بدہن ہمیں وہ دن بھی دیکھنا پڑے گا جب یہ دشمنانِ اسلام اپنے ان ناپاک ارادوں کو پورا کرنے کے لیے پیش قدمی کر بیٹھیں۔

پس چہ باید کرد؟

اتنی تفصیل میں نے اس لیے بیان کی ہے کہ پیش نظر مسئلے کی پوری نوعیت، نزاکت اور اہمیت اچھی طرح سمجھ لی جائے۔ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، اس سے چند باتیں بخوبی واضح ہوجاتی ہیں:

اوّل یہ کہ یہودی آج تک اپنے منصوبوں میں اس بنا پر کامیاب ہوتے رہے ہیں کہ دنیا کی بڑی طاقتیں ان کی حامی و مددگار بنی رہی ہیں اور ان کی اس روش میں آئندہ بھی کسی تغیر کے امکانات نظر نہیں آتے۔ خصوصاً امریکا کی پشت پناہی جب تک اسے حاصل ہے وہ کسی بڑے سے بڑے جرم کے ارتکاب سے بھی باز نہیں رہ سکتا۔

دوم یہ کہ اشتراکی بلاک سے کوئی امید وابستہ کرنا بالکل غلط ہے۔ وہ اسرائیل کا ہاتھ پکڑنے کے لیے قطعاً کوئی خطرہ مول نہ لے گا۔ زیادہ سے زیادہ آپ اس سے ہتھیار لے سکتے ہیں، اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اشتراکیت کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالیں اور اسلام کو دیس نکالا دے دیں۔

سوم یہ کہ اقوامِ متحدہ ریزولیوشن پاس کرنے سے بڑھ کر کچھ نہیں کرسکتی۔ اس میں یہ دم خم نہیں ہے کہ اسرائیل کو کسی مجرمانہ اقدام سے روک سکے۔

چہارم یہ کہ عرب ممالک کی طاقتیں اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے لیے قطعی ناکافی ہیں۔ پچھلے ۲۲ سال کے تجربات نے یہ بات پوری طرح ثابت کردی ہے۔

ان حقائق کے سامنے آجانے کے بعد نہ صرف مسجد اقصیٰ، بلکہ مدینہ منورہ کو بھی آنے والے خطرات سے بچانے کی صرف ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی طاقت اس یہودی خطرے کا مقابلہ کرنے اور اسلام کے مقاماتِ مقدسہ کو مستقل طور پر محفوظ کردینے کے لیے مجتمع کیا جائے۔ اب تک یہ غلطی کی گئی ہے کہ فلسطین کے مسئلے کو ایک عرب مسئلہ بنائے رکھا گیا۔ دنیا کے مسلمان ایک مدت سے کہتے رہے کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کا مسئلہ ہے مگر بعض عرب لیڈروں کو اس پر اصرار رہا کہ نہیں یہ محض ایک عرب مسئلہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب مسجد اقصیٰ کے سانحہ سے ان کی آنکھیں بھی کھل گئیں اور ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہے کہ صیہونیت کی عظیم الاقوامی سازش کا مقابلہ، جب کہ دنیا کی بڑی طاقتوں کی پوری تائید وحمایت بھی اس کو حاصل ہے، تنہا عربوں کے بس کا روگ نہیں ہے۔ دنیا میں اگر ایک کروڑ ۶۰ لاکھ یہودی ایک طاقت ہیں تو ۵۰۔۵۷ کروڑ مسلمان بھی ایک طاقت ہیں اور ان کی ۳۰۔۳۲ حکومتیں اس وقت انڈونیشیا سے مراکو اور مغربی افریقہ تک موجود ہیں۔ ان سب کے سربراہ اگر سر جوڑ کر بیٹھیں، اور روئے زمین کے ہر گوشے میں بسنے والے مسلمان ان کی پشت پر جان و مال کی بازی لگا دینے کے لیے تیار ہوجائیں تو اس مسئلے کو حل کرلینا کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں جو عالمی کانفرنس بھی ہو اس کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اصل مسئلہ محض مسجد اقصیٰ کی حفاظت کا نہیں ہے۔ مسجد اقصیٰ محفوظ نہیں ہوسکتی جب تک بیت المقدس یہودیوں کے قبضے میں ہے، اور خود بیت المقدس بھی محفوظ نہیں ہوسکتا جب تک فلسطین پر یہودی قابض ہیں۔ اس لیے اصل مسئلہ فلسطین کو یہودیوں کے غاصبانہ تسلط سے

آزاد کرانے کا ہے۔ اوراس کا سیدھا اور صاف حل یہ ہے کہ اعلانِ بالفور سے پہلے جو یہودی فلسطین میں آباد تھے صرف وہی وہاں رہنے کا حق رکھتے ہیں۔ باقی جتنے یہودی ۱۹۱۷ء کے بعد سے اب تک وہاں باہر سے آئے اور لائے گئے ہیں۔ انھیں واپس جانا چاہیے۔ ان لوگوں نے سازش اور جبر وظلم کے ذریعے سے ایک دوسری قوم کے وطن کو زبردستی اپنا قومی وطن بنایا، پھراسے قومی ریاست میں تبدیل کیا، اوراس کے بعد توسیع کے جارحانہ منصوبے بنا کر آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کرنے کا نہ صرف عملاً ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا، بلکہ اپنی پارلیمنٹ کی پیشانی پر علانیہ یہ لکھ دیا کہ کس کس ملک کو وہ اپنی اس جارحیت کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ ایک ایسی کھلی کھلی جارح ریاست کا وجود بجائے خود ایک جرم اور بین الاقوامی امن کے لیے خطرہ ہے اور عالم اسلامی کے لیے اس سے بھی بڑھ کر وہ اس بنا پر خطرہ ہے کہ اسکے ان جارحانہ ارادوں کا ہدف مسلمانوں کے مقامات مقدسہ ہیں۔ اب اس ریاست کا وجود برداشت نہیں کیا جاسکتا، اس کو ختم ہونا چاہیے۔ فلسطین کے اصل باشندوں کی ایک جمہوری ریاست بننی چاہیے، جس میں مُلک کے پرانے یہودی باشندوں کو بھی عرب مسلمانوں اور عیسائیوں کی طرح شہری حقوق حاصل ہوں۔ اور باہر سے آئے ہوئے ان غاصبوں کو نکل جانا چاہیے جو زبردستی اس ملک کو قومی وطن اور قومی ریاست بنانے کے مرتکب ہوئے ہیں۔

اس کے سوا فلسطین کے مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔ رہا امریکا، جو اپنا ضمیر یہودیوں کے ہاتھ رہن رکھ کر اور تمام اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر ان غاصبوں کی حمایت کر رہا ہے، تو اب وقت آ گیا ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان اس کو صاف صاف خبردار کر دیں کہ اس کی یہ روش اگر اسی طرح جاری رہی تو رُوئے زمین پر ایک مسلمان بھی وہ ایسا نہ پائے گا جس کے دل میں اس کے لیے کوئی ادنیٰ درجے کا بھی جذبۂ خیر سگالی باقی رہ جائے۔ اب خود وہ فیصلہ کرلے کہ اسے یہودیوں کی حمایت میں کہاں تک جانا ہے۔

یہودیوں کا مسلمانوں کے ساتھ رویہ

مسلمانوں نے اپنے اخلاق کی جس بلندی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی گرد کو بھی وہ لوگ کبھی نہ پہنچ سکے جو تہذیب و شائستگی کے علم بردار بنے پھرتے ہیں۔ یورپ کی قوموں نے افریقہ، امریکا، ایشیا اور خود یورپ میں مغلوب قوموں کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا ہے مسلمانوں کی تاریخ کے کسی دور میں بھی اس کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی۔ یہ قرآن ہی کی برکت ہے، جس نے مسلمانوں میں اتنی انسانیت پیدا کر دی ہے کہ وہ کبھی غلبہ پا کر اتنے ظالم نہ بن سکے جتنے غیر مسلم تاریخ کے ہر دور میں ظالم پائے گئے اور آج تک پائے جا رہے ہیں۔ کوئی آنکھیں رکھتا ہو تو خود دیکھ لے کہ اسپین میں جب مسلمان صدیوں حکمران رہے، اس وقت عیسائیوں کے ساتھ ان کا کیا سلوک تھا، اور جب عیسائی وہاں غالب آئے تو انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ہندوستان میں آٹھ سو برس کے طویل زمانۂ حکومت میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا اور اب ہندو غالب آ جانے کے بعد ان سے کیا برتاؤ کر رہے ہیں۔ یہودیوں کے ساتھ پچھلے تیرہ سو برس میں مسلمانوں کا رویہ کیا رہا اور اب فلسطین میں مسلمانوں کے ساتھ ان کا کیا رویہ ہے۔

باب پنجم

شرک ــــــ ذہن انسانی کی اختراع

گزشتہ صفحات میں ہم نے چند ادیانِ سماوی کے بارے میں کسی حد تک مطالعہ کیا ہے۔ یہ ایک دلچسپ علمی اور تاریخی حقیقت ہے کہ جہاں ان مذاہبِ الہامی کی بنیادی تعلیمات میں یکسانیت، تسلسل اور ہمہ گیریت پائی جاتی رہی ہے جو آدم علیہ السلام سے لے کر لاکھوں پیغمبروں کی تعلیمات میں نمایاں تھی اور بالآخر نبی آخرالزمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر منتج ہوئی، وہاں انسانوں نے تعلیمات الٰہی سے انکار، تکذیب اور اپنے ذہنی اختراع سے (مختلف عوامل کی بناء پر) مختلف مذاہب کو اختیار کیا، وہ بھان متی کے کنبے کی کہاوت کا ایک شاہکار ہے کہ انسان نے جب کبھی، جہاں اور جس وقت چاہا، زمین و آسمان میں پائے جانے والے مظاہر کائنات میں سے کسی کو اپنا الٰہ بنا لیا اور اس کی پوجا پاٹ شروع کر دی۔ بات اس پر ہی نہیں ختم ہوئی بلکہ اپنے ہاتھوں سے لکڑی، پتھر اور مختلف دھاتوں سے بت گھڑ کر ان کے سامنے بھی سجدہ ریز ہو گیا۔

قرآن کریم نے جہاں تصورِ توحید کے تحت الہ واحد کی پرستش کی ہدایت فرمائی، اس کے بارے میں یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ قرآن کی کوئی آیت/سورت اس تصورِ توحید سے خالی نہیں جبکہ اُسی انداز اور شدت کے ساتھ انسانوں کو شرک کی مختلف اقسام کے بارے میں بھی آگاہ کیا اور واضح کیا کہ توحید باری تعالیٰ کے تصور کے ساتھ کسی دل میں شرک کی آمیزش نہیں ہو سکتی۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے!

اس کتاب کی تالیف کا مقصد، جیسا کہ واضح ہے بنی اسرائیل کے ان جرائم سے آگہی حاصل کرنا، اور یہود کی چار ہزار سالانہ تاریخ میں ان تمام اعمال وافعال کا جائزہ لینا بھی ہے جن کے نتیجے میں بطور امت مسلمہ، ان کی معزولی کا فیصلہ باری تعالیٰ کی جناب سے صادر ہوا اور یوں امت محمدیہ کو اس شرف ومنصب پر معمور کیا گیا۔ تاہم اس ضمن میں قرآن کریم کے مطالعے سے انسانوں کے خودساختہ مراسمِ شرک کے بارے میں بھی جو تفصیلات معلوم ہوئی ہیں، ضرورت محسوس ہوئی کہ انہیں الہامی مذاہب (باب چہارم) کے علی الرغم ایک علیحدہ باب کی شکل میں مرتب کریں تا کہ امت محمدیہ کو معلوم ہو کہ شرک کیا ہے اور اس کی وجہ سے ان کی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اس تاریخی حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک تمام انبیائے کرام (بشمول بنی اسرائیل/ یہودیت/ نصرانیت) اور بالخصوص امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک عظیم اکثریت آج بھی شرک کی کسی نہ کسی شکل میں مبتلا ہے اور بزعم خود اس امر پر مطمئن اور شاداں۔ تاہم اپنے دامن پہ اس داغ ندامت کے ساتھ وہ کیوں کر اور کس طرح روزِ قیامت، رسول آخری الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے دعویدار ہوں گے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس امر کی وضاحت فرمادی ہے کہ ہر گناہ معاف ہوسکتا ہے سوائے شرک!

ذیل کے صفحات میں ہم قرآن کریم کی ان آیاتِ ربانی کا ایک مختصر مطالعہ کریں گے جس سے اس تصور کی شناعت اور مسلمانوں میں اس کے دوررس مضمرات کا علم ہو سکے گا اور مزید یہ امر کہ آخر قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے کیوں اس کی اتنی مذمت فرمائی ہے؟

شرک کی ابتدا:

شرک کے بارے میں سید مودودیؒ نے اپنی تفسیر میں یوں وضاحت کی کہ خداوند عالم نے جب اس زمین پر انسان کو اپنے خلیفہ کے طور پر بھیجا تو تو اسے اچھی طرح یہ بات ذہن نشین کرادی تھی کہ تمہارا اور کُل جہاں کا مالک، معبود اور حاکم میں ہوں۔ میری سلطنت میں نہ تم خودمختار ہو، نہ کسی دوسرے کے بندے ہو، اور نہ میرے سوا کوئی تمہاری اطاعت و بندگی

اور پرستش کا مستحق ہے۔انہوں نے اپنی اولاد کو یہی بات سکھائی کہ وہ مطیع خدا (مسلم) بن کر رہیں لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ انسان صحیح طریق زندگی (دین) سے منحرف ہو گیا۔ انہوں نے غفلت سے اس کو گم بھی کیا اور شرارت سے اس کو مسخ بھی کر ڈالا۔ انہوں نے خدا کے ساتھ زمین وآسمان کی مختلف انسانی اورغیر انسانی، خیالی اور مادی ہستیوں کو خدائی میں شریک ٹھہرالیا۔(مفہوم مقدمہ تفہیم القرآن)

سورہ البقرہ کی آیات نمبر ۲۱۳ میں انسانوں کے درمیان، دینی امور میں اختلاف ہونے کے بارے میں راہ نمائی دی کہ''حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے'' (ترجمہ)......اس کی تشریح سید مودودیؒ نے ان الفاظ میں کی ''کہ ناواقف لوگ جب اپنے قیاس وگمان کی بنیاد پر''مذہب'' کی تاریخ مرتب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ انسان نے اپنی زندگی کی ابتدا،شرک کی تاریکیوں سے کی، پھر تدریجاً ارتقاء کے ساتھ ساتھ تاریکی چھٹتی اور روشنی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ آدمی توحید کے مقام پر پہنچا۔ قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں انسان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں ہوا ہے۔اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جس انسان کو پیدا کیا تھا اس کو یہ بھی بتادیا تھا کہ حقیقت کیا ہے اور تیرے لیے صحیح راستہ کون سا ہے۔اس کے بعد ایک مدت تک نسل آدم راہِ راست پر قائم رہی اور ایک امت بنی رہی۔ پھر لوگوں نے نئے نئے راستے نکالے اور مختلف طریقے ایجاد کر لیے۔اس وجہ سے نہیں کہ ان کو حقیقت نہیں بتائی گئی تھی، بلکہ اس وجہ سے کہ حق کو جاننے کے باوجود لوگ اپنے جائز حق سے بڑھ کر امتیازات،فوائد اور منافع حاصل کرنا چاہتے تھے اور آپس میں ایک دوسرے پر ظلم،سرکشی اور زیادتی کرنے کے خواہش مند تھے۔اس خرابی کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو مبعوث کرنا شروع کیا۔ یہ انبیاء اس لیے نہیں بھیجے گئے تھے کہ ہر ایک اپنے نام سے ایک نئے مذہب کی بناء ڈالے اور اپنی ایک نئی امت (یہودیت،عیسائیت،نصرانیت) بنالے۔ بلکہ ان کے بھیجے جانے کی غرض یہ تھی کہ لوگوں کے سامنے اس کھوئی ہوئی راہ حق کو واضح کر کے انہیں پھر سے ایک

امت (مسلمہ) بنا دیں'' (حاشیہ نمبر ۲۳۰)

سورہ البقرہ کی آیت ۲۱۳ کی تشریح میں پیر محمد کرم شاہؒ نے اپنی تفسیر (۱۹۹۵) کے حاشیہ نمبر ۲۶۶ میں تفسیر ماجدی کے حوالے سے مختلف مغربی پروفیسروں کے حوالے سے اس امر کی تائید کی ہے کہ ''انسان کا دین اولین دین توحید تھا'' اسی تسلسل میں آیا ۲۱۴ کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ ''مسلمانوں کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ ''اس اختلاف اور فرقہ بندی سے اپنا دامن بچانا۔ جن حالات سے پہلی امتوں کو واسطہ پڑا تمہیں بھی ان کا سامنا کرنا ہوگا، ایسے فتنہ باز تم میں بھی پیدا ہوں گے جو اپنے ذاتی وقار اور اپنی ناموری کے لئے قرآن کے نام پر ملت کے اتحاد کو پارہ پارہ کریں گے تم ان کے جال میں نہ پھنسنا۔ اگر تم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ اسلام میں داخل ہو جانے کے بعد اب تم پر جنت کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں تو اس خام خیالی سے باز آجاؤ۔ خوب کان کھول کر سن لو، ہوش ربا مصیبتیں، کڑی آزمائشیں اور لرزہ خیز امتحانات تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ اس وقت اگر تم ثابت قدم رہے اور صبر کا دامن مضبوطی سے پکڑے رکھا تو اللہ کی مدد تمہاری دستگیری کو یقیناً آئے گی'' (حاشیہ ۲۷۰)

شرک کی مختلف صورتیں:

قرآن کریم کے مطالعہ سے سورۂ الانعام آیت نمبر ۱۵۱ کی تشریح میں شرک کی مختلف اقسام کا ذکر یوں ملتا ہے:

☆......''ذات میں شرک یہ ہے کہ جوہر اُلوہیت میں کسی کو حصہ دار قرار دیا جائے۔ مثلاً نصاریٰ کا عقیدۂ تثلیث، مشرکین عرب کا فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دینا اور دُوسرے مشرکین کا اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کو اور اپنے شاہی خاندانوں کو جنس آلہہ کے افراد قرار دینا۔ یہ سب شرک فی الذات ہیں۔''

☆......''صفات میں شرک یہ ہے کہ خدائی صفات جیسی کہ وہ خدا کے لیے ہیں، ویسا ہی اُن کو یا اُن میں سے کوئی صفت کسی دُوسرے کے لیے قرار دینا۔ مثلاً کسی کے متعلق یہ سمجھنا کہ اس پر غیب کی ساری حقیقتیں روشن ہیں، یا وہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے، یا وہ تمام

نقائص اور تمام کمزوریوں سے منزہ اور بالکل بے خطا ہے۔''

☆......''اختیارات میں شرک یہ ہے کہ خدا ہونے کی حیثیت سے جو اختیارات صرف اللہ کے لیے خاص ہیں ان کو یا ان میں سے کسی کو اللہ کے سوا کسی اور کے لیے تسلیم کیا جائے۔ مثلاً فوق الفطری طریقے سے نفع وضرر پہنچانا، حاجت روا و دستگیری کرنا، محافظت و نگہبانی کرنا، دعائیں سننا اور قسمتوں کو بنانا اور بگاڑنا۔ نیز حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنا اور انسانی زندگی کے لیے قانون وشرع تجویز کرنا۔ یہ سب خداوندی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لیے تسلیم کرنا شرک ہے۔''

☆......''حقوق میں شرک یہ ہے کہ خدا ہونے کی حیثیت سے بندوں پر خدا کے جو مخصوص حقوق ہیں وہ یا ان میں سے کوئی حق خدا کے سوکسی اور کے لیے مانا جائے۔ مثلاً رکوع وسجود، دست بستہ قیام، سلامی و آستانہ بوسی، شکر نعمت یا اعتراف برتری کے لیے نذر و نیاز اور قربانی، قضائے حاجات اور رفع مشکلات کے لیے منت، مصائب ومشکلات میں مدد کے لیے پکارا جانا، اور ایسی ہی پرستش وتعظیم وتمجید کی دُوسری تمام صورتیں اللہ کے مخصوص حقوق میں سے ہیں۔ اسی طرح ایسا محبوب ہونا کہ اس کی محبت پر دُوسری سب محبتیں قربان کی جائیں، اور ایسا مستحق تقویٰ وخشیت ہونا کہ غیب وشہادت میں اس کی ناراضگی اور اس کے حکم کی خلاف ورزی سے ڈرا جائے، یہ بھی صرف اللہ کا حق ہے۔ اور یہ بھی اللہ ہی کا حق ہے کہ اس کی غیر مشروط اطاعت کی جائے، اور اس کی ہدایت کو صحیح وغلط کا معیار مانا جائے، اور کسی ایسی حاجت کا حلقہ اپنی گردن میں نہ ڈالا جائے جو اللہ کی اطاعت سے آزاد ایک مستقل اطاعت ہو اور جس کے حکم کے لئے اللہ کے حکم کی سند نہ ہو۔ ان حقوق میں سے جو حق بھی دوسرے کو دیا جائے گا وہ اللہ کا شریک ٹھہرے گا خواہ اس کو خدائی ناموں سے نام دیا جائے یا نہ دیا جائے''(حاشیہ نمبر ۱۲۸)

درج بالا تفصیل کو سامنے رکھتے ہوئے، ذیل کی مختلف حالتیں شرک کی اصطلاح کے زمرے میں آتی ہیں، (المائدہ: ۳)

i) ذبیحہ پر غیر اللہ کا نام لینا (البقرہ: ۱۷۳)

ii) مشرکانہ عقائد کے تحت جانوروں کے کان چیر کر ان کو دیوتاؤں کے نام پن کر دینا (النساء: ۱۱۹)

iii) مشرکانہ فال گیری (المائدہ: ۳)

iv) آستانوں پر چڑھاوے چڑھانا (المائدہ: ۹۹)

v) مصیبت کے وقت مشرکین کا ''شرکاء'' کو چھوڑ کر خدائے واحد کے سامنے گڑگڑانا

vi) جنوں کو بھی خدا کا شریک ٹھہرانا (البقرہ: ۱۰۰)

vii) دوسروں کو اللہ کا مدمقابل ٹھہرانا (البقرہ: ۲۲)

viii) اللہ کے لئے اولاد تجویز کرنا (البقرہ: ۱۰۱)

ix) شیطان کی اطاعت بھی شرک ہے (البقرہ: ۱۲۱)

x) اللہ کی نعمتوں میں شرکاء کا حصہ لگانا (الانعام: ۱۳۶)

xi) مشرکانہ خیالات کی بناء پر قتل اولاد (الانعام: ۱۳۷)

xii) اولیاء اور انبیاء کو مدد کے لئے پکارنا بھی شرک ہے۔ (النحل: ۲۱)

xiii) مشرکین کو خدائے واحد کا ذکر ہمیشہ ناگوار ہوتا ہے (بنی اسرائیل: ۴۶)

xiv) شرک کی بنیاد محض قیاس وگمان پر ہے (سورہ یونس: ۶۵)

یہ چند آیات ہیں ان لاتعداد آیات قرآنی میں سے، جن میں شرک کی تردید اور تکذیب کی گئی ہے تاہم یہ ایسا موضوع ہے جس کی قباحت بیان کرنے میں تمام قرآن میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔

شرک کی ایک عام مثال:

سورۃ الاعراف آیت ۱۸۹ میں بچے کی پیدائش پر مرد اور عورت دونوں کی جانب سے ایک اچھے، صحیح سالم بچے کی پیدائش پر شکر کرنے کا ذکر ہے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ انہیں ایک تندرست وتوانا بچہ دے دیتے ہیں تو پھر اس میں وہ دوسروں کو بھی شریک ٹھہرانے لگ

جاتے ہیں۔مشرکین عرب کا تصور یہ تھا کہ وہ صحیح سالم اولاد پیدا ہونے کیلئے تو خدا ہی سے دعا مانگتے تھے مگر جب بچہ پیدا ہوجاتا تھا تو دوسروں کو بھی اس میں شامل کر لیتے تھے۔سید مودودیؒ نے اپنے تشریحی نوٹ (۱۴۶) میں اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا:

"بلا شبہ یہ حالت بھی نہایت بری تھی لیکن اب جو شرک ہم توحید کے مدعیوں میں پا رہے ہیں وہ اس سے بھی بدتر ہے۔ یہ ظالم تو اولاد بھی غیروں ہی سے مانگتے ہیں، حمل کے زمانے میں منتیں بھی غیروں کے نام ہی کی مانتے ہیں۔اور پھر بچہ پیدا ہونے کے بعد نیاز بھی انہی کے آستانوں پر چڑھاتے ہیں۔اس پر بھی زمانہ جاہلیت کے عرب مشرک تھے اور یہ موحد ہیں، ان کے لئے جہنم واجب تھی اور ان کیلئے نجات کی گارنٹی ہے۔ان کی گمراہیوں پر تنقید کی زبانیں تیز ہیں مگر ان کی گمراہیوں پر کوئی تنقید کر بیٹھے تو مذہبی درباروں میں بے چینی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔اس حالت کا ماتم حالی مرحوم نے اپنی مسدس میں یوں کیا ہے:

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر
جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہرِ سجدہ تو کافر
کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں
اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پر جا جا کے نذریں چڑھائیں
شہیدوں سے جا جا کر مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

شرک کی ایک دوسری مثال: سورہ الزمر کی آیت نمبر ۲۸ میں ایک مثال کے ذریعے توحیداور شرک کی ایک ایسی عمدہ مثال دی گئی ہے جسے پڑھنے کے بعد ایک عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ ان میں کیا جوہری فرق پوشیدہ ہے۔ ان آیات میں ایک ایسے غلام کی مثال دی گئی ہے جس کا ایک مالک ہو یا بہت سارے مالک اور آقا جو ہر وقت اسے اپنے اپنے کاموں کا حکم دیتے ہوں۔ اس ضمن میں حاشیہ نمبر ۴۸ کی تشریح قابل غور ہے۔

''اس مثال میں اللہ تعالیٰ نے شرک اور توحید کے فرق اور انسان کی زندگی پر دونوں کے اثرات کو اس طرح کھول کر بیان فرما دیا ہے کہ اس سے زیادہ مختصر الفاظ میں اتنا بڑا مضمون اتنے مؤثر طریقے سے سمجھا دینا ممکن نہیں ہے۔ یہ بات ہر آدمی تسلیم کرے گا کہ جس شخص کے بہت سے مالک یا آقا ہوں، اور ہر ایک اس کو اپنی اپنی طرف کھینچ رہا ہو، اور وہ مالک بھی ایسے بدمزاج ہوں کہ ہر ایک اس سے خدمت لیتے ہوئے دوسرے مالک کے حکم پر دوڑنے کی اسے مہلت نہ دیتا ہو، اور ان کے متضاد احکام میں جس کے حکم کی بھی وہ تعمیل سے قاصر رہ جائے وہ اسے ڈانٹنے پھٹکارنے ہی پر اکتفا نہ کرتا ہو بلکہ سزا دینے پر تُل جاتا ہو، اس کی زندگی لامحالہ سخت ضیق میں ہوگی۔ اور اس کے برعکس وہ شخص بڑے چین اور آرام سے رہے گا جو بس ایک ہی آقا کا نوکر یا غلام ہو اور کسی دوسرے کی خدمت و رضا جوئی اسے نہ کرنی پڑے۔ یہ ایسی سیدھی سی بات ہے جسے سمجھنے کے لیے کسی بڑے غور و تامل کی حاجت نہیں ہے۔ اس کے بعد کسی شخص کے لیے یہ سمجھنا بھی مشکل نہیں رہتا کہ انسان کے لیے جو امن و اطمینان ایک خدا کی بندگی میں ہے وہ بہت سے خداؤں کی بندگی میں اسے کبھی میسر نہیں آسکتا۔''____ اسی حاشیے کی مزید تفصیل یوں کی

''اس مقام پر یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ بہت سے کج خلق اور باہم متنازع آقاؤں کی تمثیل پتھر کے بتوں پر راست نہیں آتی بلکہ اُن جیتے جاگتے آقاؤں پر ہی راست آتی ہے جو عملاً آدمی کو متضاد احکام دیتے ہیں اور فی الواقع اس کو اپنی اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں۔ پتھر کے بت کیسے حکم دیا کرتے ہیں اور کب کسی کو کھینچ کر اپنی خدمت

کے لیے بلاتے ہیں۔ یہ کام تو زندہ آقاؤں ہی کے کرنے کے ہیں۔ ایک آقا آدمی کے اپنے نفس میں بیٹھا ہوا ہے جو طرح طرح کی خواہشات اس کے سامنے پیش کرتا ہے اور اسے مجبور کرتا رہتا ہے کہ وہ انہیں پورا کرے۔ دوسرے بے شمار آقا گھر میں، خاندان میں، برادری میں، قوم اور ملک کے معاشرے میں، مذہبی پیشواؤں میں، حکمرانوں اور قانون سازوں میں، کاروبار اور معیشت کے دائروں میں، اور دنیا کے تمدن پر غلبہ رکھنے والی طاقتوں میں ہر طرف موجود ہیں جن کے متضاد تقاضے اور مختلف مطالبے ہر وقت آدمی کو اپنی اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں اور ان میں سے جس کا تقاضا پورا کرنے میں بھی وہ کوتاہی کرتا ہے وہ اپنے دائرۂ کار میں اس کو سزا دیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ البتہ ہر ایک کی سزا کے ہتھیار الگ الگ ہیں۔ کوئی دل مسوستا ہے۔ کوئی روٹھ جاتا ہے۔ کوئی نکو بناتا ہے۔ کوئی مقاطعہ کرتا ہے۔ کوئی دیوالہ نکالتا ہے۔ کوئی مذہب کا وار کرتا ہے اور کوئی قانون کی چوٹ لگاتا ہے۔ اس ضیق سے نکلنے کی کوئی صورت انسان کے لیے اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ توحید کا مسلک اختیار کر کے صرف ایک خدا کا بندہ بن جائے اور ہر دوسرے کی بندگی کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکے۔'' مزید کہا کہ

''توحید کا مسلک اختیار کرنے کی بھی دو شکلیں ہیں جن کے نتائج الگ الگ ہیں۔''

''ایک شکل یہ ہے کہ ایک فرد اپنی انفرادی حیثیت میں خدائے واحد کا بندہ بن کر رہنے کا فیصلہ کر لے اور گرد و پیش کا ماحول اس معاملے میں اس کا ساتھی نہ ہو۔ اس صورت میں یہ تو ہوسکتا ہے کہ خارجی کشمکش اور ضیق اس کے لیے پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جائے، لیکن اگر اس نے سچے دل سے یہ مسلک اختیار کیا ہو تو اسے داخلی امن و اطمینان لازماً میسر آ جائے گا۔ وہ نفس کی ہر اُس خواہش کو رد کر دے گا جو احکامِ الٰہی کے خلاف ہو یا جسے پورا کرنے کے ساتھ خدا پرستی کے تقاضے پورے نہ کیے جا سکتے ہوں۔ وہ خاندان، برادری، قوم، حکومت، مذہبی پیشوائی اور معاشی اقتدار کے بھی کسی ایسے مطالبے کو قبول نہ کرے گا جو خدا کے قانون سے ٹکراتا ہو۔ اس کے نتیجے میں اسے بے حد تکلیفیں پہنچ سکتی ہیں، بلکہ لازماً

پہنچیں گی۔لیکن اس کا دل پوری طرح مطمئن ہوگا کہ جس خدا کا میں بندہ ہوں، اس کی بندگی کا تقاضا پورا کر رہا ہوں، اور جن کا بندہ میں نہیں ہوں ان کا مجھ پر کوئی حق نہیں ہے جس کی بنا پر اپنے رب کے حکم کے خلاف ان کی بندگی بجالاؤں۔ یہ دل کا اطمینان اور روح کا امن وسکون دنیا کی کوئی طاقت اُس سے نہیں چھین سکتی۔حتیٰ کہ اگر اسے پھانسی پر بھی چڑھنا پڑ جائے تو وہ ٹھنڈے دل سے چڑھ جائے گا اور اس کو ذرا پچھتاوا نہ ہوگا کہ میں نے کیوں نہ جھوٹے خداؤں کے آگے سر جھکا کر اپنی جان بچالی۔۔۔۔'' اس کے علاوہ اس حاشیہ میں مزید لکھا کہ ''دوسری شکل یہ ہے کہ پورا معاشرہ اسی توحید کی بنیاد پر قائم ہو جائے اور اس میں اخلاق، تمدن، تہذیب، تعلیم، مذہب، قانون، رسم ورواج، سیاست، معیشت، غرض ہر شعبۂ زندگی کے لیے وہ اصولِ اعتقاداً مان لیے جائیں اور عملاً رائج ہو جائیں جو خداوندِ عالم نے اپنی کتاب اور اپنے رسول ﷺ کے ذریعہ سے دیے ہیں۔خدا کا دین جس کو گناہ کہتا ہے، قانون اسی کو جرم قرار دے، حکومت کی انتظامی مشین اسی کو مٹانے کی کوشش کرے، تعلیم و تربیت اسی سے بچنے کے لیے ذہن اور کردار تیار کرے، منبر ومحراب سے اسی کے خلاف آواز بلند ہو، معاشرہ اسی کو معیوب ٹھیرائے اور معیشت کے ہر کاروبار میں وہ ممنوع ہو جائے۔اسی طرح خدا کا دین جس چیز کو بھلائی اور نیکی قرار دے، قانون اس کی حمایت کرے، انتظام کی طاقتیں اسے پروان چڑھانے میں لگ جائیں، تعلیم وتربیت کا پورا انظام ذہنوں میں اس کو بٹھانے اور سیرتوں میں اسے رچا دینے کی کوشش کرے، منبر ومحراب اسی کی تلقین کریں، معاشرہ اسی کی تعریف کرے اور اپنے عملی رسم ورواج اُس پر قائم کردے، اور کاروبارِ معیشت بھی اسی کے مطابق چلے۔ یہ وہ صورت ہے جس میں انسان کو کامل داخلی و خارجی اطمینان میسر آجاتا ہے اور مادی وروحانی ترقی کے تمام دروازے اس کے لیے کھل جاتے ہیں، کیونکہ اس میں بندگی رب اور بندگی غیر کے تقاضوں کا تصادم قریب قریب ختم ہو جاتا ہے۔۔۔۔'' حاشیہ ۴۸ ہی میں مزید وضاحت کی۔

''اسلام کی دعوت اگرچہ ہر ہر فرد کو یہی ہے کہ خواہ دوسری صورت پیدا ہو یا نہ ہو،

بہر حال وہ توحید ہی کو اپنا دین بنا لے اور تمام خطرات و مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اللہ کی بندگی کرے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کا آخری مقصود یہی دوسری صورت پیدا کرنا ہے اور تمام انبیائے علیہم السلام کی کوششوں کا مدعا یہی رہا ہے کہ ایک اُمت مسلمہ وجود میں آئے جو کفر اور کفار کے غلبے سے آزاد ہو کر من حیث الجماعت اللہ کے دین کی پیروی کرے۔ کوئی شخص جب تک قرآن و سنت سے ناواقف اور عقل سے بے بہرہ نہ ہو، یہ نہیں کہہ سکتا کہ انبیاء علیہم السلام کی سعی و جہد کا مقصود صرف انفرادی ایمان و طاعت ہے، اور اجتماعی زندگی میں دین کو نافذ و قائم کرنا سرے سے اس کا مقصد ہی نہیں رہا''

آیات نمبر ۴۵ میں انسان کی اس حالت کا ذکر کیا گیا ہے جب اللہ واحد کا ذکر سن کر اس کا دل کڑھنے لگتا ہے اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو یکا یک وہ خوشی سے کھل اٹھتے ہیں۔'' اس کی تشریح حاشیہ نمبر ۶۴ میں یوں کی گئی۔

''یہ بات قریب قریب ساری دنیا کے مشرکانہ ذوق رکھنے والے لوگوں میں مشترک ہے حتیٰ کہ مسلمانوں میں بھی جن بدقسمتوں کو یہ بیماری لگ گئی ہے وہ بھی اس عیب سے خالی نہیں ہیں۔ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں لیکن حالت یہ ہے کہ اکیلے اللہ کا ذکر کیجئے تو ان کے چہرے بگڑنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں، ضرور یہ شخص بزرگوں اور اولیاء کو نہیں مانتا، جبھی تو بس اللہ ہی اللہ کی باتیں کیے جاتا ہے۔ اور اگر دوسروں کا ذکر کیا جائے تو ان کے دلوں کی کلی کھل جاتی ہے اور بشاشت سے ان کے چہرے دمکنے لگتے ہیں۔ اس طرزِ عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو اصل میں دلچسپی اور محبت کس سے ہے۔ علامہ آلوسی نے تفسیر رُوح المعانی میں اس مقام پر خود اپنا ایک تجربہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں نے دیکھا کہ ایک شخص اپنی کسی مصیبت میں ایک وفات یافتہ بزرگ کو مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ میں نے کہا اللہ کے بندے، اللہ کو پکار، وہ خود فرماتا ہے کہ وَاِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ میری یہ بات سن کر اسے سخت غصہ آیا اور بعد میں لوگوں نے مجھے بتایا کہ وہ کہتا تھا یہ شخص اولیاء کا منکر ہے اپنے طور پر اور بعض

لوگوں نے اس کو یہ کہتے بھی سنا کہ اللہ کی نسبت ولی جلد سن لیتے ہیں''

درج بالا سطور میں بتایا گیا کہ شرک کی وجہ وہ تفرقہ ہے جو مختلف لوگوں نے دین میں اپنی طرف سے پیدا کیا۔ جب ہم اس تفرقے اور ان تمام اقسام کی نئی نئی اپچوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو اصل دین انبیاء میں شامل کی گئیں تو اس کی اصل حقیقت کا ادراک سورہ الشوریٰ آیت نمبر ۱۴ سے ہوتا ہے کہ ''لوگوں میں تفرقہ رونما ہوا، وہ اس کے بعد ہوا کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا اور اس بناء پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔۔۔۔۔'' اس کی وضاحت حاشیہ نمبر ۲۲ اور نمبر ۲۳ میں یوں کی گئی۔

''یعنی تفرقے کا سبب یہ نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام نہیں بھیجے تھے اور کتابیں نازل نہیں کی تھیں اس وجہ سے لوگ راہِ راست نہ جاننے کے باعث اپنے اپنے الگ مذاہب اور مدارسِ فکر اور نظامِ زندگی خود ایجاد کر بیٹھے، بلکہ یہ تفرقہ اُن میں اللہ کی طرف سے علم آ جانے کے بعد رونما ہوا۔ اس لیے اللہ اس کا ذمہ دار نہیں ہے بلکہ وہ لوگ خود اُس کے ذمہ دار ہیں جنہوں نے دین کے صاف صاف اصول اور شریعت کے واضح احکام سے ہٹ کر نئے نئے مذاہب و مسالک بنائے۔''

سید صاحب نے مزید لکھا ''اس تفرقہ پردازی کا محرک کوئی نیک جذبہ نہیں تھا، بلکہ یہ اپنی نرالی اُپج دکھانے کی خواہش، اپنا الگ جھنڈا بلند کرنے کی فکر، آپس کی ضدم ضدا، ایک دوسرے کو زک دینے کی کوشش اور مال و جاہ کی طلب کا نتیجہ تھی۔ ہوشیار اور حوصلہ مند لوگوں نے دیکھا کہ بندگانِ خدا اگر سیدھے سیدھے خدا کے دین پر چلتے رہیں تو بس ایک خدا ہوگا جس کے آگے لوگ جھکیں گے۔ ایک رسول ہوگا جس کو لوگ پیشوا اور رہنما مانیں گے، ایک کتاب ہوگی جس کی طرف لوگ رجوع کریں گے، اور ایک صاف عقیدہ اور بے لاگ ضابطہ ہوگا جس کی پیروی وہ کرتے رہیں گے۔ اس نظام میں اُن کی اپنی ذات کے لیے کوئی مقامِ امتیاز نہیں ہو سکتا جس کی وجہ سے ان کی مشیخت چلے، **اور لوگ اُن کے گرد جمع ہوں، اور ان کے آگے سر بھی جھکائیں اور جیبیں بھی خالی کریں۔** یہ وہ اصل

سبب تھا جو نئے نئے عقائد اور فلسفے، نئے نئے طرزِ عبادت اور مذہبی مراسم اور نئے نئے نظامِ حیات ایجاد کرنے کا محرک بنا اور اسی نے خلقِ خدا کے ایک بڑے حصے کو دین کی صاف شاہ راہ سے ہٹا کر مختلف راہوں میں پراگندہ کر دیا۔ پھر یہ پراگندگی اِن گروہوں کی باہمی بحث وجدال اور مذہبی و معاشی اور سیاسی کشمکش کی بدولت شدید تلخیوں میں تبدیل ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ نوبت اُن خونریزیوں تک پہنچی جن کے چھینٹوں سے تاریخ انسانی سرخ ہو رہی ہے۔'' (حاشیہ نمبر ۲۳)

بتوں کی پوجا پاٹ / پرستش: مرے ہوئے لوگوں کے نام پر بت بنا کر ان کی پوجا پاٹ اور پرستش کرنا، زمانہ قدیم سے ہی ایک خاص طریقہ رہا ہے۔ دنیا میں جتنے بھی انبیاء مبعوث کیے گئے ان سب کی اقوام کسی نہ کسی بت کی گرویدۂ عقیدت رہی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نیز آپ کے بعد بنی اسرائیل کی بت پرستی، گئو پرستی پر متعدد آیات میں جس انداز میں تنقید کی گئی ہے وہ قرآن کے اعجاز بیان کا مخصوص انداز ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دیوی اور دیوتاؤں کی پرستش کی جارہی تھی اس میں تین دیویوں کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔ جنہیں مکہ، مدینہ اور طائف اور نواح حجاز کے لوگ سب سے زیادہ پوجتے تھے۔ سورہ النجم کی آیت ۱۹ کے ضمن میں سید مودودی نے بہت دلچسپ معلومات دی ہیں جن کا مختصر ذکر ذیل میں درج کیا جارہا ہے، (حاشیہ نمبر ۱۵)

لات کا استھان طائف میں تھا اور بنی ثقیف اس کے اس حد تک معتقد تھے کہ جب ابرہہ ہاتھیوں کی فوج لے کر خانہ کعبہ توڑنے کے لیے مکہ پر چڑھائی کرنے جارہا تھا اس وقت ان لوگوں نے محض اپنے اس معبود کے آستانے کو بچانے کی خاطر اس ظالم کو مکے کا راستہ بتانے کے لیے بدرقے فراہم کیے تاکہ وہ لات کو ہاتھ نہ لگائے۔''

''عزیٰ عزت سے ہے اور اس کے معنی عزت والی کے ہیں۔ یہ قریش کی خاص دیوی تھی اور اس کا استھان مکہ اور طائف کے درمیان وادیٔ نخلہ میں حُراض کے مقام پر واقع تھا۔ بنی ہاشم کے حلیف قبیلۂ بنی شیبان کے لوگ اس کے مجاور تھے۔ قریش اور دوسرے

قبائل کے لوگ اس کی زیارت کرتے اور اس پر نذریں چڑھاتے اور اس کے لیے قربانیاں کرتے تھے۔ کعبہ کی طرح اس کی طرف بھی ہَدی کے جانور جاتے اور تمام بتوں سے بڑھ کر اس کی عزت کی جاتی تھی۔''

''مناۃ کا استھان مکہ اور مدینہ کے درمیان بحر احمر کے کنارے قدید کے مقام پر تھا اور خاص طور پر خزاعہ اور اوس وخزرج کے لوگ اس کے بہت معتقد تھے۔ اس کا حج اور طواف کیا جاتا اور اس پر نذر کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں۔ زمانۂ حج میں جب حجاج طوافِ بیت اللہ اور عرفات اور منیٰ سے فارغ ہو جاتے تو وہیں سے مناۃ کی زیارت کے لیے لبیک لبیک کی صدائیں بلند کر دی جاتیں اور جو لوگ اس دوسرے ''حج'' کی نیت کر لیتے وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی نہ کرتے تھے۔''

سورہ نوح کی آیت ۲۳ کی تشریح حاشیہ نمبر ۱۷ میں یوں کی گئی ہے ''قومِ نوح علیہ السلام کے معبودوں میں سے یہاں ان معبودوں کے نام لئے گئے ہیں جنہیں بعد میں اہل عرب نے بھی پوجنا شروع کر دیا تھا اور آغازِ اسلام کے وقت عرب میں جگہ جگہ ان کے مندر بنے ہوئے تھے۔ بعید نہیں کہ طوفان میں جو لوگ بچ گئے تھے ان کی زبان سے بعد کی نسلوں نے قومِ نوحؑ کے قدیم معبودوں کا ذکر سنا ہوگا۔ اور جب از سرِ نو ان کی اولاد میں جاہلیت پھیلی ہوگی تو انہی معبودوں کے بت بنا کر انہوں نے پھر انہیں پوجنا شروع کر دیا ہوگا۔''

☆......ودّ قبیلۂ قضاعہ کی شاخ بنی کلب بن وبرہ کا معبود تھا جس کا استھان انہوں نے دومۃ الجندل میں بنا رکھا تھا۔ عرب کے قدیم کتبات مین اس کا نام ودم ابم (ود باپو) لکھا ہوا ملتا ہے۔ کلبی کا بیان ہے کہ اس کا بت ایک نہایت عظیم الجثہ مرد کی شکل کا بنا ہوا تھا۔ قریش کے لوگ بھی اس کو معبود مانتے تھے اور اس کا نام ان کے ہاں ودّ تھا۔ اسی کے نام پر تاریخ میں ایک شخص کا نام عبد ودّ ملتا ہے۔

☆......سواع قبیلۂ ہذیل کی دیوی تھی اور اس کا بت عورت کی شکل کا بنایا گیا تھا۔ ینبوع کے قریب رہاط کے مقام پر اس کا مندر واقع تھا۔

☆......یغوث قبیلۂ طے کی شاخ انعم اور قبیلۂ مذحج کی بعض شاخوں کا معبود تھا۔ مذحج والوں نے یمن اور حجاز کے درمیان جرش کے مقام پر اس کا بت نصب کر رکھا تھا جس کی شکل شیر کی تھی۔ قریش کے لوگوں میں بھی بعض کا نام عبد یغوث ملتا ہے۔

☆......یعوق یمن کے علاقہء ہمدان میں قبیلۂ ہمدان کی شاخ خیوان کا معبود تھا اور اس کا بت گھوڑے کی شکل کا تھا۔

☆......نسر حمیر کے علاقے میں قبیلۂ حمیر کی شاخ آل ذوالکلاع کا معبود تھا اور بلخع کے مقام پر اس کا بت نصب تھا جس کی شکل گدھ کی تھی۔ سبا کے قدیم کتبوں میں اس کا نام نسور لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس کے مندر کو وہ لوگ بیت نسور اور اس کے پجاریوں کو اہل نسور کہتے تھے۔ قدیم مندروں کے جو آثار عرب اور اس کے متصل علاقوں میں پائے جاتے ہیں ان میں سے بہت سے مندروں کے دروازوں پر گدھ کی تصویر بنی ہوئی ہے۔

شرک کی ایک اور قسم: سورہ الشوریٰ کی آیت نمبر ٦ میں ذکر ہے، ''جن لوگوں نے اس کو چھوڑ کر اپنے کچھ دوسرے سر پرست بنا رکھے ہیں'' اس کی تشریح میں سید مودودی رقمطراز ہیں:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ڮ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝ (الشوریٰ:٦)

''جن لوگوں نے اس کو چھوڑ کر اپنے کچھ دوسرے سر پرست بنا رکھے ہیں، اللہ ہی ان پر نگران ہے تم ان کے حوالہ دار نہیں ہو______''

''اصل میں لفظ ''اولیاء'' استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم عربی زبان میں بہت وسیع ہے۔ معبودان باطل کے متعلق گمراہ انسانوں کے مختلف عقائد اور بہت سے مختلف طرزِ عمل ہیں جن کو قرآن مجید میں ''اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا ولی بنانے'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن پاک کا تتبع کرنے سے لفظ ''ولی'' کے حسب ذیل مفہومات معلوم ہوتے ہیں:

(۱) جس کے کہنے پر آدمی چلے، جس کی ہدایات پر عمل کرے، اور جس کے مقرر کیے

ہوئے طریقوں، رسموں اور قوانین وضوابط کی پیروی کرے (النساء، آیات ۱۱۸ تا ۱۲۰۔ الاعراف ۳، ۲۷ تا ۳۰)''

(۲) جس کی رہنمائی (GUIDANCE) پر آدمی اعتماد کرے اور یہ سمجھے کہ وہ اسے صحیح راستہ بتانے والا اور غلطی سے بچانے والا ہے۔ (البقرہ ۲۵۷۔ بنی اسرائیل ۹۷۔ الکہف ۱۷۔ ۵۰۔ الجاثیہ ۱۹)

(۳) ''جس کے متعلق آدمی یہ کہے کہ میں دنیا میں خواہ کچھ کرتا رہوں، وہ مجھے اُس کے بُرے نتائج سے اور اگر خدا ہے اور آخرت بھی ہونے والی ہے، تو اُس کے عذاب سے بچالے گا (النساء ۱۲۳۔ ۱۷۳۔ الانعام ۵۱۔ الرعد ۳۷۔ العنکبوت ۲۲۔ الاحزاب ۶۵۔ الزمر ۳)۔''

(۴) ''جس کے متعلق آدمی یہ سمجھے کہ وہ دنیا میں فوق الفطری طریقے سے اس کی مدد کرتا ہے، آفات ومصائب سے اس کی حفاظت کرتا ہے، اسے روزگار دلواتا ہے، اولاد دیتا ہے، مرادیں برلاتا ہے، اور دوسری ہرطرح کی حاجتیں پوری کرتا ہے (ہود ۲۰۔ الرعد ۱۶۔ العنکبوت ۴۱)''

''بعض مقامات پر قرآن میں ولی کا لفظ ان میں سے کسی ایک معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور بعض مقامات پر جامعیت کے ساتھ اُس کے سارے ہی مفہومات مراد ہیں۔ آیت زیرتشریح بھی انہی میں سے ایک ہے۔ یہاں اللہ کے سوا دوسروں کو ولی بنانے سے مراد مذکورہ بالا چاروں معنوں میں ان کو اپنا سرپرست بنانا اور حامی ومددگار سمجھنا ہے۔

سورہ الشوری ہی کی اگلی آیات اس موضوع پر مزید روشنی ڈالتی ہیں۔

''آیت نمبر ۲۱ میں فرمایا کہ ''کیا یہ لوگ کچھ ایسے شریک خدا رکھتے ہیں جنہوں نے ان کے لئے دین کی نوعیت رکھنے والا ایک ایسا طریقہ مقرر کر دیا ہے جن کا اللہ نے انہیں اذن نہیں دیا''، اس کی تفصیل حاشیہ نمبر ۳۸ میں یوں کی گئی:

''اس آیت میں شُرَکَآء سے مراد، ظاہر بات ہے کہ وہ شریک نہیں ہیں جن سے لوگ

دعائیں مانگتے ہیں، یا جن کی نذر و نیاز چڑھاتے ہیں، یا جن کے آگے پوجا پاٹ کے مراسم ادا کرتے ہیں۔ بلکہ لامحالہ اُن سے مراد وہ انسان ہیں جن کو لوگوں نے شریک فی الحکم ٹھیرا لیا ہے، جن کے سکھائے ہوئے افکار و عقائد اور نظریات اور فلسفوں پر لوگ ایمان لاتے ہیں، جن کی دی ہوئی قدروں کو مانتے ہیں، جن کے پیش کیے ہوئے اخلاقی اصولوں اور تہذیب و ثقافت کے معیاروں کو قبول کرتے ہیں، جن کے مقرر کیے ہوئے قوانین اور طریقوں اور ضابطوں کو اپنے مذہبی مراسم اور عبادات میں، اپنی شخصی زندگی میں، اپنی معاشرت میں، اپنے تمدن میں، اپنے کاروبار اور لین دین میں، اپنی عدالتوں میں، اور اپنی سیاست اور حکومت میں اس طرح اختیار کرتے ہیں کہ گویا یہی وہ شریعت ہے جس کی پیروی ان کو کرنی چاہیے۔ یہ ایک پورا کا پورا دین ہے جو اللہ رب العالمین کی تشریع کے خلاف، اور اس کے اذن (SANCTION) کے بغیر ایجاد کرنے والوں نے ایجاد کیا اور ماننے والوں نے مان لیا۔ اور یہ ویسا ہی شرک ہے جیسا غیر اللہ کو سجدہ کرنا اور غیر اللہ سے دعائیں مانگنا شرک ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو البقرہ، حواشی ۱۷۰، ۲۸۶۔ آل عمران حاشیہ ۵۔ النساء حاشیہ ۹، المائدہ حواشی ۱ تا ۵۔ الانعام حواشی ۸۷۔۸۶۔ ۱۰۶، ۱۰۷۔ التوبہ حاشیہ ۳۱۔ یونس حواشی ۶۰، ۶۱۔ ابراہیم حواشی ۳۰ تا ۳۲۔ النحل حواشی ۱۱۴ تا ۱۱۶۔ الکہف حواشی ۴۹ تا ۵۰۔ مریم حاشیہ ۲۷۔ القصص حاشیہ ۸۶۔ سبا حاشیہ ۶۳۔ یٰسین حاشیہ ۵۳)''

''سورہ النحل جو مکہ میں نازل ہوئی تھی، ان سورتوں میں بہت اہمیت کی حامل ہے جس میں شرک کا ابطال کیا گیا ہے۔ اس سورت کی آیت نمبر ۲۰ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''اور وہ دوسری ہستیاں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں، وہ کسی چیز کے بھی خالق نہیں ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں۔ مردہ ہیں نہ کہ زندہ''......اس کی تفصیل حاشیہ نمبر ۱۹ میں یوں کی گئی: ''

''یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یہاں خاص طور پر جن بناوٹی معبودوں کی تردید کی جا رہی ہے وہ فرشتے، یا جن، یا شیاطین، یا لکڑی پتھر کی مورتیاں نہیں ہیں، بلکہ اصحابِ قبور ہیں۔ اس لیے کہ فرشتے اور شیاطین تو زندہ ہیں، ان پر اَمۡوَاتٌ غَيۡرُ اَحۡيَآءٍ کے الفاظ

کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ اور لکڑی پتھر کی مورتیوں کے معاملہ میں بعث بعد الموت کا کوئی سوال نہیں ہے، اس لیے مَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ کے الفاظ انہیں بھی خارج از بحث کر دیتے ہیں۔ اب لامحالہ اس آیت میں اَلَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ سے مراد وہ انبیاء، اولیاء، شہداء، صالحین اور دوسرے غیر معمولی انسان ہی ہیں جن کو غالی معتقدین داتا، مشکل کشا، فریادرس، غریب نواز، گنج بخش، اور نہ معلوم کیا کیا قرار دے کر اپنی حاجت روائی کے لیے پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں اگر کوئی یہ کہے کہ عرب میں اس نوعیت کے معبود نہیں پائے جاتے تھے تو ہم عرض کریں گے کہ یہ جاہلیت عرب کی تاریخ سے اس کی ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ کون پڑھا لکھا نہیں جانتا ہے کہ عرب کے متعدد قبائل، ربیعہ، کلب، تغلب، قضاعہ، کنانہ، حرث، کعب، کندہ وغیرہ میں کثرت سے عیسائی اور یہودی پائے جاتے تھے، اور یہ دونوں مذاہب بری طرح انبیاء اولیاء اور شہداء کی پرستش سے آلودہ تھے۔ پھر مشرکین عرب کے اکثر نہیں تو بہت سے معبود وہ گزرے ہوئے انسان ہی تھے جنہیں بعد کی نسلوں نے خدا بنا لیا تھا۔ بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ وَدّ، سُواع، یغوث، یعوق، نسر، یہ سب صالحین کے نام ہیں جنہیں بعد کے لوگ بت بنا بیٹھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ اساف اور نائلہ دونوں انسان تھے۔ اسی طرح کی روایات لات اور مناۃ اور عزیٰ کے بارے میں بھی موجود ہیں۔ اور مشرکین کا یہ عقیدہ بھی روایات میں آیا ہے کہ لات اور عزیٰ اللہ کے ایسے پیارے تھے کہ اللہ میاں جاڑا (سردی) لات کے ہاں اور گرمی عزیٰ کے ہاں بسر کرتے تھے، "سبحانہ و تعالیٰ عما یصفون"

شرک کے ابطال میں اسی مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے قرآن کریم نے مشرکین کی اس حالت پر بھی یوں گرفت کی کہ کسی برے وقت میں اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوتا ہم وہ وقت ٹل جانے کی صورت میں تم میں سے ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو (اس مہربانی کے شکریے میں) شریک کرنے لگتا ہے (مفہوم آیت ۵۳ تا ۵۴)......اس کی تشریح

یوں کی گئی کہ ''یعنی اللہ کے شکریہ کے ساتھ ساتھ کسی بزرگ یا کسی دیوی دیوتا کے شکریے کی نیازیں اور نذریں چڑھانی شروع کر دیتا ہے اور اپنی بات بات سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کے نزدیک اللہ کی اس مہربانی میں ان حضرت کی مہربانی کا بھی دخل تھا، بلکہ اللہ ہرگز مہربانی نہ کرتا اگر وہ حضرت مہربان ہوکر اللہ کو مہربانی پر آمادہ نہ کرتے'' (حاشیہ نمبر ۴۶، ۴۷)

گذشتہ باب میں متعدد سورتوں میں اس مکالمے کا ذکر کیا گیا ہے جو ان دو گروہوں کے درمیان ہوگا جب روز قیامت وہ ایک دوسرے کو عذاب جہنم کی جانب جاتے ہوئے دیکھ کر پکار اٹھیں گے تو کہیں گے کہ ''اے پروردگار! یہی ہیں ہمارے وہ شریک جنہیں ہم تجھے چھوڑ کر پکارا کرتے تھے۔'' اس پر ان کے وہ معبود صاف جواب دیں گے کہ ''تم جھوٹے ہو'' (سورہ النحل آیت نمبر ۸۶)

اس صورت حال پر یہ تشریحی نوٹ سید مودودیؒ لکھا کہ ''اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بجائے خود اس واقعہ کا انکار کریں گے کہ مشرکین انہیں حاجت روائی و مشکل کشائی کے لئے پکارا کرتے تھے بلکہ دراصل وہ اس واقعے سے متعلق اپنے علم و اطلاع اور اس پر اپنی رضامندی کا انکار کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ ہم نے کبھی تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ تم خدا کو چھوڑ کر ہمیں پکارا کرو، نہ ہم تمہاری اس حرکت پر راضی تھے، بلکہ ہمیں تو خبر تک نہ تھی کہ تم ہمیں پکار رہے ہو۔ تم نے اگر ہمیں سمیع الدعاء اور مجیب الدعوات، اور دستگیر و فریادرس قرار دیا تھا تو یہ قطعی ایک جھوٹ بات تھی جو تم نے گھڑ لی تھی اور اس کے ذمہ دار تم خود تھے۔ اب ہمیں اس کی ذمہ داری میں لپیٹنے کی کوشش کیوں کرتے ہو'' (حاشیہ نمبر ۸۳)

مزید اسی سے متصل حاشیہ نمبر ۸۴ میں کہا گیا کہ

وَ اَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ ِۨالسَّلَمَ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۸۷﴾

(النحل:۸۷)

''اس وقت یہ سب اللہ کے آگے جھک جائیں گے اور ان کی وہ ساری افترا پردازیاں رفو چکر ہو جائیں گی جو یہ دنیا میں کرتے رہے تھے''

''یعنی وہ سب غلط ثابت ہوں گی۔ جن جن سہاروں پر وہ دنیا میں بھروسہ کیے ہوئے تھے، وہ سارے کے سارے گم ہو جائیں گے۔ کسی فریادرس کو وہاں فریادرسی کے لیے موجود نہ پائیں گے۔ کوئی مشکل کشا ان کی مشکل حل کرنے کے لئے نہیں ملے گا۔ کوئی آگے بڑھ کر یہ کہنے والا نہ ہوگا کہ یہ میرے متوسل تھے، انہیں کچھ نہ کہا جائے''!

سورہ فاطر آیات ۳۹ میں مشرکین کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان سے یہ کہلوایا گیا ہے کہ ''کیا ان شریکوں نے زمین میں کچھ پیدا کیا ہے؟'' اور ''کیا ان کے پاس ہماری تحریر موجود ہے جس کی بناء پر وہ شرک جیسے گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں (مفہوم) اس ضمن میں حاشیہ نمبر ۶۷ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

''یعنی کیا ہمارا لکھا ہوا کوئی پروانہ ان کے پاس ایسا ہے جس میں ہم نے یہ تحریر کیا ہو کہ فلاں فلاں اشخاص کو ہم نے بیماروں کو تندرست کرنے، بے روزگاروں کو روزگار دلوانے، یا حاجت مندوں کی حاجتیں پوری کرنے کے اختیارات دیے ہیں، یا فلاں فلاں ہستیوں کو ہم نے اپنی زمین کے فلاں حصوں کا مختار کار بنا دیا ہے اور ان علاقوں کے لوگوں کی قسمتیں بنانا اور بگاڑنا اب ان کے ہاتھ میں ہے، لہٰذا ہمارے بندوں کو اب انہی سے دعائیں مانگنی چاہیں اور انہی کے حضور نذریں اور نیازیں چڑھانی چاہییں اور جو نعمتیں بھی ملیں ان پر انہی ''جھوٹے خداؤں'' کا شکر بجالانا چاہیے۔ ایسی کوئی سند اگر تمہارے پاس ہے تو لاؤ اسے پیش کرو۔ اور اگر نہیں ہے تو خود ہی سوچو کہ یہ مشرکانہ عقائد اور اعمال آخر تم نے کس بنیاد پر ایجاد کر لیے ہیں۔ تم سے پوچھا جاتا ہے کہ زمین اور آسمان میں کہیں تمہارے ان بناوٹی معبودوں کے شریک خدا ہونے کی کوئی علامت پائی جاتی ہے؟ تم اس کے جواب میں کسی علامت کی نشان دہی نہیں کر سکتے۔ تم سے پوچھا جاتا ہے کہ خدا نے اپنی کسی کتاب میں یہ فرمایا ہے، یا تمہارے پاس یا ان بناوٹی معبودوں کے پاس خدا کا دیا ہوا کوئی پروانہ ایسا موجود ہے جو اس امر کی شہادت دیتا ہو کہ خدا نے خود انہیں وہ اختیارات عطا فرمائے ہیں جو تم ان کی طرف منسوب کر رہے ہو؟ تم وہ بھی پیش نہیں کر سکتے۔ اب آخر وہ چیز

کیا ہے جس کی بناء پر تم اپنے یہ عقیدے بنائے بیٹھے ہو، کیا تم خدائی کے مالک ہو کہ خدا کے اختیارات جس جس کو چاہو بانٹ دو؟'' (حاشیہ ٦٧)

اسی آیت کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ان الفاظ میں نہایت خوبصورت حتمی انداز میں فرمایا ''نہیں، بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے کو محض فریب کے جھانسے دیئے جا رہے ہیں۔'' اس کی مزید تشریح حاشیہ نمبر ٦٨ میں سید مودودیؒ نے یوں کی

''یعنی یہ پیشوا اور پیر، پنڈت اور پروہت، یہ کاہن اور واعظ، یہ مجاور اور ان کے ایجنٹ محض اپنی دکان چمکانے کے لئے عوام کو اُلّو بنا رہے ہیں اور طرح طرح کے قصے گھڑ گھڑ کر لوگوں کہ یہ جھوٹے دلاسے دلا رہے ہیں کہ خدا کو چھوڑ کر فلاں فلاں ہستیوں کے دامن تھام لو گے تو دنیا میں تمہارے کام بن جائیں گے اور آخرت میں تم چاہے کتنے ہی گناہ سمیٹ کر لے جاؤ، وہ اللہ سے تمہیں بخشوا لیں گے''۔

قرآن کریم کا مطالعہ کرنے پر ایک طالب علم کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مکی سورتوں میں نزول کے اعتبار سے جوں جوں مکی دور کا اختتام اور مدینہ کی جانب ہجرت کا دور قریب سے قریب تر آ رہا ہوتا ہے، شرک کی تردید میں قرآن کا اسلوب نہایت تند و تیز تاہم دلائل کے اعتبار سے بہت مدلل اور چست ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مشیت ایزدی اب اپنے رسول ﷺ اور ان کے ماننے والوں کے لئے مکی دور کے ظلم وستم کا خاتمہ کرنے اور مدینہ جا کر اس جابرانہ نظام سے رستگاری کی صورت نکالنا چاہتی ہے۔ سورۃ القصص میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس طرح بعد میں نازل ہونے والی دوسری سورتوں کا بھی قریباً یہی انداز ہے۔ سورہ القصص آیت نمبر ٦٢ تا ٦٣ میں پے در پے سوالات کا ذکر ہے۔

وَ يَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝ قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ۚ اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ ۖ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ۝ (القصص:٦٢۔٦٣)

''کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کا تم گمان رکھتے تھے؟'' ''یہ قول جن پر چسپاں ہوگا وہ کہیں گے' اے ہمارے رب! بے شک یہی لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا۔انہیں ہم نے اس طرح گمراہ کیا جیسے ہم خود گمراہ ہوئے۔ہم آپ کے سامنے برأت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ہماری تو عبادت نہیں کرتے تھے۔''

ان آیات پر سید مودودی نے حاشیہ جات ۸۵ تا ۸۸ میں جو اشارات کیے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) دنیوی مفاد کی خاطر شرک و بت پرستی اور انکار نبوت کا انجام آخرت میں برا نتیجہ ہوگا۔

(۲) دنیا میں جن جن (شیاطین جن و انس بشمول سیاسی حکمران، دولتمند طبقہ، مذہبی راہ نما، پیر/فقیر) کو دنیا میں خدا کا شریک بنایا گیا تھا، جن کی بات کے مقابلے میں اللہ اور اس کے رسول کی بات کو رد کر دیا گیا تھا ایسے تمام لوگوں کو خواہ کسی نے اللہ یا رب کہا ہو یا نہ کہا ہو، بہر حال ان کی اطاعت و پیروی اس طرح کی ہو جس طرح خدا کی ہونی چاہیے تو لازماً وہ خدائی میں شریک ٹھہرائے جائیں گے۔(الکہف حاشیہ ۵۰)

(۳) یہاں سید مودودیؒ نے ایک لطیف نکتے کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے کہ ''اللہ تعالیٰ سوال تو کرے گا شریک ٹھہرانے والوں سے (عوام الناس، مقتدی، قبیلے اور دیگر عصبیتوں کے حامل لوگوں سے) مگر قبل اس کے کہ یہ کچھ بولیں، جواب دینے لگیں گے وہ جن کو شریک ٹھہرایا گیا تھا (یعنی لیڈران، وڈیرے، مذہبی و سیاسی راہ نما وغیرہ)۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جب عام مشرکین سے یہ سوال کیا جائے گا تو ان کے لیڈر اور پیشوا محسوس کریں گے کہ اب آ گئی ہماری شامت۔ یہ ہمارے سابق پیرو ضرور کہیں گے کہ یہ لوگ ہماری گمراہی کے ذمہ دار ہیں۔اس لیے پیرووں کے بولنے سے پہلے وہ خود سبقت کر کے اپنی صفائی پیش کرنی شروع کر دیں گے'' (حاشیہ ۸۷) کاش انہیں آج معلوم ہو جائے کہ وہاں اس احکم الحاکمین کی عدالت میں ایسی کوئی حرکت کام نہ آئے گی کہ

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۝ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ۝ (سورہ الطارق)

''جس روز پوشیدہ اسرار کی جانچ پڑتال ہوگی اس وقت انسان کے پاس نہ خود اپنا کوئی زور ہوگا نہ کوئی اس کی مدد کرنے والا ہوگا۔''

گذشتہ آیات کے تسلسل میں آیت نمبر ۴ے تا ۵ے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''(یاد رکھیں یہ لوگ) وہ دن جب کہ وہ انہیں پکارے گا پھر پوچھے گا'' کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کا تم گمان رکھتے تھے؟'' اور ہم ہر امت میں سے ایک گروہ نکال لائیں گے پھر کہیں گے کہ ''لاؤ اب اپنی دلیل......''

اس کے بعد آیت نمبر ٦ے میں قارون کا واقعہ بیان کیا گیا۔ اس آیت کی تشریح میں سید مودودیؒ نے (حاشیہ نمبر ۹۴) لکھا ''یہ واقعہ بھی کفار مکہ کے اسی عذر کے جواب میں بیان کیا جا رہا ہے جس پر آیت ۵ے سے مسلسل تقریر ہو رہی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ جن لوگوں نے محمد ﷺ کی دعوت سے قومی مفاد پر ضرب لگنے کا خطرہ ظاہر کیا تھا وہ دراصل مکہ کے بڑے بڑے سیٹھ، ساہوکار اور سرمایہ دار تھے جنہیں بین الاقوامی تجارت اور سودخواری نے قارونِ وقت بنا رکھا تھا۔ یہی لوگ اپنی جگہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اصل حق بس یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹو۔ **موجودہ زمانے کے مترفین، سیاسی لیڈروں اور اگر حق کی بات کی جائے تو مذہبی لوگوں کا بھی یہی ذہن ہے جس کا منہ بولتا ثبوت کرپشن کے وہ انبار ہیں جن کا انکشاف آئے روز اخبارات اور میڈیا کے ذریعے سامنے آتا رہتا ہے! اور بڑے حامیانِ دین و مفتیانِ کرام نیز لیڈران اس بارے میں منقار زیر پر ہیں** گویا کہ وہ سب بھی اس میں شریک رہے ہیں! اس مقصد پر جس چیز سے بھی آنچ آنے کا اندیشہ ہو (چاہے سود/شراب اور دیگر برائیوں کو جائز اور حلال ٹھہرا کر)۔ دوسری طرف عوام الناس ہیں جو دولت کے ان میناروں کو آرزو بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور ان کی غایت تمنا بس یہ ہوتی ہے کہ جس بلندی پر یہ لوگ پہنچے ہوئے ہیں، کاش ہمیں بھی اس تک پہنچنا نصیب ہو جائے۔ اس زر پرستی کے ماحول میں یہ دلیل بڑی وزنی سمجھی جا رہی

تھی کہ محمد (ﷺ) جس توحید و آخرت کی اور جس ضابطۂ اخلاق کی دعوت دے رہے ہیں اسے اگر مان لیا جائے تو قریش کی عظمت کا یہ فلک بوس قصر زمین پر آ رہے گا اور تجارت کے کاروبار تو درکنار جینے تک کے لالے پڑ جائیں گے'' (حاشیہ نمبر ۹۴)

انہی آیات کے ضمن میں حاشیہ ۹۵ میں قارون کے بارے میں درج ذیل معلومات پیش کی گئی ہیں '' قارون، جس کا نام بائیبل اور تلمود میں قورح (KORAH) بیان کیا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچا زاد بھائی تھا۔ بائبل کی کتاب خروج (باب ٦۔آیت ١٨۔٢١) میں جو نسب نامہ درج ہے اس کی رو سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قارون کے والد باہم سگے بھائی تھے۔قرآن مجید میں دوسری جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ یہ شخص بنی اسرائیل میں سے ہونے کے باوجود فرعون کے ساتھ جا ملا تھا اور اس کا مقرب بن کر اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے مقابلے میں فرعون کے بعد مخالفت کے جو دو سب سے بڑے سرغنے تھے ان میں سے ایک یہی قارون تھا:''

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۳﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ قَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿۲۴﴾ (المومن آیت ۲۳۔۲۴)

''ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور کھلی دلیل کے ساتھ فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف بھیجا،مگر انہوں نے کہا کہ یہ ایک جادوگر ہے سخت جھوٹا۔''

''اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ قارون اپنی قوم سے باغی ہو کر اُس دشمن طاقت کا پٹھو بن گیا تھا جو بنی اسرائیل کو جڑ بنیاد سے ختم کر دینے پر تلی ہوئی تھی۔اور اس قومی غداری کی بدولت اس نے فرعونی سلطنت میں یہ مرتبہ حاصل کر لیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام،فرعون کے علاوہ مصر کی جن دو بڑی ہستیوں کی طرف بھیجے گئے تھے وہ وہی تھے، ایک فرعون کا وزیر ہامان اور دوسرا یہ اسرائیلی سیٹھ۔ باقی سب اعیان سلطنت اور درباری ان سے کم تر درجے میں تھے جن کا خاص طور پر نام لینے کی ضرورت نہ تھی۔قارون کی یہی پوزیشن سورۂ عنکبوت کی آیت نمبر ۳۹ میں بھی بیان کی گئی ہے۔''

سورہ القصص آیت ۷۶ میں قارون کا فرعون کے ساتھ گٹھ جوڑ اور اپنی قوم (بنی اسرائیل نیز اپنے رشتے دار بھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام) سے غداری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس قابل ہے کہ نہ صرف عام مسلمان بلکہ خاص طور پر مذہبی لیڈر اور سیاست کے میدان کے شناور جغادری لیڈران اس پر غور وفکر کریں جو اپنے ذاتی مفادات، تجارت اور فوائد کے حصول کے لئے نہ صرف سیاسی حکمرانوں سے گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں بلکہ غیر ملکی طاقتوں (الحادی، اشتراکی، لادینی اور اسرائیلی/ بھارتی) کے ساتھ بھی گٹھ جوڑ کر لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ امت مسلمہ کی تاریخ میں اس قسم کے گٹھ جوڑ اور منافقانہ رویوں/ سازشوں کی سینکڑوں مثالیں پائی جاتی ہیں تاہم ماضی قریب میں ایک ایسا ہی گٹھ جوڑ جس کی وجہ سے برصغیر میں رہنے والی امت مسلمہ کو انگریز کی دوصد سالہ غلامی کا جوا برداشت کرنا پڑا، وہ ہے جس کی جانب علامہ اقبال نے درج ذیل اشعار میں ماتم کیا۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ ملت، ننگِ خون، ننگِ وطن!

اب اگر یادوں کا سلسلہ دراز ہو ہی گیا ہے تو پھر اپنے وطن کو دولخت کرنے والوں میں کچھ ''حسین ناموں'' کو بھی یاد کر لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں!

بھارت کے ساتھ بنگلہ دیش بنانے کا منصوبہ کہاں اور کن دو شخصیتوں کے درمیان طے ہوا؟ ایران کے مشہور اخبار کیہان انٹرنیشنل کے چیف رپورٹر/ ایڈیٹر امیر طاہری کے کالم کی روایتِ نواب زادہ نصر اللہ خاں مرحوم سے اہل علم آگاہ ہیں کہ اندرا گاندھی اور ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان وہاں اس سلسلے میں پخت و پاز ہوئی۔ اغلباً یہ معلومات سکندر بلوچ نامی (ریٹائرڈ فوجی افسر میجر یا کرنل) نے جو ۷۲-۱۹۷۱ء میں روزنامہ نوائے وقت میں کالم لکھا کرتے تھے، نے تفصیل کے ساتھ لکھیں تھیں —— تاہم ان تمام معلومات کے راوی ہمارے ایک فاضل اور علم دوست ریٹائرڈ پروفیسر جناب ریاض الحق صدیقی ہیں (جو آج کل فالج کی وجہ سے صاحب فراش ہیں)۔ موصوف تاریخ، جغرافیہ اور سیاسی حالات کے

ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتے ہیں)۔انہوں نے مزید وضاحت کی کہ

☆ ۱۹۷۰ء کے قومی اسمبلی کے انتخابات میں ہر دو''ہیروز'' نے صرف اپنے اپنے صوبے میں نمائندے کھڑے کئے۔ مجیب الرحمن کو اکثریت حاصل ہوئی۔قومی اسمبلی کا اجلاس ڈھاکہ میں بلانے کا اعلان ہوا—— بھٹو نے اجلاس میں شرکت کے لئے جانے والوں کی ٹانگیں توڑنے کی دھمکی دی—— جنرل یحییٰ خان کو لاڑکانہ میں کس نے دعوت دی—— ؟؟ اور اسمبلی کے اجلاس کی منسوخی کا اعلان —— مشرقی پاکستان میں قتل وغارت کا بازار گرم۔

☆ تاریخ اپنا سفر ہمیشہ جاری رکھتی رہی ہے۔تفصیلات کو نظرانداز کرتے ہوئے دسمبر ۱۶، ۱۹۷۱ء کی صبح طلوع ہوئی کہ مملکتِ خداداد پاکستان ایک بازو (مشرقی پاکستان) ٹوٹ کر بنگلہ دیش بن چکا تھا—— ہزاروں مسلمان شہری، فوج کے جوان اور افسر شہید ہوئے، نوے ہزار پاکستانی قیدی بن گئے —— ان کا جواب دہ کون ہوگا؟ روزِ مکافات کا ایک ٹریلر دنیا دیکھ چکی بلکہ دیکھ رہی ہے کہ خون شہیداں نے ان دونوں کرداروں کو کن حالات سے دوچار کر دیا ہے تاہم اصلی ٹریلر روزِ قیامت چلے گا۔دنیاوی ٹریلر کا مختصر حال ذیل میں درج کر رہے ہیں!

☆ اندرا گاندھی، جو نظریہ پاکستان کو خلیج بنگال میں دفن کرنے کی دعویٰ دار تھی، اس کا جو حشر ہوا، ◆ ہم اس کی بات نہیں کرتے کہ وہ تو ہندو تھی اور اس کے باپ/دادا/لیڈروں کا یہی موقف تھا۔ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ امت مسلمہ کے جن ''اشراف وعیون'' نے یہ'' کارنامہ'' سرانجام دیا، ان کا کیا حال ہوا۔تاریخ اس بارے میں بہت رحم ہے کہ اس نے نہ صرف سینکڑوں سالہ منافقانہ سازشوں کا حال اپنے صفحات میں محفوظ رکھا ہوا ہے بلکہ ماضی قریب کے واقعات تو ایسے ہیں جن سے کون سا

◆ اسے ایک معتمد سکھ گارڈ نے گولی مار کر گولڈن ٹیمپل کی بے حرمتی کا بدلہ لیا۔تاہم پاکستان کو دولخت کرنے والوں کے ساتھ بھی جو حشر ہوا، وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں!

جوان/ بوڑھا/ مرد/عورت آگاہ نہیں ـــــ آیئے ذرا تاریخ کے صفحات میں جھانک کر دیکھیں کہ ایسے تمام ''بڑے لوگوں'' کا کیا حشر ہوا؟

☆ مارچ ۲۳، ۱۹۷۱ء کو مشرقی پاکستان کی مختلف چھاؤنیوں (چٹاگانگ وغیرہ) میں پاکستانی فوج کے بنگالی نژاد افسروں نے علمِ بغاوت بلند کیا ـــــ ملٹری اکیڈیمی کاکول کے ایک بنگالی انسٹرکٹر میجر ضیاء الرحمن نے، جو اس وقت مشرقی پاکستان میں ڈیوٹی دے رہا تھا'' نام نہاد بنگلہ دیش'' کا جھنڈا بلند کیا۔ بعد میں جنرل کے عہدے تک ترقی پا گیا۔ اسی دوران اس نے بنگلہ دیش نیشنل پارٹی (BNP) کے نام سے بنائی۔ تاہم اللہ اور رسول ﷺ کے نام پر جو مملکت ۱۴ / اگست ۱۹۴۷ء کو جغرافیہ کے نقشے پر وجود میں آئی تھی، اس کو دولخت کرنے والوں کے ساتھ جو حشر قدرت نے کیا وہ انتہائی سبق آموز ہے کہ تشکیل بنگلہ دیش کے بعد بنگلہ دیش کا یہ جرنیل، چٹاگانگ سرکاری دورے پر گیا۔ وہاں سرکاری فرائض سرانجام دینے کے بعد لنچ اور ڈنر، وہاں کے GOC کے ساتھ کیا لیکن رات کو اس کے پہریداروں نے اسے سوتے میں قتل کر دیا! ـــــ

☆ ادھر فوج کے ان جرنیلوں، جو وطنِ پاک کو دولخت کرنے میں شریک کار تھے، کے بارے میں بھی، موجودہ فوج کے نوجوان لیفٹیننٹ/ کیپٹن کو علم نہیں ہوگا کہ وہ کہاں دفن ہیں؟

☆ مشرقی پاکستان میں جنگ بندی کا حکم کس نے اور کس کے ایماء پر دیا؟ اقوام متحدہ کے اجلاس میں پولینڈ کی قرارداد کس نے پھاڑی؟ اور نزلہ زکام کا شکار بھی کون ''نازک اندام'' ہوا، اور وہ بھی نیو یارک جیسے شہر میں جہاں ہر مرض کے شافی علاج کی وافر سہولتیں میسر ہیں۔

☆ وطن عزیز کو دولخت کرنے والوں کا، چند سال بعد جو حشر ہوا وہ بھی تاریخ کا ایک بہت سبق آموز واقعہ ہے ـــــ بنگلہ بندھو کو بنگالی فوج کے جوان افسروں نے یوں قتل کیا

کہ نہ صرف وہ خود مرا بلکہ تمام خاندان (سوائے حسینہ واجد بیٹی) کو بھی مروا بیٹھا۔ جو اس وقت بیرون ملک گئی ہوئی تھی!

☆ ادھر وطن عزیز کے وزیر اعظم کو اپنے ہی ملک کے ایک شہری نواب محمد احمد خان کو قتل کرنے کے جرم میں پھانسی کی سزا ہوئی۔ (ڈاکٹر نذیر شہید اور مشرقی پاکستان کے شہید ہونے والے شہری/ فوج کے جوان/ افسروں) کی تعداد کا تو اللہ تعالیٰ ہی کو علم ہے۔ نیز لاکھوں بہاری مسلمان جو آج بھی بنگلہ دیش میں نہایت کسمپرسی کی حالت میں زندہ ہیں) ان ہر دو اصحاب کی انا اور اقتدار طلبی کی بھینٹ چڑھے'' حتیٰ کہ بنگلہ دیش بننے کے بعد دار و گیر کا جو سلسلہ اس وقت چلا تھا، اس کی بازگشت آج تک جماعت اسلامی کے متعدد راہ نماؤں نیز دیگر کو سزائے موت دینے کے ''عدالتی انصاف'' کی آڑ میں کیا جا رہا ہے، اسی طرح مولوی فرید احمد، فضل القادر جو کنونشن مسلم لیگ کے صدر تھے، انہیں بھی پھانسی کی سزا ہوئی اور حد یہ ہے کہ فضل القادر کے بیٹے جو اس جنگ میں مغربی پاکستان میں زیر تعلیم تھے ان کو بھی چند سال بعد پھانسی کی سزا دے دی!ـــــ جو قوم اور ملک اپنے معاشرے کی صالح ترین، نہایت ذہین اور دانا اصحاب علم کو برداشت نہیں کرتی کیا ان پر قرآن کی ان آیات کا اطلاق نہیں ہوتا جو لوط علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قوموں کے بارے میں آیا ہے۔

سورۃ الاعراف: ۸۲، اور ۸۸

☆ اسی ٹریلر کا ایک اور پہلو بھی تاریخ کے طلباء کے لئے توجہ اور عبرت کا مقام ہے کہ ''آج کے روشن ترین اور جمہوری دور'' میں ایک شخص بیک وقت وزیر اعظم، صدر مملکت اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا روپ دھارتا ہے (صرف فرعون اور نمرود کی طرح ''خدائی کا دعویٰ'' زبانِ حال سے نہیں کیا گیا ـــــ تاہم یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ ''جمہوریت ہماری سیاست'' کا دعویداران تین مناصب (اجتماعِ ضدین) پر متمکن ہوا اور کسی دانشور نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا!

تاریخ نے اس ٹریلر کے متعدد دیگر حصے بھی محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ ان پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔

☆ بھٹو کی صاحبزادی اور وطن عزیز کی پہلی خاتون وزیراعظم کس کے اشارۂ ابرو پر قتل کی گئیں؟

☆ قتل بے نظیر سے پہلے، ان کے بھائیوں کا کیا حشر ہوا جو کسی نہ کسی انداز میں وطن عزیز کو دولخت کرنے یا اس کے خلاف سازشیں کرنے میں شریک کار تھے؟

☆ پنجاب کے ایک زمیندار/ لینڈ لارڈ/ مینڈا سائیں کا نام آج کتنے لوگ جانتے ہیں؟ ذلت و رسوائی نہ صرف اس دنیا میں بلکہ آخرت میں اس کا ساتھ نہ چھوڑے گی۔ (ان شاء اللہ)

☆ اس فہرست میں اگر چند نام موجودہ ''شریفین'' اور قارونِ زمانہ (زرداری، الطاف حسین وغیرہ) کا اضافہ بھی کر لیا جائے کہ وہ کسی انجام سے دوچار ہو رہے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ◆

درج بالا پس منظر میں اب دیکھئے قرآن مجید کی ہدایت اور اس کا حاشیہ نمبر ۹۵ جو گذشتہ صفحات میں درج ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہم جذبات میں آ کر اپنے موضوع سے بہت حد تک ہٹ گئے تاہم آج ضرورت ہے کہ اس قسم کی تمام معلومات کو نوجوان نسل کے افادۂ عام کے لئے بیان کیا جائے۔ اللہ کے دین اور اس کی ترویج واشاعت کی راہ میں جو رکاوٹیں اور مشکلات گذشتہ ۷۰ سالوں میں ''مترفین اور بڑوں'' نیز مذہبی لوگوں کے ان تمام طبقات کی جانب سے کی گئی ہیں، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ آج وطن عزیز تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ ایسے حالات میں قرآن کریم سے جو عملی راہ نمائی ایک مسلمان کو ملتی ہے، اس کی جانب مذہبی طبقے کے

◆ ذکر جب چل نکلا قیامت کا، بات پہنچی تیری جوانی تک!

اجارہ داروں اور تعلیمی نظام کے ذمہ داران (اساتذہ کرام) کی جانب سے نہیں دی گئی جب کہ قرآن، امت مسلمہ کو بار بار متنبہ کر رہا ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ کو بنی اسرائیل سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اللہ نے بنی اسرائیل کو چار ہزار سال تک امت مسلمہ کے عظیم منصب پر فائز کیے رکھا اور اس میں سینکڑوں انبیائے کرام کو مبعوث کرنا اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ آئندہ جو بھی قوم یا لوگ رسول ﷺ کی دعوت کے سچے اور مخلص دعویدار نہیں بنیں گے، اللہ تعالیٰ کا قانون ان میں سے کسی شخص/قوم کے ساتھ کوئی رو رعایت نہیں برتے گا —— آج اگر ہم اس عظیم مقصد سے پہلوتہی کے مرتکب ہوتے ہیں (العیاذ باللہ) تو کوئی دوسری قوم/لوگ اس جھنڈے کو بلند کرے گی اور وہی امت محمدیہ ﷺ کہلانے کی مستحق ہوگی! —— ہماری درج بالا گذارش کی تائید مزید آیت نمبر ۸۵ سے ہو رہی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہ خوشخبری عنایت فرمائی کہ ''اے نبیؐ، یقین جانو کہ جس نے یہ قرآن تم پر فرض کیا ہے وہ تمہیں ایک بہترین انجام کو پہنچانے والا ہے۔'' اس آیت کی تشریح میں حاشیہ نمبر ۱۰۸ کے الفاظ امت مسلمہ کے تمام طبقات بالخصوص جن کے مخاطب اس سورت میں کفار مکہ تھے، کے لئے آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہونا چاہیے!

سورہ الروم:

آیت نمبر ۱۱ میں قیامت کے وقوع پر مجرمین کے ''ہک دَک'' ہونے کا ذکر ہے (کہ وہ دنیا میں اس امر کا تصور بھی نہیں کرتے تھے کہ روز جزا ہوگا)۔ اس ضمن میں یہ بتایا گیا کہ ''ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ان کا سفارش نہ ہوگا اور وہ اپنے شریکوں کے منکر ہو جائیں گے جس روز وہ ساعت برپا ہوگی، اس دن (سب انسان) الگ گروہوں میں بٹ جائیں گے......'' (مفہوم آیت ۱۱ تا ۱۴)

ان آیات کی تشریح میں سید مودودی کا تشریحی نوٹ ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

حاشیہ نمبر ۱۵ ''اصل میں لفظ ابلاس استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں سخت مایوسی اور صدمے کی بناء پر کسی شخص کا گم سم ہو جانا، امید کے سارے راستے بند پا کر حیران و

ششدرر ہ جانا، کوئی حجت نہ پا کر دم بخود رہ جانا۔ یہ لفظ جب مجرم کے لیے استعمال کیا جائے تو ذہن کے سامنے اس کی یہ تصویر آتی ہے کہ ایک شخص عین حالت جرم میں بھرے ہاتھوں **(RED-HANDED)** پکڑا گیا ہے، نہ فرار کی کوئی راہ پاتا ہے، نہ اپنی صفائی میں کوئی چیز پیش کر کے بچ نکلنے کی توقع رکھتا ہے، اس لیے زبان اس کی بند ہے اور وہ انتہائی مایوسی دول شکستگی کی حالت میں حیران و پریشان کھڑا ہے۔'' اسی حاشیے میں مزید وضاحت کی

''اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ یہاں مجرمین سے مراد صرف وہی لوگ نہیں ہیں جنہوں نے دنیا میں قتل، چوری، ڈاکے اور اسی طرح کے دوسرے جرائم کیے ہیں، بلکہ وہ سب لوگ مراد ہیں جنہوں نے خدا سے بغاوت کی ہے، اس کے رسولوں کی تعلیم و ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کیا ہے، آخرت کی جواب دہی کے منکر یا اس سے بے فکر رہے ہیں، اور دنیا میں خدا کے بجائے دوسروں کی یا اپنے نفس کی بندگی کرتے رہے ہیں، خواہ اس بنیادی گمراہی کے ساتھ انہوں نے وہ افعال کیے ہوں یا نہ کیے ہوں جنہیں عرف عام میں جرائم کہا جاتا ہے۔ مزید برآں اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے خدا کو مان کر، اس کے رسولوں پر ایمان لا کر، آخرت کا اقرار کر کے پھر دانستہ اپنے رب کی نافرمانیاں کی ہیں اور آخر وقت تک اپنی اس باغیانہ روش پر ڈٹے رہے ہیں۔ یہ لوگ جب اپنی توقعات کے بالکل خلاف عالم آخرت میں یکا یک جی اٹھیں گے اور دیکھیں گے کہ یہاں تو واقعی وہ دوسری زندگی پیش آ گئی ہے جس کا انکار کر کے، یا جسے نظر انداز کر کے وہ دنیا میں کام کرتے رہے تھے، تو ان کے حواس باختہ ہو جائیں گے اور وہ کیفیت ان پر طاری ہوگی جس کا نقشہ یُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ کے الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔''

نیز یہاں جن شرکاء کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔ (حاشیہ ۱۶ تا ۱۸)

''شرکاء کا اطلاق تین قسم کی ہستیوں پر ہوتا ہے۔ ایک ملائکہ، انبیاء، اولیاء اور شہداء و صالحین جن کو مختلف زمانوں میں مشرکین نے خدائی صفات و اختیارات کا حامل قرار دے کر ان کے آگے مراسم عبودیت انجام دیے ہیں۔ وہ قیامت کے روز صاف کہہ دیں گے کہ تم یہ

سب کچھ ہماری مرضی کے بغیر، بلکہ ہماری تعلیم و ہدایت کے سراسر خلاف کرتے رہے ہو۔ اس لیے ہمارا تم سے کوئی واسطہ نہیں، ہم سے کوئی امید نہ رکھو کہ ہم تمہاری شفاعت کے لیے خدائے بزرگ کے سامنے کچھ عرض معروض کریں گے۔ دوسری قسم اُن اشیاء کی ہے جو بے شعور یا بے جان ہیں جیسے چاند، سورج، سیارے، درخت، پتھر اور حیوانات وغیرہ۔ مشرکین نے ان کو خدا بنایا اور ان کی پرستش کی اور ان سے دعائیں مانگیں، مگر وہ بے چارے بے خبر ہیں کہ اللہ میاں کے خلیفہ صاحب یہ ساری نیازمندیاں ان کے لیے وقف فرما رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے بھی کوئی وہاں ان کی شفاعت کے لیے آگے بڑھنے والا نہ ہوگا۔ تیسری قسم اُن اکابر مجرمین کی ہے جنہوں نے خود کوشش کر کے، مکر و فریب سے کام لے کر، جھوٹ کے جال پھیلا کر، یا طاقت استعمال کر کے دنیا میں خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرائی، مثلاً شیطان، جھوٹے مذہبی پیشوا، اور ظالم و جابر حکمران وغیرہ۔ یہ وہاں خود گرفتار بلا ہوں گے، اپنے ان بندوں کی سفارش کے لیے آگے بڑھنا تو درکنار ان کی تو الٹی کوشش یہ ہو گی کہ اپنے نامۂ اعمال کا بوجھ ہلکا کریں اور داورِ محشر کے حضور یہ ثابت کر دیں کہ یہ لوگ اپنے جرائم کے خود ذمہ دار ہیں، ان کی گمراہی کا وبال ہم پر نہیں پڑنا چاہیے۔ اس طرح مشرکین کو وہاں کسی طرف سے بھی کوئی شفاعت بہم نہ پہنچے گی۔'' (حاشیہ ۱۶)

اس وقت یہ مشرکین خود اس بات کا اقرار کریں گے کہ ہم ان کو خدا کا شریک ٹھیرانے میں غلطی پر تھے۔ ان پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ فی الواقع ان میں سے کسی کا بھی خدائی میں کوئی حصہ نہیں ہے، اس لیے جس شرک پر آج وہ دنیا میں اصرار کر رہے ہیں، اسی کا وہ آخرت میں انکار کریں گے۔'' (حاشیہ ۱۸) سید مودودیؒ نے مزید لکھا کہ

''یعنی دنیا کی وہ تمام جتھ بندیاں جو آج قوم، نسل، وطن، زبان، قبیلہ و برادری اور معاشی و سیاسی مفادات کی بنیاد پر بنی ہوئی ہیں، اس روز ٹوٹ جائیں گی، اور خالص عقیدے اور اخلاق و کردار کی بنیاد پر نئے سرے سے ایک دوسری گروہ بندی ہوگی۔ ایک طرف نوع انسانی کی تمام اگلی پچھلی قوموں میں سے مومن و صالح انسان الگ چھانٹ لیے

جائیں گے اور ان سب کا ایک گروہ ہوگا۔ دوسری طرف ایک ایک قسم کے گمراہانہ نظریات و عقائد رکھنے والے، اور ایک ایک قسم کے جرائم پیشہ لوگ اس عظیم الشان انسانی بھیڑ میں سے چھانٹ چھانٹ کر الگ نکال لیے جائیں گے اور ان کے الگ الگ گروہ بن جائیں گے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہیے کہ اسلام جس چیز کو اس دنیا میں تفریق اور اجتماع کی حقیقی بنیاد قرار دیتا ہے اور جسے جاہلیت کے پرستار یہاں ماننے سے انکار کرتے ہیں، آخرت میں اسی بنیاد پر تفریق بھی ہوگی۔ اجتماع بھی۔ اسلام کہتا ہے کہ انسانوں کو کاٹنے اور جوڑنے والی اصل چیز عقیدہ اور اخلاق ہے۔ ایمان لانے والے اور خدائی ہدایت پر نظام زندگی کی بنیاد رکھنے والی ایک امت ہیں خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے سے تعلق رکھتے ہوں، اور کفر وفسق کی راہ اختیار کرنے والے ایک دوسری امت ہیں۔ خواہ ان کا تعلق کسی نسل و وطن سے ہو۔ ان دونوں کی قومیت ایک نہیں ہوسکتی۔ یہ نہ دنیا میں ایک مشترک راہِ زندگی بنا کر ایک ساتھ چل سکتے ہیں اور نہ آخرت میں ان کا ایک انجام ہوسکتا ہے۔ دنیا سے آخرت تک ان کی راہ منزل ایک دوسرے سے الگ ہے۔ جاہلیت کے پرستار اس کے برعکس ہر زمانے میں اصرار کرتے رہے ہیں اور آج بھی اس بات پر مصر ہیں کہ جتھہ بندی نسل اور وطن اور زبان کی بنیادوں پر ہونی چاہیے، ان بنیادوں کے لحاظ سے جو لوگ مشترک ہوں انہیں بلالحاظِ مذہب وعقیدہ ایک قوم بن کر دوسری ایسی ہی قوموں کے مقابلے میں متحد ہونا چاہیے، اور اس قومیت کا ایک ایسا نظامِ زندگی ہونا چاہئے جس میں توحید اور شرک اور دہریت کے معتقدین سب ایک ساتھ مل کر چل سکیں۔ یہی تخیل ابوجہل اور ابولہب سردارانِ قریش کا تھا جب وہ بار بار محمد ﷺ پر الزام رکھتے تھے کہ اس شخص نے آکر ہماری قوم میں تفرقہ ڈال دیا ہے۔ ◆ اسی پر قرآن مجید یہاں متنبہ کر رہا ہے کہ تمہاری یہ تمام جتھہ بندیاں

◆ اس نظریے کی حامی لوگوں کی ایک جھلک ہمیں اپنی قریب ترین تاریخ میں اس وقت ملتی ہے جب انگریز اس برصغیر کو آزاد کر کے جانے پر مجبور ہوگیا تھا اس وقت منبر رسول ﷺ پر ایک شخص نے بیٹھ کر یہ راگ الاپا تھا کہ ''قومیں اوطان سے بنتی ہیں''ـــــ یعنی ہندوستان میں رہنے والی تمام قومیں (ہندو، ☜

جوتم نے اس دنیا میں غلط بنیادوں پر کر رکھی ہیں آخر کار ٹوٹ جانے والی ہیں اور نوع انسانی میں مستقل تفریق اسی عقیدے اور نظریہ حیات اور اخلاق کردار کی بنیادوں پر ہونے والی ہے جس پر اسلام دنیا کی اس زندگی میں کرنا چاہتا ہے۔ جن لوگوں کی منزل ایک نہیں ہے ان کی راہ زندگی آخر کیسے ایک ہوسکتی ہے'' (حاشیہ ۱۸)

؎ سکھ، مسلمان، عیسائی اور دیگر تمام لوگ) ایک قوم (ہندوستانی) ہیں۔ ہندوؤں کے بڑے بڑے لیڈر (گاندھی/نہرو) بھی اسی خیال کے موید تھے کہ انہیں اپنی اکثریت کے بل پر مستقبل میں پورے خطے کی قیادت وسیادت مل رہی تھی ___ تاہم مسلمانوں کے ایک بڑے لیڈر کے اس موقف کے علی الرغم علامہ اقبال نے تڑپ کو ''مولانا'' کے اس موقف کی یوں تردید کی

عجم ہنوز نہ داند مقامِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر با او نہ رسیدی تمام بولہبی است

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ مصلحتاً ان فارسی اشعار کا مدعا اور مطلب جاننے کے باوجود اس مدرسۂ فکر کے لیڈران اور پیروکار خاموش رہے اور علامہ پر کفر کا فتویٰ نہ لگایا لیکن جب ایک بندہ خدا نے اس موقف کو سلیس اردو میں اپنی کتاب کے دلائل (دینی، تاریخی اور علمی) کی بناء پر تردید کی تو نہ صرف اس وقت بلکہ آج تک بھی اس کا یہ ''گناہ عظیم'' معاف نہیں کیا گیا اور آج جب کہ دہلی، ہندوستان بالخصوص مقبوضہ کشمیر میں عملاً وہ ہو رہا ہے جس کی نشان دہی علامہ اقبال اور سید مودودی نے آج سے قریباً ایک صدی قبل کی تھی، تب بھی اس مکتب فکر کے خود ساختہ لیڈر کی زبان سے اپنے ''اکابر'' سے برأت کا اظہار کرنے کی توفیق انہیں نصیب نہیں ہوئی

یہاں ہم اپنے قارئین کو اس امر کی جانب بھی توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ امام الہند نے اپنی وصیت جس کا انکشاف ان کی ہدایت کے مطابق ان کے مرنے کے بعد شاید ۲۵ / ۳۰ سال بعد ہوا، انہوں نے گاندھی/نہرو کے ہندوازم کی برتری کے عزائم کی تکمیل کا اظہار کیا۔

اے روح محمد ﷺ تیرا یہ سادہ مسلمان کدھر جائے؟

سورہ فاطر

اپنے مطالعے کے سفر میں جب ہم سورۂ فاطر پر پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکہ میں نازل ہونے والی سورت ہے۔ اس میں کفار مکہ کو ان کے سرداروں کے غلط رویے پر تنبیہ و ملامت اور معلمانہ انداز میں فہمائش کی گئی ہے۔ آیت نمبر ۸ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو ہدایت فرمائی ہے کہ وہ اپنی جان، ان لوگوں کی خاطر غم و افسوس میں نہ گھلائیں۔ اس ضمن میں سید مودودیؒ نے حاشیہ نمبر ۱۷ میں ایک طویل تشریحی نوٹ لکھا ہے جو درج ذیل ہے۔

''پہلے فقرے اور اس فقرے کے درمیان یہ ارشاد کہ ''اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہ راست دکھا دیتا ہے'' صاف طور پر یہ معنی دے رہا ہے کہ جو لوگ اس حد تک اپنے ذہن کو بگاڑ لیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت کی توفیق سے محروم کر دیتا ہے اور انہی راہوں میں بھٹکنے کے لیے اُنہیں چھوڑ دیتا ہے جن میں بھٹکتے رہنے پر وہ خود مصر ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت سمجھ کر اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کو تلقین فرماتا ہے کہ ایسے لوگوں کو راہِ راست پر لے آنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ لہٰذا اُن کے معاملہ میں صبر کر لو اور جس طرح اللہ کو ان کی پرواہ نہیں رہی ہے تم بھی ان کے حال پر غم کھانا چھوڑ دو۔''

سید مودودی نے مزید وضاحت کی کہ ''اس مقام پر دو باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیں۔ ایک یہ کہ یہاں جن لوگوں کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ عامۃ الناس نہیں تھے بلکہ مکہ معظّمہ کے وہ سردار تھے جو نبی ﷺ کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے ہر جھوٹ، ہر فریب اور ہر مکر سے کام لے رہے تھے۔ یہ لوگ درحقیقت حضور ﷺ کے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ تھے۔ خوب جانتے تھے کہ آپ کس چیز کی طرف بلا رہے ہیں اور آپ کے مقابلہ میں وہ خود کن جہالتوں اور اخلاقی خرابیوں کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں ہیں۔ یہ سب کچھ جاننے اور سمجھ لینے کے بعد ٹھنڈے دل سے ان کا فیصلہ یہ تھا کہ محمد ﷺ کی بات کو نہیں چلنے دینا ہے۔ اور اس غرض کے لیے انہیں کوئی اوچھے ہتھیار اور کوئی ذلیل سے ذلیل ہتھکنڈا استعمال کرنے میں باک نہ تھا۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ جان بوجھ کر اور آپس میں مشورے

کر کے آئے دن ایک نیا جھوٹ تصنیف کریں اور اسے کسی شخص کے خلاف پھیلائیں وہ دنیا بھر کو دھوکا دے سکتے ہیں مگر خود اپنے آپ کو تو وہ جھوٹا جانتے ہیں اور خود اُن سے تو یہ بات چھپی ہوئی نہیں ہوتی کہ جس شخص پر انہوں نے ایک الزام لگایا ہے وہ اُس سے بری ہے۔ پھر اگر وہ شخص جس کے خلاف جھوٹے ہتھیار استعمال کیے جا رہے ہوں، ان کے جواب میں کبھی صداقت اور راستبازی سے ہٹ کر کوئی بات نہ کرے تو ان ظالموں سے یہ بات بھی کبھی چھپی نہیں رہ سکتی کہ ان کا مدمقابل ایک سچا اور کھرا انسان ہے۔ اس پر بھی جن لوگوں کو اپنے کرتوتوں پر ذرا شرم نہ آئے اور وہ سچائی کا مقابلہ مسلسل جھوٹ سے کرتے ہی چلے جائیں ان کی یہ روش خود ہی اس بات پر شہادت دیتی ہے کہ اللہ کی پھٹکار ان پر پڑ چکی ہے اور ان میں برے بھلے کی کوئی تمیز باقی نہیں رہی ہے۔'' (حاشیہ ۱۷)

''دوسری بات جسے اس موقع پر سمجھ لینا چاہیے وہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے پیش نظر محض اپنے رسولِ پاک کو اُن کے معاملے کی اصل حقیقت سمجھانا ہوتا تو وہ خفیہ طور پر صرف آپ ہی کو سمجھا سکتا تھا۔ اس غرض کے لیے وحی جلی میں علی الاعلان اُس کے ذکر کی حاجت نہ تھی۔ **قرآن مجید میں اسے بیان کرنے اور دنیا بھر کو سنا دینے کا مقصود دراصل عوام الناس کو متنبہ کرنا تھا کہ جن لیڈروں اور پیشواؤں کے پیچھے تم آنکھیں بند کیے چلے جا رہے ہو وہ کیسے بگڑے ہوئے ذہن کے لوگ ہیں اور اُن کی بیہودہ حرکات کس طرح منہ سے پکار پکار کر بتا رہی ہیں کہ ان پر اللہ کی پھٹکار پڑی ہوئی ہے''**

''اس ضمن میں کفار مکہ کے اس موقف پر کہ وہ مقتدر اور دولت وحشمت کی وجہ سے صاحبانِ عزت بھی ہیں، آیت نمبر ۱۰ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ''عزت ساری کی ساری اللہ کی ہے''......حاشیہ نمبر ۲۰ میں اس کی تشریح یوں کی گئی:

''یہ بات ملحوظ رہے کہ قریش کے سردار، نبی ﷺ کے مقابلے میں جو کچھ بھی کر رہے تھے، اپنی عزت اور اپنے وقار کی خاطر کر رہے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر محمد ﷺ کی بات چل گئی تو ہماری بڑائی ختم ہو جائے گی، ہمارا اثر ورسوخ مٹ جائے گا اور ہماری جو

عزت سارے عرب میں بنی ہوئی ہے، وہ خاک میں مل جائے گی۔اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ خدا سے کفر و بغاوت کر کے جو عزت تم نے بنا رکھی ہے، یہ تو ایک جھوٹی عزت ہے جس کے لئے خاک ہی میں ملنا مقدر ہے۔حقیقی عزت اور پائیدار عزت جو دنیا سے لے کر عقبیٰ تک کبھی ذلت آشنا نہیں ہوسکتی، صرف خدا کی بندگی ہی میں میسر آ سکتی ہے۔اس کے ہو جاؤ گے تو وہ تمہیں مل جائے گی اور اس سے منہ موڑو گے تو ذلیل وخوار ہو کر رہو گے''

ابطال شرک کے بارے میں اب ہم اپنے مطالعہ قرآن کی اس سورت کا ذکر کریں گے جو اس بارے میں اپنے انداز کی خود ہی ایک مثال ہے یعنی سورہ الکافرون

اس سورت کے دیباچہ میں سید مودودی نے واضح کیا کہ یہ سورت مذہبی رواداری کی تلقین کے لئے نازل نہیں ہوئی تھی جیسا کہ آج کل بعض لوگ خیال کرتے ہیں بلکہ اس لیے نازل ہوئی تھی کہ کفار کے دین اور ان کی پوجا پاٹ اور ان کے معبودوں سے قطعی براءت اور بیزاری ولاتعلقی کا اعلان کر دیا جائے۔اس سورت کی آیت نمبر ا، ۲ میں فرمایا گیا کہ'' کہہ دو کہ اے کافرو میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو'' اس کی وضاحت حاشیہ نمبر ۲ میں یوں کی ہے

''اس میں وہ سب معبود شامل ہیں جن کی عبادت دنیا بھر کے کفار اور مشرکین کرتے رہے ہیں، خواہ وہ ملائکہ ہوں، جن ہوں، انبیاء اور اولیا ہوں، زندہ یا مردہ انسانوں کی ارواح ہوں، یا سورج، چاند، ستارے، جانور، درخت، دریا، بت، اور خیالی دیویاں اور دیوتا ہوں۔اس پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ مشرکین عرب اللہ تعالیٰ کو بھی تو معبود مانتے تھے اور دنیا کے دوسرے مشرکین نے بھی قدیم زمانے سے آج تک اللہ کے معبود ہونے کا انکار نہیں کیا ہے۔رہے اہل کتاب تو وہ اصل معبود تو اللہ ہی کو تسلیم کرتے ہیں۔پھر ان سب لوگوں کے تمام معبودوں کی عبادت سے کسی استثناء کے بغیر براءت کا اعلان کیسے صحیح ہوسکتا ہے جب کہ اللہ بھی ان میں شامل ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کو معبودوں کے مجموعے میں ایک معبود کی حیثیت سے شامل کر کے اگر دوسروں کے ساتھ اُس کی عبادت کی جائے تو وہ شخص جو

توحید پر ایمان رکھتا ہو لازماً اس عبادت سے اپنی براءت کا اظہار کرے گا، **کیونکہ اس کے نزدیک اللہ معبودوں کے مجموعے میں سے ایک معبود نہیں بلکہ وہ ایک تنہا معبود ہے، اور اس مجموعے کی عبادت سرے سے اللہ کی عبادت ہی نہیں ہے اگرچہ اس میں اللہ کی عبادت بھی شامل ہو۔** قرآن مجید میں اس بات کو صاف صاف کہا گیا ہے کہ اللہ کی عبادت صرف وہ ہے جس کے ساتھ کسی دوسرے کی عبادت کا شائبہ تک نہ ہو، اور جس میں انسان اپنی بندگی کو بالکل اللہ ہی کے لیے خالص کر دے۔ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ۔ ''لوگوں کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ وہ بالکل یک سو ہو کر، اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اُس کی عبادت کریں'' (سورہ البینہ۔ ۵)۔ یہ مضمون بکثرت مقامات پر قرآن میں پوری وضاحت کے ساتھ اور پورے زور کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو النساء، ۱۴۵۔۱۴۶۔ الاعراف ۲۹۔ الزمر ۲، ۳، ۱۱، ۱۴، ۱۵۔ المؤمن ۱۴۔ ۶۴ تا ۶۶۔ یہی مضمون ایک حدیث قدسی میں بیان کیا گیا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں سب سے بڑھ کر ہر شریک کی شرکت سے بے نیاز ہوں۔ جس شخص نے کوئی عمل ایسا کیا جس میں میرے ساتھ کسی اور کو بھی اُس نے شریک کیا ہو اُس سے میں بَری ہوں اور وہ پورا کا پورا عمل اُسی کے لیے ہے جس کو اُس نے شریک کیا'' (مسلم، مسند احمد، ابن ماجہ)۔ پس درحقیقت اللہ کو دو یا تین یا بہت سے خداؤں میں سے ایک قرار دینا اور اُس کے ساتھ دوسروں کی بندگی و پرستش کرنا ہی تو وہ اصل کفر ہے جس سے اظہارِ براءت کرنا اس سورۃ کا مقصود ہے!

بابِ ششم

نوجوان نسل اور اقامتِ دین

یہود ونصاریٰ کو" امتِ وسط" کے منصب سے معزول کرنے کے اسباب وعلل پر ہم نے جو گزارشات گزشتہ صفحات میں پیش کی ہیں ان کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ موجودہ امت مسلمہ بھی گزشتہ بارہ / تیرہ صدیوں سے انہیں عوارض اور خرابیوں میں نہ صرف مبتلا ہے بلکہ ان خرابیوں میں بدرجہا زیادہ مبتلا ہے جن میں یہود ونصاریٰ اپنی تاریخ کے طویل دور میں مبتلا رہے ہیں۔ جب ہم اس امر کا کھوج لگاتے ہیں کہ آخر قرآن مجید کی ان اور روشن آیات کی موجودگی میں یہ کیونکر ممکن ہوا کہ امتِ محمدیہ ان برائی کے تمام گڑھوں میں گرنے سے محفوظ نہ رہ سکی جن سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں بچانے کیلئے یہ قرآن اپنے رسول ﷺ پر نازل فرمایا تھا اور صرف نازل ہی نہیں فرمایا تھا بلکہ رول ماڈل کے طور پر ایک رسول ﷺ بھی مبعوث فرمایا تھا جس کی زندگی قرآن کی روح سے مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (سورہ النجم ۲-۴)◆ "تمہارا رفیق نہ بھٹکا ہے نہ بہکا ہے۔ وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔" کے مطابق تھی۔

اور بقول اقبال رحمۃ اللہ علیہ

گفتہ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ در حلقومِ عبداللہ بود!

◆ سورۃ النجم کی آیات ۲ تا ۱۷ تک میں جو ارشاداتِ ربانی ہیں، ان کی تفصیل اور تشریح تفہیم القرآن حاشیہ جات ۳ تا ۱۴ میں دیکھنے کی چیز ہے۔

کتاب اللہ اور اسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں توقع تو نہیں تھی کہ امت مسلمہ ان گمراہیوں اور غلط کاریوں میں ملوث ہو جائیگی جس میں یہود عرصہ چار ہزار سال تک نہایت بری طرح سے پھنسے رہے۔ اس کی وجوہات پر جب بھی ہم غور کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ از آدم تا حضرت محمد ﷺ، کسی نبی نے بھی اسلام (بمعنی اطاعت الٰہی اور اتباع رسول) کے علاوہ کس تیسری بات کی تلقین و تبلیغ نہیں کی۔ تاہم بعد میں آنے والے لوگوں نے اپنے طور پر اس کلامِ الٰہی میں تحریف و تحذیف کا کام سرانجام دیا اور امتدادِ زمانہ کے باعث تعلیماتِ ربانی میں لوگوں نے اپنی طرف سے من مانی تاویلات کر دیں اور یوں وہ خالص تعلیماتِ ربانی جو انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوئی تھیں، وہ نظروں سے اوجھل ہوئی چلی گئیں اور موسیٰ علیہ السلام و عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کردہ اسلام نامی دین یہودیت اور نصرانیت/عیسائیت کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔

جہاں تک حضور علیہ السلام کی تعلیمات کا تعلق ہے تو یہ امر باعث خوشی ہے کہ قرآن مجید اپنی اصل حالت میں آج بھی محفوظ و مامون ہے اور گزشتہ ۱۴۰۰ سالوں میں اغیار کی کوششوں کے باوجود اس میں سرمو تجاوز یا غلطی کا صدور ممکن نہیں (حمید اللہ)۔ اب رہا سوال اسوۂ حسنہ کا تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بلا مبالغہ انسانی تاریخ میں ایک معجزے سے کسی طرح کم نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن کریم کی حفاظت کا جو ذمہ لیا تھا (اس کی حفاظت اور نشر و اشاعت کیلئے اپنی رحمت خاص سے مفسرین اور محدثین کرام اور دیگر اہل علم کا ایک ایسا سلسلۃ الذہب پیدا فرما دیا جو تاریخ انسانی کے ایسے نابغۂ روزگار لوگوں کی ایسی کثیر تعداد پر مشتمل تھا جو رسالت مآب ﷺ کی حیاتِ مبارکہ سے لے کر آج تک جو چودہ سو سالوں کے عرصہ پر محیط ہے جس میں شاید ہی کبھی کوئی انقطاع واقع ہوا ہو) یوں یہ سلسلہ ایک ایسے ہار کے موتیوں کی مانند ہے جو رنگ، چمک دمک اور خوبصورتی کی بناء پر ایک دوسرے سے مختلف ضرور ہیں تاہم تسبیح کے دانوں کی طرح ایک دوسرے سے باہم متصل اور جڑے ہوئے ہیں۔

درج بالا تاریخی حقائق کے علی الرغم یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ ۶۵۶ء میں شہادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ میں جو جنگ شروع ہوئی، اس کے نتیجے میں خلافتِ راشدہ کا نظام ختم ہو گیا اور بعد میں وہ دور شروع ہوا جس میں اموی، عباسی اور بعد کے ادوار میں ایک صحیح اسلامی ریاست کا وجود قائم نہ رہ سکا۔ اس دوران بہت سے فرقے معرض وجود میں آئے۔ مسلمانوں کی حکومت میں توسیع ہونے کے ساتھ ساتھ عوام الناس کے جمِ غفیر کی دینی تعلیم و تربیت کی کمی کی وجہ سے یونانی فکر و فلسفہ کے زیر اثر شکوک و شبہات کے ایک ایسے منحوس دور کا آغاز ہوا جس کا تدارک اگرچہ، اپنے اپنے عہد میں مختلف اہل علم و فضل نے اپنے طور پر کرنے کی کوشش کی تاہم موجودہ دور میں چونکہ مسلم ممالک کے عوام کی ایک بہت بڑی اکثریت دینی تعلیمات سے آگاہ نہیں اور قرآن و حدیث سے عربی، فارسی اور اردو نہ جاننے کی بنا پر پڑھا لکھا طبقہ براہ راست ان صافی چشموں سے استفادہ نہیں کر پایا۔ پھر اس پر مستزاد خودغرض اور کم علم مولوی اور پیر صاحبان نے اپنے ذاتی مقاصد کیلئے عوام الناس اور پڑھے لکھے طبقے کی ایک بہت بڑی تعداد کو مختلف فرقوں میں جکڑ رکھا ہے، اس طرح عام لوگوں میں پڑھے لکھے / خوشحال اور سیاسی اور اثر و رسوخ رکھنے والے طبقے کو قرآن و سنت سے بے بہرہ کرنے کی اس ترکیب پر عمل ہو رہا ہے کہ انہیں اسلامی تعلیمات سے برگشتہ کر دیا جائے۔

درج بالا سطور میں تفرقہ بازی کے جس طوفانِ عظیم کی جانب نہایت مختصر اشارہ کیا گیا ہے اس کی انتہا یہ ہے کہ آج کے موجودہ پاکستان میں (اور شاید امت مسلم میں بالعموم) مسلم اکثریت ۳ / ۴ بڑے بڑے فرقوں / طبقات میں بٹی ہوئی ہے۔ ان میں سے ہر فرقہ کے لوگ دین کی بہت سی جزئیات اور فروعات میں اس قدر الجھے ہوئے ہیں اور انہوں نے ان تمام تر معلومات کو اپنے اپنے حلقہ کے معتقدین کو اس قدر آگاہ (*CONSCIOUS*) کر دیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو کافر، منافق، مشرک اور نمعلوم کن کن القابات سے نوازتے ہیں۔ یاد

رہے کہ یہ گمراہی گزشتہ ۵ یا ٦ دہائیوں میں اس قدر بڑھ چکی ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے بیگانہ ہوگئے ہیں۔انہیں قرآن وحدیث سے یہ کہہ کر غافل کردیا گیا ہے کہ یہ اتنے عظیم علوم کی کتابیں ہیں کہ عوام الناس کو انہیں پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ان کیلئے وہی کچھ کافی وشافی ہے جو کچی پکی روٹی یا فضائل حضرت جی وغیرہ کی کتابوں میں لکھا گیا ہے یا ان کا مولوی/ پیر/فقیر انہیں بتارہا یا اگر وہ کسی سیاسی پارٹی کے ماننے والے ہیں تو پھر انہیں اپنے لیڈروں کے علاوہ کوئی دلیل یا قرآن وحدیث کی روشنی میں غوروفکر کرنے والا نظر ہی نہیں آتا۔گزشتہ صفحات میں بنی اسرائیل کے بارے میں جو تفصیلات دی گئی ہیں،ان کے تقابلی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان امور میں کتنی گہری اور گھمبیر قسم کی مماثلت ہے جو آج کی امت مسلمہ کو "معزول شدہ امتِ وسط" کے مذہبی طبقے کے اعمال و افکار سے ہے۔ انہیں بھی اپنے بزرگان دین، ربی، حواری کے اقوال پر اس قدر یقین تھا کہ وہ صرف اپنے علاوہ کسی دوسرے فرقے کی نجات کے قائل ہی نہ تھے۔ اب یہاں دیکھئے کہ جہاں تک دین کی اصل تعلیمات کا تعلق ہے تو وہ نہایت سادہ الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ تین عقائد پر مشتمل ہیں۔توحید، رسالت اور آخرت

دین کے ان تین عقائد کے بارے میں جو تفصیلات گذشتہ ابواب میں درج کی ہیں، ان پر ایک نظر دوبارہ ڈال لیجئے اور غور فرمائیں کہ

☆......بنی اسرائیل نے اپنے پیر وفقیر اور نام نہاد مذہبی راہنماؤں کے کہنے پر دین کی ایک ایسی خودساختہ صورت پر یقین کر کے عمل کرنا شروع کر دیا تھا جن کو کوئی نسبت تعلیماتِ موسوی (تورات/ بائبل و دیگر صحائف) سے نہ تھی۔ انہوں نے دین کے ایک ایسے ظاہری ڈھانچے پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا جو اکثر حالات میں دین موسوی کی تعلیمات کے برعکس تھا (باب جرائم بنی اسرائیل) اور اس پر تمام بنی اسرائیل کا اتفاق رائے اور عمل تھا۔ بعینہ یہی صورت حال امت مسلمہ کی بھی ہوگئی ہے۔توحید ورسالت اور آخرت اور ان کے مضمرات واثرات کے علی الرغم جن کی وجہ سے ایک انسان کی عملی زندگی اتباع رسول کا

نمونہ بن سکتی ہے اور جن تعلیمات پر عمل کی بناء پر اللہ کے رسول ﷺ نے ایک نہایت قلیل مدت میں تمام عرب کو مشرف بہ اسلام کر لیا تھا اور بعد میں خلفائے راشدین و دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اعمال صالحہ کی بدولت ایک دنیا میں دین الٰہی کو غلبہ حاصل ہو گیا تھا، ان تمام اعمال صالحہ پر امتِ محمدیہ پر امت مسلمہ اپنی زندگی میں عمل نہ کر سکی۔ ہم وہ ایک ہزار سال تک اس برصغیر پر حکمرانی کے باوجود اپنے عمل سے ہندوؤں کو مسلمان نہ کر سکے تاہم جو مسلمان ہوئے، وہ بھی اپنی خاندانی ہندووانہ/مشرکانہ رسم و رواج سے اپنا دامن نہ چھڑا سکے۔ مندروں کی جگہ مزاروں اور عرسوں نے لے لی۔ نوبت بہ اینجا رسید کہ محرم کے تعزیوں کی نقل میں میلاد النبی ﷺ کے نام پر جو کچھ کیا جاتا ہے، اسے کیا نسبت نبوت اور خلافت راشدہ کے تعامل سے ہے اور اس طرز عبادت کو تاریخ کے کن صفحات سے اخذ کیا گیا ہے؟

عقل عیار ہے، سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بیچارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم!

امت مسلم کے ۴ / ۵ بڑے بڑے فقہی مسالک، جن کے معتقدین ۹۵ فی عوام الناس اور خواص ہیں، انہیں یہ باور کرا دیا گیا ہے کہ تمہاری اخروی بھلائی کیلئے صرف یہ ضروری ہے کہ تم پانچ وقت کی نماز پڑھ لو۔ رمضان میں روزے رکھ لو۔ زکوٰۃ ادا کرو اور ہر سال حج/عمرہ کر لو (ایک متمول طبقہ اسے فرض سمجھ کر ہر سال ادا کرنا ضروری سمجھتا ہے) جبکہ امتِ مسلم کی ۷۰، ۸۰ فی صد آبادی دو وقت کی روٹی، تن پر کپڑا، پیر میں جوتا، تعلیم و صحت کے اخراجات نہ ہونے اور نہایت گندی گلیوں میں گندے پانی کے جوہڑوں اور گندگی کے ڈھیروں کے قرب میں زندہ رہنے پر مجبور ہیں۔ پھر اس خوشحال طبقے اور مترفین کا اپنا یہ حال ہے کہ اپنے پیر/فقیر/مولوی/عالم کو نذر نیاز پیش کرنے کے بعد وہ اپنے آپ کو اس جہاد نفس سے بالاتر سمجھ لیتے ہیں جس کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کے بیشتر رشتے دار، ہمسائے، محلہ دار، اہل شہر اور امت محمدیہ کے لوگ ان تمام سہولتوں سے بھی بہرہ مند ہوں جن کا ذکر درج بالا سطور میں کیا گیا۔ یہ طبقہ نذر و نیاز دینے کے بعد اپنے اپنے سیاسی/مذہبی لیڈر کے ایماء پر

ملکی حکومت کو ٹیکس دینے سے اس حد تک گریز کرتے ہیں کہ ۲۲ کروڑ کی آبادی والے ملک میں صرف ایک فی صد لوگ یا کمپنیاں انکم ٹیکس کا ۸۳ فی صد حصہ ادا کرتی ہیں۔ان میں وہ سرکاری اور غیر ملکی کمپنیوں کے ملازمین بھی شامل ہیں جن کی ماہانہ تنخواہ سے ماہانہ ٹیکس سرکاری/ کمپنی کے قوانین کے تحت پہلے ہی کاٹ لیا جاتا ہے جب کہ اربوں پتی سرمایہ دار، کارخانہ دار، زمیندار، وڈیرے، سیاستدان، پیر صاحبان اور دینی راہ نما (جن کے ماہانہ گھریلو اخراجات لاکھوں سے تجاوز کرتے ہیں) اول تو ٹیکس دیتے ہی نہیں اور اگر دیتے ہیں تو مختلف حیلوں/ بہانوں سے بہت کم رقم آمدنی ظاہر کرتے ہیں تاکہ ٹیکس کی بہت ہی قلیل رقم ادا کی جائے۔یہی حال اس تاجر طبقے، پراپرٹی کا کاروبار کرنے والے، کاریں بیچنے والے، سونے اور ڈالر کا کاروبار کرنے والے، بینکوں کے مالکان و دیگر طبقات کے لوگوں کا بھی ہے!

یہاں کسی کو اس امر کا شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہم نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج / عمرہ جیسی عبادات کی اہمیت کے قائل نہیں۔ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ تمام ارکان اسلام بلاشبہ ضروری ہیں تاہم ان سب کی حیثیت ان اعمال و وظائف کی ہے جن کا مقصد ایک صالح معاشرے کی تشکیل سے ہے۔ پانچ وقت کی نماز، ایک مہینے کے فرض روزے (یا نفلی روزے) حج / عمرہ کا مقصد وحید صرف اور صرف یہ ہے کہ ایک فرد کے ذہن میں اللہ کی ذات والا صفات جو عالم الغیب ہے، (ایک ایک انسان کا کوئی عمل جہاں، جس جگہ، جس وقت بھی کیا جائے، اس کی نظروں سے اوجھل نہیں) اور جو بہت باریک بینی سے حساب لینے والا ہے۔ اس کو ہر وقت ذہن میں یاد رکھا جائے۔اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کے تمام اسمائے حسنہ کے حوالے سے جو خبیر، علیم، بے نیاز، جابر اور متکبر نیز دیگر صفات عالیہ سے متصف ذات ہے، اس کے ہر حکم، اس کے نبی ﷺ کے ہر ہر عمل اور اسوۂ حسنہ (چاہے راستے سے پھل/ سبزی/ کانٹا/ پتھر وغیرہ کا ہٹانا جیسے معمولی کام ہی کیوں نہ ہوں)، یہ بھی اجر و ثواب کا باعث ہوتا ہے۔ امتِ محمدیہ نے روز سبت کی جگہ (یہودیوں کے طرزِ عمل کے مطابق) بے شمار ایسے حیلے اور بہانے تراش لئے ہیں جن سے اعمال صالحہ اور اتباع رسول ﷺ کا مقصد

وحید، جسے قرآن مجید نے امت مسلمہ کو اس منصب پر فائز کرتے ہوئے، سونپا تھا، اس سے پہلوتہی کی گئی ہے اور جسے علامہ اقبال نے قرآن کریم کے ہی دو الفاظ سے اخذ کیا ہے۔

اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری!

ایسے حالات میں جبکہ وہ مقصد وحید جس کی خاطر امت مسلم کو مبعوث کیا گیا تھا، پورا نہ ہو رہا ہو تو پھر اگر امت موجودہ زمانے کے مسائل کے گرداب میں مبتلا نہ ہو تو اور کیا ہو؟ تاہم اس تمام کے باوجود امتِ مسلمہ کے موجودہ حالات میں جس قدر رزق کی فراوانی (پھلوں/سبزیوں/دیگر اجناس اور دودھ/ گوشت وغیرہ) کی شکل میں ہو رہی ہے، وہ بھی دراصل قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ایک آزمائش سے کم نہیں۔ **فراوانی کے باوجود نافرمانی، عذاب الٰہی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ گزشتہ تاریخ اقوام سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے!**

اس ضمن میں قرآن کی مختلف سورتوں/آیات سے جو راہ نمائی ملتی ہے، وہ اپنی جگہ بہت ہی کافی وشافی ہیں تاہم سورہ ھود کی آیات ۱۱۶ تا ۱۱۹ میں اسی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ ان آیاتِ کریمہ کی تفصیل وتشریح کیلئے سید مودودیؒ نے لکھا

''ان آیات میں نہایت سبق آموز طریقے سے ان قوموں کی تباہی کے اصل سبب پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کی تاریخ پچھلے چھ رکوعوں میں بیان ہوئی ہے۔ اس تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا جاتا ہے کہ صرف انہی قوموں کو نہیں، بلکہ پچھلی انسانی تاریخ میں جتنی قومیں بھی تباہ ہوئی ہین ان سب کو جس چیز نے گرایا وہ یہ تھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی نعمتوں سے سرفراز کیا تو وہ خوشحالی کے نشے میں مست ہو کر زمین میں فساد برپا کرنے لگیں اور ان کا اجتماعی ضمیر اس درجہ بگڑ گیا کہ یا تو ان کے اندر ایسے نیک لوگ باقی رہے ہی نہیں جو ان کو روکتے، یا اگر کچھ لوگ ایسے نکلے بھی تو وہ اتنے کم تھے اور ان کی آواز اتنی کمزور تھی کہ ان کے روکنے سے فساد نہ رک سکا۔ یہی چیز ہے جس کی بدولت آخر کار یہ قومیں اللہ تعالیٰ کے غضب کی مستحق ہوئیں، ورنہ اللہ کو اپنے بندوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے کہ وہ تو بھلے کام کر

رہے ہوں اور اللہ ان کو خواہ مخواہ عذاب میں مبتلا کر دے۔ اس ارشاد سے یہاں تین باتیں ذہن نشین کرنی مقصود ہیں: (حاشیہ ۱۱۵)''

☆......''ایک یہ کہ ہر اجتماعی نظام میں ایسے نیک لوگوں کا موجود رہنا ضروری ہے **جو خیر کی دعوت دینے والے اور شر سے روکنے والے ہوں۔ اس لئے کہ خیر ہی وہ چیز ہے جو اصل میں اللہ کو مطلوب ہے، اور لوگوں کے شرور کو اگر اللہ برداشت کرتا بھی ہے تو اس خیر کی خاطر کرتا ہے جو ان کے اندر موجود ہو** اور اسی وقت تک کرتا ہے جب تک ان کے اندر خیر کا کچھ امکان باقی رہے۔ مگر جب کوئی انسانی گروہ اہل خیر سے خالی ہو جائے اور اس میں صرف شریر لوگ ہی باقی رہ جائیں، یا اہل خیر موجود ہوں بھی تو کوئی ان کی سن کر نہ دے اور پوری قوم کی قوم اخلاقی فساد کی راہ پر بڑھتی چلی جائے، تو پھر خدا کا عذاب اس کے سر پر اس طرح منڈلانے لگتا ہے جیسے پورے دنوں کی حاملہ کہ کچھ نہیں کہہ سکتے کب اس کا وضع حمل ہو جائے۔''

☆......''دوسرے یہ کہ جو قوم اپنے درمیان سب کچھ برداشت کرتی ہو مگر صرف انہی چند گنے چنے لوگوں کو برداشت کرنے کیلئے تیار نہ ہو جو اسے برائیوں سے روکتے او ربھلائیوں کی دعوت دیتے ہوں، تو سمجھ لو کہ اس کے برے دن قریب آ گئے ہیں، کیونکہ اب وہ خود ہی اپنی جان کی دشمن ہو گئی ہے۔ اسے وہ سب چیزیں تو محبوب ہیں جو اس کی ہلاکت کی موجب ہیں اور صرف وہی ایک چیز گوارا نہیں ہے جو اس کی زندگی کی ضامن ہے۔''

☆......''تیسرے یہ کہ ایک قوم کے مبتلائے عذاب ہونے یا نہ ہونے کا آخری فیصلہ جس چیز پر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں دعوتِ خیر پر لبیک کہنے والے عناصر کس حد تک موجود ہیں۔ اگر اس کے اندر ایسے افراد اتنی تعداد میں نکل آئیں جو فساد کو مٹانے اور نظام صالح کو قائم کرنے کیلئے کافی ہو تو اس پر عذاب عام نہیں بھیجا جاتا بلکہ ان صالح عناصر کو اصلاح حال کا موقع دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر پیہم سعی و جہد کے باوجود اس میں سے اتنے آدمی نہیں نکلتے جو اصلاح کیلئے کافی ہو سکیں، اور وہ قوم اپنی گود سے چند ہیرے پھینک دینے

کے بعد اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیتی ہے کہ اب اس کے پاس کوئلے ہی کوئلے باقی رہ گئے ہیں تو پھر کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی کہ وہ بھٹی سلگا دی جاتی ہے جو ان کوئلوں کو پھونک کر رکھ دے۔(مزید تشریح کیلئے ملاحظہ ہوالذاریات، حاشیہ ۳۴)''

از صد سخنِ پیرم، یک حرف مرا یاداست
عالم نہ شود ویراں تامیکدہ آباد است!

سورہ ھود کی آیات ۱۱۶ تا ۱۱۹ کی تشریح محمد کرم شاہؒ (۱۴۰۲ھ) نے حاشیہ نمبر ۱۶۳ میں یوں کی ''......اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب شوریدہ سر اور بددماغ لوگوں نے شریعت کے احکام کی خلاف ورزی شروع کی تو قوم کا ایک سنجیدہ اور سمجھ دار طبقہ آگے بڑھتا اور ان لوگوں کو سمجھا تا کہ تم اس سرکشی کی راہ کو اختیار نہ کرو۔ کیونکہ یہ راہ تمہاری بربادی کے گڑھے میں جا کر پھینکے گی۔ **وہ لوگ جو سمجھ بوجھ کے مالک تھے وہ گوشۂ عافیت میں دبکے بیٹھے رہے ان کے سامنے ان کی قوم گل کھلاتی رہی لیکن وہ اس خوف سے ان کے مزاحم نہ ہوئے کہ مبادا انہیں بھی ہدف تنقید بننا پڑے۔ اس مجرمانہ خاموشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم بھی غرق ہوئی اور یہ بھی اس کے ساتھ غرق کر دیئے گئے''**......مزید حاشیہ نمبر ۱۶۴ میں لکھا کہ ''بہت کم ایسے لوگ تھے جنہوں نے انبیاء کے دوش بدوش کھڑے ہو کر تبلیغ حق کا دشوار فریضہ ادا کیا اور ہم نے ان کو اپنے عذاب سے نجات دی'' (آیت ۱۱۴)

سید مودودیؒ نے اس تسلسل میں سورۃ الانعام (آیت ۳۵ حاشیہ نمبر ۲۴ میں یوں مزید تشریح کی:''یعنی اگر صرف یہی بات مطلوب ہوتی کہ تمام انسان کسی نہ کسی طور پر راست رو بن جائیں تو نبی بھیجنے اور کتابیں نازل کرنے اور مومنوں سے کفار کے مقابلہ میں جدو جہد کرانے اور دعوتِ حق کو تدریجی تحریک کی منزلوں سے گزارنے کی حاجت ہی کیا تھی۔ یہ کام تو اللہ کے ایک ہی تخلیقی اشارہ سے انجام پا سکتا تھا۔ لیکن اللہ اس کام کو اس طریقہ پر کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا منشاء تو یہ ہے کہ حق کو دلائل کے ساتھ لوگوں کے سامنے

پیش کیا جائے۔ پھران میں سے جو لوگ فکرِ صحیح سے کام لے کر حق کو پہچان لیں وہ اپنے آزادانہ اختیار سے اس پر ایمان لائیں۔ اپنی سیرتوں کو اس کے سانچے میں ڈھال کر باطل پرستوں کے مقابلہ میں اپنا اخلاقی تفوق ثابت کریں۔ انسانوں کے مجموعہ میں سے صالح عناصر کو اپنے طاقتور استدلال، اپنے بلند نصب العین، اپنے بہتر اصولِ زندگی اور اپنی پاکیزہ سیرت کی کشش سے اپنی طرف کھینچتے چلے جائیں اور باطل کے خلاف پیہم جدوجہد کر کے فطری ارتقاء کی راہ سے اقامت دین حق کی منزل تک پہنچیں۔ اللہ اس کام میں ان کی راہنمائی کرے گا اور جس مرحلہ پر جیسی مدد اللہ سے پانے کا وہ اپنے آپ کو مستحق بنائیں گے وہ مدد بھی انہیں دیتا چلا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ اس فطری راستے کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ محض اپنی قدرتِ قاہرہ کے زور سے افکار فاسدہ کو مٹا کر لوگوں میں فکرِ صالح پھیلا دے اور تمدن فاسد کو نیست و نابود کر کے مدنیتِ صالحہ تعمیر کر دے تو ایسا ہرگز نہ ہوگا کیونکہ یہ اللہ کی اس حکمت کے خلاف ہے جس کے تحت اس نے انسان کو دنیا میں ایک ذمہ دار مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے، اسے تصرف کے اختیارات دیئے ہیں، طاعت و عصیان کی آزادی بخشی ہے، امتحان کی مہلت عطا کی ہے اور اس کی سعی کے مطابق جزا اور سزا دینے کیلئے فیصلہ کا ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔''

نوجوان نسل اور اقامتِ دین

یہود و انصاری کے ضمن میں اپنے مطالعہ قرآن کریم کے سلسلہ میں ایک اور موضوع جس نے اپنی جانب ہماری توجہ مبذول کرائی وہ قرآن کریم میں زمان و مکان کے تصور سے ماوراء نوجوان نسل کا وہ من موہنا کردار ہے جو انہوں نے اپنے اپنے ادوار میں مختلف انبیاء کرام کی دعوت توحید پر لبیک کہتے ہوئے پیش کیا۔ آدم علیہ السلام کے اس بیٹے سے لے کر جس نے اپنے بھائی کے قتل کرنے کے ارادے کی نفی کرتے ہوئے انسانی جان کے تحفظ کی پاسداری کا خیال کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھانجے / بھتیجے (حضرت لوط علیہ السلام) اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون

علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریین، اصحاب کہف اور نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کے دور تک حضرت علی رضی اللہ عنہ، خاندانِ یاسر کی حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا، حضور ﷺ کے قریبی ساتھی حضرت بلال رضی اللہ عنہ بعد ازاں سانحہ ٔ کربلا کے شہیدوں کے سردار حضرت حسین علیہ السلام اور دیگر لوگ، **یہ سب اپنے زمانے کے نوجوان لوگ ہی تھے**۔ ان تمام تر معلومات نے اس امر کی تحریک دی کہ چند الفاظ ان تمام نوجوان افراد کو خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے بھی لکھے جائیں جنہوں نے انسانیت کے ہر دور میں دین کا علم بلند کیا۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ انبیائے کرام کی تعلیمات کے نتیجے میں ان کی اقوام کے بزرگ، بڑے شیوخ / سردار، مذہبی عالم، قبائلی سردار وغیرہ مل کر انبیائے کرام کی دعوت کو ناکام بنانے میں سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے، نوجوان نسل کے ان افراد نے سچائی کی دعوت پر لبیک کہا اور اس دعوت کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔

با آں گروہ کہ از ساغر وفا مستند
سلام ما برسانید ہر کجا ہستند!

علامہ اقبال نے بھی نوجوان نسل کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند!

مزید فرمایا کہ

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسین علیہ السلام ابتدا ہے اسماعیل علیہ السلام!

ذیل کی چند سطور اس قبیلۂ نوجوانان کو سلامِ عقیدت پیش کرنے کیلئے تحریر کی جا رہی ہیں۔ تاہم یہ موضوع از خود اس قدر متنوع اور تفصیل طلب ہے کہ اس کیلئے علیحدہ سے ایک کتاب کی ضرورت ہے جس میں ابتدائے انسانیت سے لے کر آج تک کے مختلف زمانوں اور ادوار میں پائے جانے والے حق کے ان نوجوان پرستاروں کی سوانح اور ان کے کارناموں

کا تذکرہ کیا جائے۔ تاہم ہم اپنی اس گفتگو کو محدود کرتے ہوئے، اپنے موضوع کی مناسبت سے، صرف ان چند نوجوانوں کا تذکرہ کریں گے جو دورانِ مطالعہ قرآن ہمارے علم میں آئے اور جن کی جانب ہماری توجہ مبذول ہوئی۔ جہاں تک سیرت پاک میں نوجوان نسل اور غلاموں (مردوزن) کے ساتھ کفار کی جانب سے جس بہیمانہ سلوک کا مظاہرہ کیا گیا اس کے لئے سیرت کی کتب از قسم محسنِ انسانیت از نعیم صدیقی ۱۹۷۸ء، اور الرحیق المختوم از مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری ۱۹۹۷ نیز دیگر کتبِ سیرت کے مطالعہ کی سفارش کریں گے۔

نوجوان اور غریب لوگوں پر کفار مکہ کے طعن وتعریض کا سلسلہ پہلی مرتبہ سورۃ الانعام (آیت نمبر ۵۱ تا ۵۵) میں ذکر ہوا۔ اللہ رب العزت نے اپنے رسول ﷺ (اور بعد میں آنے والے اصحاب علم وفضل) کو جو ہدایت فرمائی، اس کا مفہوم یہ ہے کہ (حاشیہ ۳۴)

☆ ......ان لوگوں کو نصیحت کرو جو اپنے رب کے سامنے پیش ہونے کا یقین رکھتے ہیں شاید کہ وہ خدا ترسی کی روش اختیار کرلیں۔

☆ ......جو لوگ اپنے رب کو پکارتے ہیں، انہیں اپنے سے دور مت پھینکو ان کے حساب میں سے کسی چیز کا بار تم پر نہیں اور تمہارے حساب میں سے کی چیز کا بار ان پر نہیں۔ اگر انہیں دور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہو گے۔

☆ ......دراصل ہم نے اس طرح ان لوگوں میں سے بھی کو بعض کو بعض کے ذریعہ سے آزمائش میں ڈالا ہے۔

اس ضمن میں سید مودودیؒ نے حاشیہ نمبر ۳۴ میں لکھا:

''قریش کے بڑے بڑے سرداروں اور کھاتے پیتے لوگوں کو نبی ﷺ پر منجملہ اور اعتراضات کے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ آپ کے گرد وپیش ہماری قوم کے غلام، موالی اور ادنی طبقہ کے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ وہ طعنہ دیا کرتے کہ اس کو ساتھی بھی کیسے کیسے معزز لوگ ملے ہیں۔ بلال، عمار، صہیب اور خباب۔ بس یہی لوگ اللہ کو ہمارے درمیان ایسے ملے جس کو برگزیدہ کیا جاسکتا تھا، پھر وہ ان ایمان لانے والوں کی خستہ حالی کا مذاق اڑانے پر ہی

اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ ان میں سے جس جس سے کبھی پہلے کوئی اخلاقی کمزوری ظاہر ہوئی تھی اس پر بھی حرف گیریاں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ فلاں جو کل تک یہ تھا اور فلاں جس نے یہ کہا تھا آج وہ بھی اس "برگزیدہ گروہ" میں شامل ہے۔''۔۔۔۔۔انہی باتوں کا جواب یہاں دیا جارہا ہے۔۔۔۔۔ اسی ضمن میں اگلے حاشیہ نمبر ۳۶ میں لکھا کہ "غریبوں اور مفلسوں اور ایسے لوگوں کو جو سوسائٹی میں ادنی حیثیت رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے ایمان کی توفیق دے کر ہم نے دولت اور عزت کا گھمنڈ رکھنے والے لوگوں کو آزمائش میں ڈالا ہے۔"

اسی تسلسل میں حاشیہ نمبر ۳۷ میں وضاحت کی کہ

''جو لوگ اس وقت نبی ﷺ پر ایمان لائے تھے ان میں سے بکثرت لوگ ایسے بھی تھے جن سے زمانۂ جاہلیت میں بڑے بڑے گناہ ہو چکے تھے۔ اب اسلام قبول کرنے کے بعد اگرچہ ان کی زندگیاں بالکل بدل گئی تھیں لیکن مخالفین اسلام ان کو سابق زندگی کے عیوب وافعال کے طعنے دیتے تھے۔ اس پر فرمایا جارہا ہے کہ اہل ایمان کو تسلی دو اور انہیں بتاؤ کہ جو شخص توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیتا ہے اس کے پچھلے قصوروں پر گرفت کرنے کا طریقہ اللہ کے ہاں نہیں ہے۔"

مفتی محمد شفیع نے اپنی تفسیر کی جلد تین (ص ۳۳۱) سے لے کر متعدد صفحات میں اس ضمن میں بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے جو پڑھنے کے لائق ہے

اللہ تعالیٰ نے سورہ یونس کی آیت نمبر ۸۳ میں فرمایا کہ

"(پھر دیکھو) موسیٰ علیہ السلام کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا۔۔۔۔۔"

اس کی تشریح میں جو نوٹ لکھا گیا وہ درج ذیل ہے:

''متن میں لفظ ذُرِّيَّةٌ استعمال ہوا ہے جس کے معنی اولاد کے ہیں۔ ہم نے اس کا ترجمہ "نوجوان" کیا ہے۔ مگر دراصل اس خاص لفظ کے استعمال سے جو بات قرآن مجید بیان کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ اس پرخطر زمانے میں حق کا ساتھ دینے اور علمبردار حق کو اپنا

رہنما تسلیم کرنے کی جرأت چند لڑکوں اور لڑکیوں نے تو کی مگر ماؤں اور باپوں اور قوم کے سن رسیدہ لوگوں کو اس کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ ان پر مصلحت پرستی اور دنیوی اغراض کی بندگی اور عافیت کوشی کچھ اس طرح چھائی رہی کہ وہ ایسے حق کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوئے جس کا راستہ ان کو خطرات سے پر نظر آ رہا تھا۔ بلکہ وہ الٹے نوجوانوں ہی کو روکتے رہے کہ موسیٰ کے قریب نہ جاؤ۔ تم خود بھی فرعون کے غضب میں مبتلا ہو گے اور ہم پر بھی آفت لاؤ گے۔'' (حاشیہ نمبر ۷۸)

''اس آیت کی مزید وضاحت جاری رکھتے ہوئے سید مودودیؒ نے تحریر کیا کہ ''یہ بات خاص طور پر قرآن نے نمایاں کر کے اس لئے پیش کی ہے کہ مکہ کی آبادی میں سے بھی محمد ﷺ کا ساتھ دینے کیلئے جو لوگ آگے بڑھے تھے وہ قوم کے بڑے بوڑھے اور سن رسیدہ لوگ نہ تھے بلکہ چند باہمت نوجوان ہی تھے۔ ابتدائی مسلمان جو ان آیات کے نزول کے وقت ساری قوم کی شدید مخالفت کے مقابلے میں صداقتِ اسلامی کی حمایت کر رہے تھے اور ظلم وستم کے اس طوفان میں جن کے سینے اسلام کے لئے سپر بنے ہوئے تھے۔ ان میں مصلحت کوش بوڑھا کوئی نہ تھا۔ سب کے سب جوان لوگ ہی تھے۔ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے لوگ قبول اسلام کے وقت ۲۰ سال سے کم عمر کے تھے۔ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ، بلال رضی اللہ عنہ، اور صہیب رضی اللہ عنہ کی عمریں ۲۰ اور ۳۰ کے درمیان تھیں۔ ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ، زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ، ۳۰ اور ۳۵ سال کے درمیان عمر کے تھے۔ ان سے زیادہ سن رسیدہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے اور ان کی عمر بھی ایمان لانے کے وقت ۳۸ سال سے زیادہ نہ تھی۔ ابتدائی مسلمانوں میں صرف ایک صحابی کا نام ہمیں ملتا ہے جن کی عمر نبی ﷺ سے زیادہ تھی یعنی حضرت عبیدہ بن حارث مطلبی اور غالباً پورے گروہ میں ایک ہی صحابی حضور ﷺ کے ہم عمر تھے یعنی عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ'' (حاشیہ ۷۸)

سورہ یونس کی انہی آیات کے تسلسل میں آیت نمبر ۸۵ میں ایک دعا کا ذکر ہے جو نوجوانوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت کے جواب میں کی کہ "ہم نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا، اے ہمارے رب، ہمیں ظالم لوگوں کیلئے فتنہ نہ بنا اور اپنی رحمت سے ہم کو کافروں سے نجات دے"۔

اس کی تشریح میں سید مودودیؒ نے حاشیہ ۸۰ تا ۸۳ میں لکھا کہ

''متن میں لفظ مسرفین استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنے والا۔ مگر اس لفظی ترجمہ سے اس کی اصل روح نمایاں نہیں ہوتی۔ مسرفین سے مراد دراصل وہ لوگ ہیں جو اپنے مطلب کیلئے کسی برے سے برے طریقے کو بھی اختیار کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ کسی ظلم اور کسی بداخلاقی اور کسی وحشت و بربریت کے ارتکاب سے نہیں چوکتے اپنی خواہشات کے پیچھے ہر انتہا تک جاسکتے ہیں۔ ان کے لئے کوئی حد نہیں جس پر جا کر وہ رک جائیں۔'' (حاشیہ نمبر ۸۰)

''ظاہر ہے کہ یہ الفاظ کسی کافر قوم کو خطاب کر کے نہیں کہے جاسکتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد صاف (بتا رہا ہے) ہے کہ بنی اسرائیل کی پوری قوم اس وقت مسلمان تھی، اور حضرت موسیٰ ان کو یہ تلقین فرما رہے تھے کہ اگر تم واقعی مسلمان ہو جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے، تو فرعون کی طاقت سے خوف نہ کھاؤ بلکہ اللہ کی طاقت پر بھروسہ کرو۔'' (حاشیہ ۸۱)

''یہ جواب ان نوجوانوں کا تھا جو موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوئے تھے۔ یہاں قَالُوا کی ضمیر قوم کی طرف نہیں بلکہ ذُرِّيَّةٌ کی طرف پھر رہی ہے جیسا کہ سیاق کلام سے خود ظاہر ہے۔''

''ان صادق الایمان نوجوانوں کی یہ دعا کہ ہمیں ظالم لوگوں کیلئے فتنہ نہ بنانا بڑے وسیع مفہوم پر حاوی ہے۔ گمراہی کے عام غلبہ و تسلط کی حالت میں جب کچھ لوگ قیام حق کے

لئے اٹھتے ہیں، تو انہیں مختلف قسم کے ظالموں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ایک طرف باطل کے اصلی علمبردار ہوتے ہیں جو پوری طاقت سے ان داعیانِ حق کو کچل دینا چاہتے ہیں دوسری طرف نام نہاد حق پرستوں کا ایک اچھا خاصا گروہ ہوتا ہے جو حق کو ماننے کا دعویٰ تو کرتا ہے مگر باطل کی قاہرانہ فرماں روائی کے مقابلہ میں اقامت حق کی سعی کو غیر واجب، لا حاصل، یا حماقت سمجھتا ہے اور اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنی اس خیانت کو جو وہ حق کے ساتھ کر رہا ہے کسی نہ کسی طرح درست ثابت کر دے اور ان لوگوں کو الٹا برسر باطل ثابت کر کے اپنے ضمیر کی خلش کو مٹائے جو ان کی دعوت اقامتِ دینِ حق سے اس کے دل کی گہرائیوں میں جلی یا خفی طور پر پیدا ہوتی ہے۔تیسری طرف عامۃ الناس جو الگ کھڑے تماشا دیکھ رہے ہوتے ہیں اور ان کا ووٹ آخر کار اسی طاقت کے حق میں پڑا کرتا ہے جس کا پلہ بھاری رہے، خواہ وہ طاقت حق ہو یا باطل۔اس صورت حال میں ان داعیان حق کی ہر ناکامی، ہر مصیبت، ہر غلطی، ہر کمزوری اور ہر خامی مختلف گروہوں کے لئے مختلف طور پر فتنہ بن جاتی ہے۔وہ کچل ڈالے جائیں یا شکست کھا جائیں تو پہلا گروہ کہتا ہے کہ حق ہمارے ساتھ تھا نہ کہ ان بے وقوفوں کے ساتھ جو ناکام ہو گئے۔دوسرا گروہ کہتا ہے کہ دیکھ لیا! ہم نہ کہتے تھے کہ ایسی بڑی بڑی طاقتوں سے ٹکرانے کا حاصل چند قیمتی جانوں کی ہلاکت کے سوا کچھ نہ ہوگا اور آخر کار اس تہلکہ میں اپنے آپ کو ڈالنے کا ہمیں شریعت نے مکلّف ہی کب کیا تھا۔دین کے کم سے کم ضروری مطالبات تو ان عقائد و اعمال سے پورے ہو ہی رہے تھے جن کی اجازت فراعنۂ وقت نے دے رکھی تھی۔ ◆ تیسرا گروہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ حق وہی ہے جو غالب رہا۔اسی طرح اگر وہ اپنی دعوت کے کام میں کوئی غلطی کر جائیں، یا مصائب و مشکلات کی سہار نہ ہونے کی وجہ سے کمزوری دکھا جائیں، یا ان سے، بلکہ ان کے کسی ایک

◆ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا

ملاں کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

فرد سے بھی کسی اخلاقی عیب کا صدور ہو جائے تو بہت سے لوگوں کے لئے باطل سے چمٹے رہنے کے ہزار بہانے نکل آتے ہیں اور پھر اس دعوت کی ناکامی کے بعد مدتہائے دراز تک کسی دوسری دعوت حق کے اٹھنے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ یہ بڑی معنی خیز دعا تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے ان ساتھیوں نے مانگی تھی کہ خدایا ہم پر ایسا فضل فرما کہ ہم ظالموں کے لئے فتنہ بن کر نہ رہ جائیں۔ یعنی ہم کو غلطیوں سے، خامیوں سے، کمزوریوں سے بچا اور ہماری سعی کو دنیا میں باور آور کردے، تاکہ ہمارا وجود تیری خلق کے لئے سبب خیر بنے نہ کہ ظالموں کے لئے وسیلۂ شر (حاشیہ ۸۳)''

اصحاب کہف:

بنی اسرائیل کی بطور امت کے ضمن میں سب سے پہلے جن نوجوانوں کا ذکر قرآن کریم میں آتا ہے، وہ اصحاب کہف ہیں۔ اہل کتاب کے مشورے سے کفار مکہ نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے تین سوالات پوچھے جن میں سے ایک اصحاب کہف کے بارے میں تھا۔ چونکہ یہ تینوں سوالات کا تعلق عیسائیوں اور یہودیوں کی تاریخ سے تھا جن سے عرب کے لوگ آشنا نہ تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نہ صرف ان کے صحیح جوابات سے آگاہ کر دیا بلکہ سورہ الکہف کی آیات نمبر ۹ سے ۲۶ تک اصحاب کہف کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ سید مودودیؒ نے اس کی بہت زیادہ تفصیل بیان کی ہے (دیکھئے ضمیمہ تفہیم القرآن میں)

سورہ الشعراء کی آیت ۱۱۱ میں حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے اور کفار کے اس اعتراض کی تردید کہ

"کیا ہم تجھے مان لیں حالانکہ تیری پیروی رذیل ترین لوگوں نے اختیار کی ہے۔"

اس کے تشریحی حاشیئے نمبر ۸۱ میں سید مودودیؒ نے وضاحت کی۔

''یہ لوگ جنہوں نے حضرت نوح کو دعوتِ حق کا یہ جواب دیا، ان کی قوم کے سردار، شیوخ اور اشراف تھے جیسا کہ دوسرے مقام پر اسی قصے کے سلسلہ میں بیان ہوا ہے:

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ ۚ وَ مَا نَرٰی لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِیْنَ﴿۲۷﴾ (سورہ ھود:۲۷)

"اس کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا ہمیں تو تم اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتے کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمہاری پیروی صرف ان لوگوں نے بے سمجھے بوجھے اختیار کر لی ہے جو ہمارے ہاں کے اراذل ہیں اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے بڑھے ہوئے ہو بلکہ ہم تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لانے والے زیادہ تر غریب لوگ، چھوٹے چھوٹے پیشہ ور ایسے جوان تھے جن کی قوم میں کوئی حیثیت نہ تھی۔ رہے اونچے طبقہ کے بااثر اور خوشحال لوگ، تو وہ ان کی مخالفت پر کمر بستہ تھے اور وہی اپنی قوم کے عوام کو طرح طرح کے فریب دے دے کر اپنے پیچھے لگائے رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں جو دلائل وہ حضرت نوح علیہ السلام کے خلاف پیش کرتے تھے ان میں سے ایک استدلال یہ تھا کہ اگر ان کی دعوت میں کوئی وزن ہوتا تو قوم کے امراء، علماء مذہبی پیشوا، معززین اور سمجھ دار لوگ اسے قبول کرتے۔ لیکن ان میں سے تو کوئی بھی اس شخص پر ایمان نہیں لایا ہے۔ اس کے پیچھے لگے ہیں ادنیٰ طبقوں کے چند نادان لوگ جو کوئی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ اب کیا ہم جیسے بلند پایہ لوگ ان بے شعور اور کمین لوگوں کے زمرے میں شامل ہو جائیں؟" (حاشیہ ۸۱)۔ اسی تسلسل میں مزید وضاحت کی

"بعینہ یہ بات قریش کے کفار نبی ﷺ کے متعلق کہتے تھے کہ ان کے پیرو یا تو غلام اور غریب لوگ ہیں یا چند نادان لڑکے، قوم کے اکابر اور معززین میں سے کوئی بھی ان کے ساتھ نہیں ہے۔ ابوسفیان نے ہرقل کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے بھی یہی کہا تھا کہ

تبعه منا الضعفاء و المساکین (محمد ﷺ) کی پیروی ہمارے غریب اور کمزور لوگوں نے قبول کی ہے) گویا ان لوگوں کا طرزِ فکر یہ تھا کہ حق صرف وہ ہے جسے قوم کے بڑے لوگ حق پائیں کیونکہ وہی عقل اور سمجھ بوجھ رکھتے ہیں، رہے چھوٹے لوگ تو ان کا چھوٹا ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بے عقل اور ضعیف الرائے ہیں، اس لئے ان کا کسی بات کو مان لینا اور بڑے لوگوں کا رد کر دینا صاف طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ ایک بے وزن بات ہے۔ بلکہ کفارِ مکہ تو اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ دلیل لاتے تھے کہ پیغمبر کبھی بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہوسکتا، خدا کو اگر واقعی کوئی پیغمبر بھیجنا منظور ہوتا تو کسی بڑے رئیس کو بناتا۔''

وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ ۝۳۱ (الزخرف آیت ۳۱)

"وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن ہمارے دونوں شہروں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا۔"

سید مودودیؒ نے یوں وضاحت کی (حاشیہ ۸۲)

''یہ ان کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، ان کے اعتراض کی بنیاد اس مفروضے پر تھی کہ جو لوگ غریب، محنت پیشہ اور ادنی درجے کی خدمات انجام دینے والے ہیں یا معاشرے کے پست طبقات سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں کوئی ذہنی صلاحیت نہیں ہوتی، اور وہ علم و عقل اور سمجھ بوجھ سے عاری ہوتے ہیں اس لئے نہ ان کا ایمان کسی فکر و بصیرت پر مبنی نہ ان کا اعتقاد لائق اعتبار اور نہ ان کے اعمال کا کوئی وزن۔ حضرت نوح علیہ السلام اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ میرے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ جو شخص میرے پاس آکر ایمان لاتا ہے اور ایک عقیدہ قبول کر کے اس کے مطابق عمل کرنے لگتا ہے، اس کے اس فعل کی تہ میں کیا محرکات کام کر رہے ہیں اور وہ کتنی کچھ قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ ان چیزوں کا دیکھنا اور ان کا حساب لگانا تو خدا کا کام ہے، میرا اور تمہارا کام نہیں ہے۔ (حاشیہ نمبر ۸۲)''

حاشیہ نمبر ۸۳ میں سید مودودیؒ نے صراحت کی کہ ''یہ ان کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے۔ان کے اعتراض میں یہ بات بھی مضمر تھی کہ ایمان لانے والوں کا جو گروہ حضرت نوح علیہ السلام کے گرد جمع ہو رہا ہے یہ چونکہ ہمارے معاشرے کے ادنیٰ طبقات پر مشتمل ہے، اس لئے اونچے طبقوں میں سے کوئی شخص اس زمرے میں شامل ہونا گوارا نہیں کرسکتا۔ دوسرے الفاظ میں گویا وہ یہ کہہ رہے تھے کہ اے نوح علیہ السلام، کیا تم پر ایمان لاکر ہم اپنے آپ کو اراذل اور سفہاء میں شمار کرائیں؟ کیا ہم غلاموں، نوکروں، مزدوروں اور کام پیشہ لوگوں کی صف میں آ بیٹھیں؟ حضرت نوح علیہ السلام اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ میں آخر یہ غیر معقول طرزِ عمل کیسے اختیار کرسکتا ہوں کہ جو لوگ میری بات نہیں مانتے ان کے تو پیچھے پھرتا رہوں اور جو میری بات مانتے ہیں انہیں دھکے دے کر نکال دوں۔ میری حیثیت تو ایک ایسے بےلاگ آدمی کی ہے جس نے علی الاعلان کھڑے ہو کر پکار دیا ہے کہ جس طریقے پر تم لوگ چل رہے ہو یہ باطل ہے اور اس پر چلنے کا انجام تباہی ہے اور جس طریقے کی طرف میں رہنمائی کر رہا ہوں اسی میں تم سب کی نجات ہے۔اب جس کا جی چاہے میری اس تنبیہ کو قبول کر کے سیدھے راستے پر آئے اور جس کا جی چاہے آنکھیں بند کر کے تباہی کے راستے پر چلتا رہے—— میں یہ نہیں کرسکتا کہ جو اللہ کے بندے میری اس تنبیہ کو سن کر سیدھا راستہ اختیار کرنے کیلئے میرے پاس آئیں ان کی ذات، برادری، نسب اور پیشہ پوچھوں اور اگر وہ آپ لوگوں کی نگاہ میں کمین ہوں تو ان کو واپس کر کے اس انتظار میں بیٹھا رہوں کہ "شریف" حضرات کب تباہی کا راستہ چھوڑ کر نجات کی راہ قدم رنجہ فرماتے ہیں۔''

سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے مزید لکھا

''ٹھیک یہی معاملہ ان آیات کے نزول کے زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کفارِ مکہ کے درمیان چل رہا تھا اور اسی کو نگاہ میں رکھنے سے یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ حضرت نوح اور ان کی قوم کے سرداروں کی یہ گفتگو یہاں کیوں سنائی جارہی ہے کہ وہ مکہ کے بڑے بڑے سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ ہم آخر بلال اور عمار اور صہیب جیسے غلاموں اور کم پیشہ لوگوں

کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ گویا ان کا مطلب یہ تھا کہ ایمان لانے والوں کی صف سے یہ غریب لوگ نکالے جائیں تب کوئی امکان اس کا نکل سکتا ہے کہ اشراف ادھر کا رخ کریں، ورنہ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ محمود اور ایاز ایک صف میں کھڑے ہو جائیں۔ اس پر نبی ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بالکل صاف اور دوٹوک الفاظ میں یہ ہدایت دی گئی کہ حق سے منہ موڑنے والے متکبروں کی خاطر ایمان قبول کرنے والے غریبوں کو دھکے نہیں دیئے جا سکتے:'' (حاشیہ ۸۳)

درج بالا تمام اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ہمیشہ دین کی دعوت پر لبیک کہنے والے نوجوان تاہم غریب لوگ ہوتے ہیں جو ہر قسم کے خوف اور لالچ سے بے نیاز ہو کر انبیائے کرام کی دعوت پر لبیک کہتے رہے ہیں ـــــ آج کے دور میں بھی اگر ہم دیکھیں تو دنیا میں جہاں کہیں بھی اسلام کی دعوت صحیح انداز میں دی جا رہی ہے، وہاں نوجوان لوگ ہی اس کی جانب توجہ کر رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے بال جبرئیل میں پیر حرم (داعیانِ دعوتِ حق) کو مخاطب کرتے ہوئے نوجوان طبقے تک قرآن و حدیث نیز سیرتِ طیبہ ﷺ کا پیغام علمی اور عملی انداز میں دینے کی نصیحت کی۔

اے پیرِ حرم رسم و رہ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی، خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا!

درج بالا گفتگو سے بآسانی یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کسی قوم کا نوجوان طبقہ ہی دراصل

وہ سرمایہ ہے جس پر کسی قوم کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے جس قوم/ ملک نے اس سرمایے کی تعلیم وتربیت کے ذریعے اصلاح کر لی، مستقبل اس کے ہاتھوں ہی تعمیر نو کے مرحلے میں کامیاب ہوگا۔

معمارِ حرم باز با تعمیر جہاں خیز
از خواب گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز!

حوالہ جات(REFRENCES)

ابوالاعلیٰ مودودیؒ سید(1999) تفہیم القرآن جلد اوّل تا ششم۔
ادارہ ترجمان القرآن لاہور

ابوالاعلیٰ مودودیؒ سید(1999) قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں۔
اسلامک پبلی کیشنز۔لاہور

ابوالاعلیٰ مودودیؒ سید(1982) تعلیمات،اسلامک پبلی کیشنز۔لاہور

ابوالاعلیٰ مودودیؒ سید(2018) نصرانیت،قرآن کی روشنی میں (ترتیب:نعیم صدیقی اور
عبدالوکیل علوی)ادارہ ترجمان القرآن لاہور

ابوالاعلیٰ مودودیؒ سید(2018) یہودیت قرآن کی روشنی میں(ترتیب نعیم صدیقی اور
عبدالوکیل علوی)ادارۂ ترجمان القرآن لاہور

خورشید احمد(پروفیسر)2015 اسلامی نظریۂ حیات حصہ اول،دوم،سوئم،شعبہ تصنیف و
تالیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی،
انسٹی ٹیوٹ آف گریس سٹڈیز اسلام آباد

محمد احسن(ڈاکٹر)2010 داستانِ اندلس:مسلمانوں کا ماضی،حال اور مستقبل
نشریات۔اردو بازار۔لاہور

محمد اقبال(ڈاکٹر)1995 کلیاتِ اقبال(سروسز کلب ایڈیشن)
ملک غلام علی اینڈ سنز۔لاہور

محمد شفیع(مولانا/مفتی اعظم)2011 معارف القرآن۔جلد اول تا ہشتم
ادارۃ المعارف،کراچی

پیر محمد کرم شاہ الازہری (1995) ضیاء القرآن جلد اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور

محمود احمد غازی (ڈاکٹر) 1999 اکسویں صدی میں پاکستان کے تعلیمی تقاضے۔ پانچواں محمد رفیع الدین میموریل لیکچر، آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس، لاہور

محمد آفتاب خان (ڈاکٹر)، اسماء آفتاب (ڈاکٹر)
اکیسویں صدی میں پاکستان کے تعلیمی تقاضے، فکر اقبال کی روشنی میں۔ الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی

وکیل انجم سیاست کے فرعون۔ فیروز سنز لاہور

یوسف ظفر (2016) یہودیت: تاریخ، فطرت اور عزائم (یہودیت پر ایک جامع اور مستند تاریخی دستاویز)۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد

یادداشت